خواب رنگ اور راستے

نگہت سیما

صبا اُس سے یہ کہہ دینا

تم اور میں زندگی کا سفر اکٹھے طے کرتے۔
یہ کیسا خوبصورت خواب تھا نوید شہریار۔
جو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن پھر بھی مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے یہ خواب ریزہ ریزہ ہو کر میری آنکھوں میں چبھ رہا ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے نوید شہریار کہ وہ خواب جو ہم کبھی نہیں دیکھتے، محض اس خوف سے کہ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائیں۔
ان خوابوں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ان کو آنکھوں میں نہیں سجاتے۔
دل میں گھر نہیں بنانے دیتے۔
اور جب کبھی یہ خواب پلکوں کی دہلیز تک آ جاتے ہیں تو فوراً آنکھیں موند لیتے ہیں۔ انہیں دھکیل کر پرے کر دیتے ہیں۔ لیکن ہماری ساری احتیاطیں اور ساری تدابیر رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ یہ خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔
اور یقین مانو نوید شہریار! میں نے ایسا کوئی خواب کبھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی قطرہ قطرہ لہو میرے اندر گر رہا ہے۔
اور میری آنکھوں میں بار بار دُھند سی چھا جاتی ہے۔ اور میں کتنا کوشش کرتی ہوں کہ ایسا نہ ہو مگر ایسا ہی ہو رہا ہے نوید شہریار!
کتنے بہت سارے دنوں سے۔
میں اس خواب کے ٹوٹنے پر روتی ہوں جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔
میں اُس شخص کے پرائے ہونے پر روتی ہوں۔
جو جب مجھے ملا تھا، تب بھی پرایا تھا۔
کتنا سمجھاتی ہوں خود کو کہ وہ تیرا تھا ہی کب روزِ اوّل سے۔ اور جو چیز تیری تھی ہی نہیں، اس کے پرائے ہونے پر کیا رونا۔

یہ دل۔

یہ پاگل دل۔

انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند

پر دل کا بھی کیا قصور ہے نوید شہریار!

کیا تم میرے نہیں تھے؟

کیا بارہا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم میرے ہو، سرتاپا میرے۔

"تمہارے سینے میں جو دل دھڑکتا ہے، اس کی ہر دھڑکن صرف میرے لئے ہے۔

اور اگر تم میری زندگی سے نکل گئیں تو میرا دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔"

اور یہ کتنی عجیب بات ہے نوید شہریار!

کہ اس کے باوجود تم میرے نہیں تھے۔

اور یہ وہ حقیقت تھی جو ہم دونوں بہت اچھی طرح سے جانتے تھے لیکن اس کے باوجود ہم نے ایک دوسرے کو چاہا۔

اور بہت ٹوٹ کر چاہا۔

اور یہ کتنی عجیب بات ہے نوید شہریار! کہ اتنا ٹوٹ کر چاہنے کے باوجود ہم نے کبھی ایک دوسرے کے خواب اپنی آنکھوں میں نہیں سجائے تھے۔

شاید اس لئے کہ ہم جانتے تھے کہ ہمارا ساتھ ناممکن ہے۔

اور بہت سارے لوگ بہت ساری باتوں کے متعلق جانتے ہیں مگر وہ وہی کرتے ہیں جو ان کا دل چاہتا ہے۔

کیا تھا...... کیا تھا اگر میں بھی تمہاری رفاقت کا خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیتی۔

بھلے اس خواب کی عمر بہت تھوڑی تھی۔

لیکن تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی یہ خواب...... یہ خوب صورت خواب میری آنکھوں میں ٹھہر جاتا تو کیا تھا شہریار!

کیا تھا...... اگر لمحہ بھر کے لئے ہی سہی، خواب میں ہی تمہاری رفاقت مل جاتی۔

لیکن یہ میں تھی شہریار!

میں ذر نایاب

میں جو دوسروں کی آنکھ کا اشارہ سمجھ کر اپنی خواہشات پر پہرے بٹھا دیا کرتی تھی۔

تمہیں تو پتہ ہے نا شہریار!

میں تو بچپن سے ایسی ہی تھی۔

یوں ہی اپنی خواہشات اور اپنی آرزوؤں کی نفی کرنے والی۔

بارہا میں نے صرف بابا اور ماں جی کی مرضی دیکھتے ہوئے، آپا کی خواہش سمجھتے ہوئے، بھائی جان اور بھیا کی ناراضگی کا خیال کرتے ہوئے اپنی آرزوؤں کا قتل کیا ہے۔

اور اب تمہارے لئے۔

کیا تمہارے لئے میں اپنی ذات کی نفی نہیں کر سکتی تھی؟

تم جس سے میں نے سب سے بڑھ کر محبت کی ہے۔

بابا اور ماں جی سے بھی زیادہ۔

آپا اور بھیا سے بھی بڑھ کر۔

میں تو تم سے کبھی یہ بھی نہیں کہہ سکی نوید شہریار کہ میرے دل میں کبھی کبھی تمہاری رفاقت کی خواہش بڑی شدت سے جاگتی ہے۔

میں اور تم زندگی کا سفر اکٹھے طے کریں۔

یوں کہ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو اور میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہو۔

یہ خواب اکثر میری بند پلکوں کے پپوٹوں پر سر مارتا رہتا ہے اور میں زور سے آنکھیں بھینچے رکھتی ہوں اور پھر اس خواب کے پر نوچ کر پھینک دیتی ہوں۔

میں یہ سب تمہیں کبھی نہیں بتا سکی، محض اس خوف سے کہ کہیں تمہاری آنکھوں میں ایسا ہی کوئی خواب نہ بس جائے اور جب یہ خواب پورا نہ ہو سکے تو تمہیں اذیت ہو، تم دکھی ہو۔ اس خواب کے تعبیر نہ پانے پر۔

کہیں تمہیں ایسا کوئی خیال نہ ہو اور میرے کہنے پر تمہارے دل میں بھی یہ خیال آ جائے کہ میں اور تم زندگی کا سفر اکٹھے طے کریں۔

میں تمہیں ایسا کوئی خواب نہیں دینا چاہتی تھی جس کی تعبیر نہ پانے کا ہمیں پہلے سے ہی پتہ تھا۔ حالانکہ بارہا میرا دل چاہا، کبھی کسی خوبصورت لمحے میں تمہارے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر تمہیں بتاؤں کہ میرا کتنا جی چاہتا ہے۔

لیکن یہ ممکن ہی کب تھا شہریار!

سو میں اس خواب کو اپنے ہی ہاتھوں قتل کر کے اس پر مٹی ڈالتی رہتی تھی کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ تمہارے پاؤں میں زنجیریں ہیں، خوبصورت رشتوں کی زنجیریں۔

لیکن جو کبھی کبھی گوشت میں اس طرح گڑ جاتی ہیں کہ تکلیف دینے لگتی ہیں۔
مگر پھر بھی یہ زنجیریں کاٹی نہیں جا سکتیں۔
اور پھر اگر ایسا نہ بھی ہوتا نوید شہریار! تب بھی ...... تب بھی میں کبھی کبھی سوچتی تھی۔
میرا اور تمہارا ساتھ ہو جاتا تو قیامت نہ آ جاتی، زلزلے نہ ٹوٹ پڑتے۔
دنیا میں کوئی بڑا انقلاب نہ آ جاتا۔
بھلا یہ ممکن ہی کب تھا شہریار!
میرا اور تمہارا ساتھ۔
اتنی ذہنی ہم آہنگی۔
اس قدر پسند اور ناپسند کا ملنا۔

99.9% باتوں پر ہماری سوچ اور ہماری پسند ملتی تھی اور یہ بات ہمیں کتنا حیران کیا کرتی تھی۔ شروع شروع میں تو ہم خوش ہوتے تھے کہ ہم میں کئی قدریں مشترک ہیں اور یہ کہ شاید اندر ہی اندر یہ ذہنی ہم آہنگی کسی فاصلے کو کم کر رہی ہے۔ مگر پھر یوں ہوا کہ ہم اس طرح حیرت انگیز طور پر ایک ہی سوچ رکھنے پر چونکنے لگے۔

تمہیں یاد ہے شہریار!

اُس روز میں نے اپنے پرس سے ہوئیسٹ (HOEST) نکال کر اسے دانتوں سے توڑ کر دوبارہ ریپر میں لپیٹتے ہوئے تم سے پوچھا تھا۔

''لو گے......؟''

''نو تھینک یو۔'' تم کچھ حیران حیران سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''تم حیران ہو گے کہ میں چاکلیٹ یا ٹافیوں کی بجائے ہوئیسٹ کھاتی ہوں۔ میرے پرس میں ہمیشہ ہوئیسٹ (HOEST) ہوتی ہے۔ ویسے میں ذرا سا توڑ کر کھاتی ہوں۔ ایک دم پوری نہیں کھاتی۔''

''اور میں بھی۔'' تم نے کچھ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تھا۔

''REALLY......؟'' میں اُچھل پڑی تھی۔

''ہاں......'' تم ایک دم کچھ تھکے تھکے سے لگنے لگے تھے۔ ''یہ سب ...... یہ سب عجیب نہیں ہے ذری؟''

''کیا......؟''

''یہی ہماری عادات کا اتنا زیادہ ملنا۔ میں سمجھتا تھا کہ صرف میں ہی HOEST

کھاتا ہوں ...... اور میں نے تمہیں بتایا ہے نا ابھی کہ میں نے کبھی بھی پوری HOEST نہیں کھائی۔ توڑ کر کھاتا ہوں۔''

''دراصل تمہیں نقل کی عادت ہے نا شہریار! ہر بات میں میری نقل۔''

میں نے بات ہنسی میں ٹال دی تھی لیکن میرے لاشعور میں یہ بات کہیں اٹک گئی تھی اور رات سونے سے پہلے آنکھیں موندے میں کتنی ہی دیر تک سوچتی رہی تھی کہ یہ سب ...... یہ سب کتنا عجیب ہے۔

ہماری عادات کا اتنا زیادہ ملنا۔
ہم نے دو الگ الگ شہروں میں
الگ الگ گھروں میں
الگ الگ ماحول میں پرورش پائی تھی۔
پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے ہم نے ایک ہی گھر میں جنم لیا ہو۔
جیسے میرے ابو اور تمہارے ابو اکٹھے ایک ہی جگہ کھیل کود کر بڑے ہوئے ہوں۔
وہی مزاج کے رنگ۔
وہی غصہ۔
وہی شوق۔
وہی ماں جی کی طرح تمہاری امی کا دھیما مزاج۔
وہی بھائی جان اور بھیا کی طرح تمہارے بھائیوں کے مزاج۔
وہی ذوق۔
ویسی ہی محفلیں۔
وہی راتوں کو جاگ کر گپیں لگانا اور شعر سنانا۔
یہ سب کتنا حیران کر دینے والا تھا شہریار!

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہم نے ایک دوسرے کی عادتیں اپنائی ہیں اس لئے کہ ہمیں ملے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔

پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور صدیوں سے ہماری روحیں اکٹھی رہ رہی ہوں۔

اُس رات میں بہت دیر تک جاگتی رہی تھی اور سوچتی رہی تھی کہ یہ سب کچھ ہی حیران کن ہے۔

تمہارا اس طرح مجھ سے ملنا۔
اور میرے تمہارے درمیان دوستی کا یہ جذبہ۔
میں جس نے کبھی کسی مرد کے ساتھ دوستی کا تصور تک نہیں کیا تھا۔
جو سرے سے مرد اور عورت کے درمیان دوستی کو ہی غلط سمجھتی تھی۔
بھلا یہ کیا بات ہوئی۔
یہ تو خود کو اور دوسروں کو دھوکا دینے والی بات ہے۔
اب تم سے گھنٹوں بات کر کے بھی میں نہیں تھکتی تھی۔
اور تمہیں اپنا سب سے اچھا، سب سے قریبی اور غمگسار دوست سمجھتی تھی۔
ایسا دوست جس کے کندھے پر سر رکھ کر رویا جا سکے اور جس سے اپنی خوشیاں شیئر کی جا سکیں۔
اور جس سے ہر وہ بات کہی جا سکے جو کسی سے نہیں کہی جا سکتی۔
اور اس تھوڑے سے عرصے میں ہی میں نے تم سے ہر وہ بات کہہ دی تھی جو کبھی کسی سے نہیں کہی تھی۔
اور ہر وہ دکھ تمہارے ساتھ شیئر کیا تھا جو پہلے میں دل میں دفن کر دیا کرتی تھی۔
اور وہ سارے آنسو تمہارے ہاتھوں کے پیالے میں بہا دیئے تھے جنہیں میں دوسروں کے سامنے بہانا اپنی توہین سمجھتی تھی۔
بچھڑ جانے والے لوگوں کا دکھ۔
رویوں کی بدصورتی کا دُکھ۔
اپنے خلوص کے رائیگاں جانے کا دُکھ۔
دوستوں کے بدل جانے کا دُکھ۔
کتنے بہت سارے دُکھ تھے شہریار! جو میں نے اپنے دل کی گولک میں چھپا رکھے تھے۔

اور تم نے اپنی محبت اور اعتماد کی ایک ہی ضرب سے اس گولک کو توڑ دیا تھا اور ان سارے دُکھوں کا ڈھیر تمہارے سامنے لگ گیا تھا۔
اور تم نے کسی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تم میری لایعنی باتوں کو دھیان سے سنتے تھے۔
تمہیں یاد تو ہو گا نا شہریار!

پہلی بار ہم ایک دوسرے سے کیسے متعارف ہوئے تھے۔
وہ ایک میگزین میں چھپنے والی میری ایک مختصر سی نظم تھی ’’سلام‘‘، تمہیں اس نظم کا لہجہ بہت اچھا لگا تھا اور تم نے مجھے ایک تعریفی خط لکھ ڈالا تھا اور میں نے ایک نظر پڑھ کر اسے بے کار کاغذات میں پھینک دیا تھا۔ پھر ایسے ہی تمہارے کئی خط مجھے ملے تھے۔ اُسی میگزین کی معرفت لکھے گئے تمہارے ان خطوط کو میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔
بعد میں ایک بار تم نے مجھے بتایا تھا کہ۔
زندگی میں پہلی بار تم نے اس طرح کسی کو کوئی خط لکھا تھا۔ حالانکہ بہت بار بہت سی چیزیں تمہیں میری اس نظم سے کہیں زیادہ پسند آئی تھی لیکن تمہارے دل میں اس طرح خط لکھنے کا کبھی کوئی خیال نہیں آیا تھا۔
’’پتہ نہیں، یہ کوئی غیبی طاقت تھی دُری!‘‘ تم نے خیال ظاہر کیا تھا۔ ’’جو یہ سب کچھ کروا رہی تھی۔ تم یقین کرو گی، جتنی بار میں نے تمہیں خط لکھا، اس میں کبھی کسی ارادے کا دخل نہیں رہا۔ حتیٰ کہ پہلی بار یونہی بس خود مجھے نہیں پتہ۔ حالانکہ پہلی بار جب تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا تھا تو اصولاً مجھے تمہیں خط نہیں لکھنا چاہئے تھا حالانکہ تب مجھے پتہ بھی نہیں تھا کہ تم کون ہو، کیسی ہو۔ پھر بھی کوئی چیز مجھے اندر سے اُکساتی تھی۔ بعض باتیں خود بخود ہوتی ہیں نا دُری! اس میں انسان کے کسی ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور اس طرح میرا اور تمہارا ملنا اور ہمارے درمیان دوستی جیسے پُرخلوص رشتے کا قائم ہو جانا بھی خود بخود ہوا ہے۔ اب اس سے ڈرو نہیں، خوفزدہ مت ہو، پلیز۔‘‘
اور پھر جب تمہارے کئی خطوط میری بے پروائی کی نذر ہو گئے تو ایک روز تم نے مجھے فون کیا۔ پتہ نہیں تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا تھا۔
اُس وقت تم نے مجھے نہیں بتایا تھا لیکن بعد میں ایک بار تم نے بتایا تھا کہ وہ میگزین جس میں میرا کلام باقاعدگی سے چھپتا تھا اُس کا ایڈیٹر تمہارا دوست تھا اور ایک روز اُس کی عدم موجودگی میں تم اُس کی ڈاک دیکھ رہے تھے کہ میرا خط نکل آیا اور میرے لیٹر پیڈ پر میرا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔
’’اور یہ اتفاق بھی حیران کُن نہیں ہے دُری!‘‘
’’ہاں ..... اُس روز میں نے بابا کا لیٹر پیڈ استعمال کیا تھا اور یہ بھی اتفاق تھا کہ بابا گھر پر نہیں تھے اور تمہارا فون میں نے ہی ریسیو کیا تھا۔‘‘
بعد میں ایک بار تم نے مجھے بتایا تھا۔ ’’یقین کرو دُری! میں نے تمہارا فون نمبر ایک

نظر دیکھا تھا بس۔ مگر اس روز جب میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا، بالکل غیر ارادی طور پر میں نے تمہارا نمبر ملا دیا تھا اور پھر تمہاری آواز کی نغمگی اور تمہارے لہجے کے سحر نے مجھے اسیر کرلیا تھا۔

مجھے یاد ہے شہریار، میرے سلام کے جواب میں تم نے کہا تھا۔ ''میں شہریار ہوں۔'' میں نے سمجھا تھا، شاید تم بابا کے کوئی اسٹوڈنٹ ہو۔ بابا یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور ویک اینڈ پر ہی گھر آتے تھے۔

''بابا گھر پر نہیں ہیں۔'' میں نے تمہیں بتایا تھا۔

''آپ ذرا نایاب ہیں نا؟''

''جی ...... لیکن آپ کون ہیں؟''

''میں ...... آپ نے پہچانا نہیں، میں نے آپ کو خط بھی لکھا تھا۔''

''اوہ!'' مجھے یاد آ گیا۔ ''جی ...... آپ کے خطوط مجھے مل گئے تھے۔''

'خطوط' پر میں نے دانستہ زور دیا۔

''لیکن آپ نے کسی بھی خط کا جواب نہیں دیا۔''

''سوری، اوّل تو میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ دوسرے میں مردوں کے خطوط کا جواب نہیں دیا کرتی۔ بہرحال نظم کی پسندیدگی کا شکریہ۔''

تمہیں یاد ہے نا شہریار، اس کے بعد بھی تم نے مجھے دو تین بار فون کیا تھا اور میں نے بات کئے بغیر فون رکھ دیا تھا۔ اور پھر ایک بار میں نے تمہیں ڈانٹ دیا تھا۔ حالانکہ آپا کا خیال ہے کہ میں کبھی کسی کو ڈانٹ نہیں سکتی۔ اسی لئے تو میرے کہنے کے باوجود انہوں نے بچوں کو کبھی میرے پاس نہیں چھوڑا کہ وہ اپنی من مانی کریں گے اور بگڑ جائیں گے۔ حالانکہ مجھے آپا کی اس بات سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے کہ (محبتیں بگاڑ دیتی ہیں مگر آپا کو کبھی قائل نہیں کرسکی)

''نوید شہریار صاحب، شاید آپ کو کسی طرح کی کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ میں کوئی ٹین ایجر لڑکی نہیں ہوں۔''

''بخدا، مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔'' تم ہولے سے ہنس دیئے تھے۔

مگر میں نے تمہیں کہیں اور ٹرائی کرنے کا مشورہ دے کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا تھا۔ مگر تم نے لمحہ بھر بعد پھر رنگ کر ڈالا اور تب میں نے غصے میں تمہیں نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ ایک تو اُس روز بابا کی طبیعت اچھی نہیں تھی، دوسرے میں نے بھائی جان

سے بات کرنے کی کتنی ہی کوشش کی تھی مگر بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ اوّل تو نمبر ہی نہیں ملتا تھا اور جو مل جاتا تو کوئی فون ہی ریسیو نہیں کرتا تھا۔ شاید وہ لوگ کہیں ویک اینڈ گزارنے چلے گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح بتائے بغیر۔ اور یہ تو کیتھی بھابی کی پرانی عادت تھی۔ وہ اپنی کوئی چھٹی مِس نہیں کرتی تھیں۔ ایک بار وہ پورے ایک ماہ کے لئے فرانس کے ٹور پر چلے گئے تھے اور ہم یہاں کتنا پریشان ہوئے تھے۔ میں، آپا اور بابا۔ بھیا اور ماں جی۔ تب بھیا بھی پاکستان میں تھے اور ماں جی بھی۔

اور پھر میں نے آپا سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی گھر پر نہیں تھیں اور میں بابا کی بیماری سے ہمیشہ ہی پریشان ہو جاتی تھی۔ میں نے آپا کی نند سے کہا تھا کہ جیسے ہی آپا آئیں، وہ مجھے فون کریں۔ اور اب جب کہ میں آپا کے فون کی منتظر تھی، تمہارے فون نے مجھے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ حالانکہ عام طور پر مجھے اتنا غصہ کبھی نہیں آیا۔

تب تمہارے لہجے کی شوخی یک دم مر گئی تھی اور تم نے سوری کہہ کر فون رکھ دیا۔

پھر کئی دنوں بعد تمہارا معذرت نامہ آ گیا۔ تم نے فون کرنے کی معذرت کی تھی اور وضاحت کی تھی کہ میں تمہیں غلط سمجھ رہی ہوں۔ تمہیں یاد ہے نا شہریار! تم نے اپنی امی جی کی قسم کھائی تھی۔ تم نے لکھا تھا۔

تمہارے ذہن میں کوئی غلط بات ہرگز نہیں تھی۔ اور یہ کہ تم بھی کوئی ٹین ایجر نہیں ہو یا تمہارا مقصد فون کر کے مجھ سے بات کر کے انجوائے کرنا ہرگز نہیں ہے۔

''میرے اندر تو برف جمی ہوئی ہے۔

گلیشیر بن گئے ہیں۔

میں عمر کے اُس دور سے نکل آیا ہوں جب لڑکے یوں ہی لڑکیوں کو فون کر کے سنسنی محسوس کرتے اور حظ اٹھاتے ہیں۔ میں خود نہیں جانتا کہ میں نے آپ کو خط کیوں لکھا اور فون کیوں کیا تھا۔

شاید مجھے آپ کی نظم بہت اچھی لگی تھی۔

اس کا لہجہ میرے دل میں اتر گیا۔ میرا دل چاہا میں اس نظم کی تعریف کروں۔

چنانچہ میں نے خط لکھا۔

شاید میرے اندر بھی کہیں کوئی شاعر چھپا بیٹھا ہے۔ تب ہی تو آپ کے لفظوں کی خوبصورتی اور ترنم مجھے اندر تک ہلا گیا یا پھر شاید ان لفظوں میں کہیں کوئی میری گم شدہ داستان کا ورق بھی تھا۔ پتہ نہیں کیا تھا کہ میں بے اختیار خط لکھ بیٹھا اور جواب نہ آنے

پر فون کیا۔

اور آپ کی آواز کی نرماہٹ۔

آپ کے لہجے کی خوبصورتی بار بار سننے کو دل چاہا۔

یقین کریں پلیز، میرا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔''

تم نے ایک بار پھر اپنی امی کی قسم کھائی تھی۔

اور میرے دل میں کہیں کسی گوشے میں تمہارے لئے نرماہٹ پیدا ہوگئی تھی اور مجھے اپنے کہے ہوئے لفظوں پر ندامت ہوئی تھی۔ مجھے تم سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔

اتنے سخت الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئے تھے۔

میرا سدا کا نرم دل اندر سے پانی ہونے لگا تھا۔

اپنا غصہ تم پر، ایک اجنبی پر مجھے نکالنے کا کیا رائٹ تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتی رہی تھی اور پھر بقول تمہارے وہ شاید کوئی غیبی طاقت ہی تھی جس نے قلم میرے ہاتھ میں پکڑا دیا ...... اور میں نے تم سے اپنے رویے کی بدصورتی کی معذرت چاہ لی اور تمہیں بابا کی بیماری اور آپا سے بات نہ ہو سکنے کا بتایا۔

حالانکہ تم تو میرے کوئی بھی نہیں تھے شہریار۔ مجھے بھلا کیا ضرورت تھی کہ میں تمہیں بتاتی کہ اس روز بابا بیمار تھے اور آپا سے بات نہیں ہو سکی تھی اور سینکڑوں میل دور نیو جرسی میں رہنے والے بھائی جان میرا فون ریسیو نہیں کر رہے تھے۔

میں اگر نادم ہی تھی تو زیادہ سے زیادہ تم سے معذرت کر لیتی۔

مگر شاید قدرت ہمیں ایک دوسرے کے قریب لا رہی تھی۔

قدرت کو میری بے رنگ زندگی میں تمہاری محبتوں کے پھول کھلانے تھے۔ میرے خالی دامن کو تمہاری محبتوں کے موتیوں سے بھرنا تھا کہ میں نے وہ سب کچھ تمہیں لکھ ڈالا اور پھر فوراً ہی تمہارا خط آ گیا۔

بابا کی بیماری پر تشویش کا اظہار۔

کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ۔

بھائی جان کے فون نہ ملنے پر تشویش۔

یہ سب کچھ کتنا اپنائیت بھرا تھا شہریار! برسوں سے مجھے اپنے زخموں کو خود ہی ٹانکے لگانے اور خود ہی ان پر پھائے رکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایسے میں تمہاری دلجوئی اور

ڈھارس نے میری آنکھیں نم کر دیں مگر میں نے حسبِ معمول اپنی آنکھیں پونچھ کر تمہیں شکریے کا خط لکھا اور تمہیں بتایا کہ بابا اچھے ہیں اور یہ کہ میں بس یونہی پریشان ہو جاتی ہوں۔ اور یوں ہمارے درمیان ایک ایسا رشتہ استوار ہو گیا جس کے متعلق میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مدت ہوئی میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دروازے ایک بار کھل جائیں تو پھر کھلتے ہی چلے جاتے ہیں۔

ہمارے درمیان بھی تعلق کا جو دروازہ کھل گیا تھا وہ پھر بند نہیں ہو سکا۔

جو قدم اٹھا تھا، وہ واپس نہیں پلٹ سکا۔

پتہ نہیں کب، پتہ نہیں کیسے، ہمارے درمیان دوستی کا ایک خوبصورت رشتہ قائم ہو گیا۔ اگرچہ ہم نے اپنی زبان سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا لیکن ہم ایک دوسرے سے اپنی باتیں کہنے لگے تھے۔

تم زیادہ میں کم۔

کبھی کبھی ایک خط میں تمہارا لہجہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا تھا۔

تمہیں بہت سارے لوگوں سے بہت سارے شکوے تھے۔

اپنوں سے، غیروں سے۔

''تم نہیں جانتیں دُرِ نایاب! لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ میرے اپنوں نے۔''

(پتہ نہیں کب تم نے مجھے آپ سے تم کہنا شروع کر دیا تھا اور مجھے محسوس تک نہیں ہوا تھا بلکہ تمہارا یہ اپنائیت بھرا انداز مجھے اچھا لگا تھا)

''ابو کی اچانک وفات نے مجھ سے میرے بہت سارے خواب چھین لئے ہیں۔''

تم نے ایک بار مجھے لکھا تھا۔ ''وہ سب جو دوسروں نے کرنا تھا، وہ مجھے کرنا پڑا۔ تمہیں کیا پتہ دُرِ نایاب، میں نے کتنا مشکل وقت کاٹا ہے۔ اور اگر تب تیمور بھائی کا ساتھ بھی نہ ہوتا تو شاید میں اکیلے یہ ذمے داریاں کبھی نہ نبھا سکتا۔''

اور میں نے تمہیں لکھا تھا۔

''آپ تو بہت سارے لوگوں سے بہت اچھے ہیں کہ آپ کے ساتھ آپ کے تیمور بھائی ہیں۔ اور بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہوتا۔ بالکل اکیلے ہوتے ہیں، تنہا۔''

''مگر دُرِ نایاب!'' تم لکھتے۔ ''میرے ساتھ میرے اپنوں نے۔ مجھے کسی نے نہیں

سمجھا۔ کسی نے میری قربانیوں کا اعتراف نہیں کیا اور میرے بھائیوں نے......''

''سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے شہریار!'' میں جواب میں لکھتی۔ ''سب کو کسی نہ کسی کے رویّے کی بدصورتی کا گلہ ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ اُن کے اپنوں نے اس سے بھی برا کیا ہوتا ہے جو آپ کے ساتھ ہوا ہے۔ اور قربانیاں اس لئے نہیں دی جاتیں کہ لوگ اس کا اعتراف کریں۔ ہم قربانیاں اس لئے دیتے ہیں کہ یہ ہماری نیچر میں ہوتی ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں شہریار! جو دوسروں کے پاؤں کے نیچے سے سیڑھی کھینچ لیتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زمین بھی جس پر وہ کھڑے ہوتے ہیں، دوسروں کے نام کر دیتے ہیں۔ اور ہم تم اسی کیٹگری کے لوگ ہیں۔ تم نے جو کچھ کیا، وہ تمہارا فرض تھا۔ گو تمہارا اکیلے کا فرض نہیں تھا۔ مگر پھر بھی تم نے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ اب اگر کوئی اس کا اعتراف نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم تو مطمئن ہو کہ تم نے اپنا فرض نبھایا۔''

پتہ نہیں کیوں مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے تم ایک ناراض سے رُوٹھے سے بچے ہو یا پھر اینگری ینگ مین۔

دنیا سے، زمانے سے ......اپنے آپ سے، ہر ایک سے خفا۔

اور میں تم سے بہت بڑی ہوں۔ تمہاری کوئی بزرگ۔ اور میرا فرض ہے، ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں سمجھاؤں اور یہ جو تمہارے اندر زہر بھرا ہے، اسے نکال دوں۔ تب مجھے پتہ نہیں تھا کہ تمہاری عمر کتنی ہے۔ کون ہو، کیا کرتے ہو۔

تمہارے خطوط میں جو تلخی ہوتی تھی۔

تمہارے لہجے میں جو گلے، جو شکوے ہوتے تھے۔

ان سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں ہوئی ہیں اور یہ زیادتیاں غیروں کی نہیں، اپنوں کی ہیں۔

اس لئے کہ لفظ جب آنسوؤں سے بھیگ کر زبان سے ادا ہوں تو زخم لگانے والے اپنے ہی ہوتے ہیں۔

اور اپنوں کے دیئے ہوئے زخم کبھی نہیں بھرتے۔

اور میں چاہتی تھی کہ یہ زخم بھر جائیں۔

مجھ سے زیادہ بھلا کون جان سکتا ہے شہریار کہ ان زخموں کی چبھن اور ان آنسوؤں کی نمی کیسی ہوتی ہے۔ سو میں نے ناصح کا فرض سنبھال لیا تھا۔

''سنو نوید شہریار! آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ نیا ہرگز نہیں ہے۔ بہت سارے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بدتر اور آپ تو ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں سے اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔''

اور یوں نوید شہریار! ہم نے خطوط کے ذریعے بہت سارا فاصلہ طے کر لیا تھا اور اب تم اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

پھر بھی جب ایک بار فون پر تم مجھے پریشان لگے اور میں نے تم سے پوچھا اور تم ٹال گئے تو تمہیں یاد ہے میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ مجھے یاد ہے، میں نے کہا تھا۔

''شہریار! کیا ہم دوست نہیں ہیں؟ کیا دوستوں سے بھی اپنی پریشانیاں چھپائی جاتی ہیں؟''

اور اُس روز خود اپنی زبان سے پہلی بار تمہارے لئے یہ لفظ استعمال کر کے میں خود حیران سی رہ گئی تھی۔

یہ میں نے کہا تھا۔

میں جو اتنی محتاط رہنے والی لڑکی تھی۔

مجھے اس طرح تمہیں دوست کہنا بہت عجیب سا لگا تھا۔ لیکن میرے پاس کوئی متبادل لفظ بھی تو نہیں تھا۔ پھر کئی دن تک میں اپنے آپ سے بھی جھجکتی رہی تھی مگر پھر عادی ہو گئی تھی۔

اس روز تم نے کہا تھا۔

''اپنی بات کو یاد رکھنا ...... اپنے دوست کو یاد رکھنا۔ دوست کہا ہے تو ہمیشہ دوست رہنا۔''

''جی ......ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔ اب بتاؤ، کیا بات ہے؟''

تب تم نے بتایا تھا کہ تم اپنی جاب کی طرف سے پریشان ہو۔ ٹرانسفرز ہو رہے ہیں اور نہ جانے تمہارا ٹرانسفر کہاں ہو جائے۔ تم اپنے گھر سے زیادہ دور نہیں جانا چاہتے تھے۔

''دراصل چھوٹی بہنیں ہیں اور امی ہیں۔ بھائی ہے مگر چھوٹا ہے، وہ پڑھ رہا ہے۔ میڈیکل میں جانا چاہتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی پڑھائی ڈسٹرب ہو۔ میں جاؤں گا تو ظاہر ہے اس کی پڑھائی ڈسٹرب ہو گی۔ میں پریشان تھا۔ دل چاہا کہ تم سے بات کروں۔ تم نے برا تو نہیں منایا میرے فون کا؟ یاد ہے، تم نے اُس روز مجھے......''

''تب اور بات تھی۔''

''اب کیا بات ہے؟'' تمہارے لہجے میں ذرا سی شوخی آ گئی تھی۔

''اب ہم دوست ہیں۔''

''اوہ، ہاں......''

اور پھر یوں ہوا کہ تمہارا ٹرانسفر میرے شہر میں ہو گیا۔ تم کچھ کچھ خوش اور کچھ کچھ اُداس تھے۔

''شکر ہے کہ بہت دور نہیں جانا پڑا۔ تھوڑا سا اُداس تو ہوں مگر خوش بھی ہوں کہ اب تمہیں دیکھ سکوں گا اور تم سے مل سکوں گا۔''

''شہریار! میں تمہاری دوست ضرور ہوں مگر تم مجھ سے یہ توقع نہیں رکھنا کہ میں تم سے ڈیٹ لگاؤں گی اور تم سے ملا کروں گی۔''

''میں تمہیں اس کے لئے کبھی مجبور نہیں کروں گا۔ میرے لئے یہی اعزاز بہت ہے کہ میں تمہارا دوست ہوں۔''

تمہارے لہجے کی مسرت ایک دم جیسے کہیں کھو گئی تھی اور تم بہت سنجیدہ ہو گئے تھے۔

اور شاید میری یہ بات تمہیں بہت بُری لگی تھی۔ کیونکہ اس بات کو تم نے کبھی بھی نہیں بھلایا تھا۔ جب کبھی بھی میں تمہارے ساتھ باہر گئی، تم نے مجھے ضرور یاد دلایا کہ تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم مجھ سے یہ توقع مت رکھنا۔ پتہ نہیں، تم مجھے یہ بات کیوں یاد دلاتے تھے۔ شاید جتلانا چاہتے تھے کہ دیکھو تم نے جو کہا تھا اس پر قائم نہیں رہ سکی ہو۔ میں یہ کبھی بھی نہیں جان سکی کہ تمہارے ذہن میں کیا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر تم ایسا کرتے تھے۔

اور پھر تم ہمارے شہر میں آ گئے۔

اُس روز میں نے بڑے دنوں بعد کچھ ہائیکو کہی تھی اور انہیں ڈائری میں نوٹ کر رہی تھی کہ تمہارا فون آ گیا۔

''سنو دُرِ نایاب! میں اس وقت تمہارے شہر میں ہوں اور اپنے آفس سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔''

''تم کب آئے؟''

''بس کچھ دیر پہلے اور چارج لینے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ تمہیں فون کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ اس شہر میں تم میری واحد دوست ہو۔''

''لیکن کیسی دوست ہوں کہ تم میرے شہر میں آئے ہو اور میں تمہیں اپنے گھر ٹھہرا نہیں سکتی۔ تمہاری میزبانی نہیں کر سکتی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک تمہیں اکاموڈیشن نہیں مل جاتی، بحیثیت دوست میرا فرض بنتا ہے۔ لیکن کاش، میں لڑکی نہ ہوتی۔''

''یہ تو ہے...... بہرحال ڈونٹ وری۔'' تم نے کہہ دیا۔ ''اِٹس ٹو مچ۔'' تم خوش لگ رہے تھے۔

''پریشان تو نہیں ہو نئی جگہ آ کر؟''

''نہیں...... یہ شہر بالکل اپنا اپنا سا لگ رہا ہے اور میں تو بہت خوش ہوں۔ اور پتہ ہے میں نے شہر میں داخل ہوتے ہی تمہیں دیکھا ہے۔''

''مجھے......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہاں......؟''

''اپنے آفس کے سامنے مین روڈ پر ملٹی شوز کے قریب۔ کیا تم آج وہاں سے نہیں گزری تھیں تقریباً گیارہ بجے؟''

''ہاں...... گزری تو تھی میں۔'' میں سُن سی ہو گئی تھی۔ ایک دم ساکت۔

''تم نے جامنی کلر کے کپڑے پہنے تھے، بلیک چادر تھی جس کے کنارے پر پنک کلر کی کڑھائی تھی اور تم نے جاگرز پہنے ہوئے تھے۔''

تم سرشار سے کہہ رہے تھے اور میں حیران سی ریسیور تھامے کھڑی تھی۔ میں ملٹی شوز سے جوتے خریدنے گئی تھی۔ میں نے جامنی کلر کے کپڑے پہن رکھے تھے بلکہ ابھی بھی میں نے وہی سوٹ پہنا ہوا تھا۔

''اور تم نے گلاسز بھی لگائی ہوئی تھیں۔''

''ہاں...... مگر تم...... تمہیں کیسے پتہ چلا شہریار! کہ وہ میں تھی؟''

''بس پتہ نہیں کیسے۔'' تم خود بھی حیران سے تھے۔ ''میں مین روڈ پر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کسی عمارت پر اپنے آفس کی تختی لگی نظر آئے کہ اچانک میری نظر تم پر پڑی۔ تم سر جھکائے آ رہی تھیں۔ میں نے تمہارا چہرہ نہیں دیکھا لیکن پتہ نہیں کیوں، خودبخود میرے دل میں آیا کہ یہ تم ہو۔ جامنی کپڑوں میں وقار سے چلتی ہوئی۔ حالانکہ اس وقت بہت ہجوم تھا۔ کئی اور لڑکیاں بھی آ جا رہی تھیں۔''

تمہارے دل کی اس گواہی پر بعد میں بھی ہم کئی بار حیران ہوئے تھے۔

کس قدر عجیب اور حیران کن بات تھی۔

بالکل افسانوی سی۔

اتنے بڑے ہجوم میں، اجنبی شہر کے اجنبی بازار میں سے گزرنے والی بے شمار لڑکیوں میں سے تم نے مجھے پہچان لیا تھا اور تمہیں ذرا بھی خبر نہیں تھی کہ میں اس وقت وہاں سے گزروں گی۔

اور آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں حیران ہو رہی تھی شہریار! کہ کیسے تم نے اتنے یقین سے کہا تھا کہ تم نے مجھے دیکھا ہے۔

شاید زندگی میں ہر شخص کے ساتھ کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ضرور ہوتا ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ جس پر آدمی ہفتوں، مہینوں بلکہ سالوں حیران رہتا ہے۔

تمہارا اس طرح مجھے پہچاننا بھی ایسا ہی ایک واقعہ تھا جس پر ہم دنوں، ہفتوں، مہینوں بلکہ سالوں حیران ہوتے رہے۔

''اچھا سنئیں، آپ کا آفس کیسا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟'' میں نے تم سے پوچھا تو تم چونک پڑے تھے۔

''ہاں ...... آفس اچھا ہے اور لوگ ...... لوگوں کے بارے میں ابھی کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہاں تو ہر شخص چہرے پر نقاب چڑھائے بیٹھا ہے۔ اس نقاب کے پیچھے اصل چہرہ کیا ہے، کون جانے۔ پتہ نہیں لوگوں کے پاس اتنے نقلی چہرے کہاں سے آ جاتے ہیں دُر نایاب! میں آج تک نہیں جان سکا۔ مختلف لوگوں سے ملنے کے لئے مختلف چہرے جیسے وہاں میرے لاہور والے آفس میں میرا باس جب مجھ سے بات کرتا تھا تو اس کا جو چہرہ ہوتا تھا وہ اس چہرے سے قطعی مختلف ہوتا تھا جو چہرہ وہ بڑے صاحب سے بات کرتے وقت لگاتا تھا۔ پھر چھوٹے ملازموں سے بات کرتے ہوئے وہ ایک اور چہرہ اپنے چہرے پر سجا لیتا تھا۔ دوستوں سے بات کرتے ہوئے اور چہرہ۔ اس میں بھی دوستوں کی قسمیں تھیں۔

خالی خولی دوست، جن سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا ان کے لئے اس کے پاس ایک الگ چہرہ تھا۔ رُوکھا پھیکا، کلف لگا چہرہ۔ اور وہ دوست جن سے اس کا مفاد وابستہ تھا ان کے لئے ایک اور چہرہ۔

نرم ملائم، ہنستا مسکراتا چہرہ۔

جس سے چینی کے شیرے میں لتھڑے لفظ برآمد ہوتے تھے۔ اور جب میں کسی کو ایسا چہرہ لگائے خود سے باتیں کرتے دیکھتا ہوں نا تو میرے ہونٹ چینی کے شیرے سے

چپک جاتے ہیں اور مجھے متلی سی ہونے لگتی ہے۔

پتہ ہے دُر نایاب! پھر جب میں نے غور کیا تو مجھے پتہ چلا کہ صرف میرے باس کے پاس ہی نہیں، ہر ایک کے پاس ایسے بے شمار نقلی چہروں کا ڈھیر لگا ہے اور ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق جب جی چاہتا ہے اپنی پسند کا چہرہ اپنی گردن پر سجا لیتا ہے۔

میرے اردگرد کتنے سارے نقلی اور مصنوعی چہرے ہیں۔ ڈھیر لگا ہے۔

خوشامدی
ناراض
غصیلے
کلف لگے
مصلحت کا میک اَپ کئے
شیرے اور مکھن میں لتھڑے
جھوٹے، مکار
فریبی چہرے۔

میں نے تو مدت ہوئی چہروں کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مصنوعی چہروں میں بھلا کیا رکھا ہے۔''

''شاید اسی خوف سے آپ نے میرا چہرہ نہیں دیکھا۔ ایک دم اصلی ہے۔'' میں نے شرارت سے کہا تو تم بھی ہولے سے ہنس دیئے۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارا چہرہ اصلی ہے اور پتہ ہے، شدید خواہش کے باوجود میں تمہارے چہرے کی طرف نہیں دیکھ سکا تھا۔ میری پہلی نظر تمہارے پاؤں پر پڑی تھی اور میرے اندر کہیں ادراک ہوا تھا کہ یہ تم ہو۔

میری بہت اچھی دوست۔

اور پھر میری نگاہوں نے ایک لمحے کے لئے تمہیں اپنے احاطے میں لیا تھا اور پھر میں نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ کس قدر آکورڈ لگتا، وہاں کھڑے ہو کر کسی کو احمقوں کی طرح گھورنا۔''

''اچھا، اب پتہ چلا آپ ڈر گئے تھے کہ کہیں جوتے نہ پڑ جائیں۔''

''جی نہیں ...... کس میں اتنی جرأت ہے۔ ہماری پرسنیلٹی بہت زبردست ہے۔''

''اچھا، مجھے آپ نے پہلے تو کبھی نہیں بتایا۔''

''اب بتا دیا ہے..... دیر آید درست آید۔''

''اچھا جناب، سنجیدہ ہو جائیں اور بتائیں کہ رہائش کا کیا ،کیا ہے؟''

''فی الحال ہوٹل میں۔ مگر جلد ہی کوئی جگہ دیکھ لوں گا۔''

''یہاں اس شہر میں میرے ابو کے ایک بہت اچھے دوست ہے بلکہ کبھی اچھے دوست تھے۔ ابو کے بعد انہوں نے کبھی ہماری خبر نہیں لی۔ کبھی رابطہ نہیں رکھا۔ مگر شاید پرانے تعلق کے ناتے وہ اتنی مدد کر ہی دیں کہ رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے۔ میرا ارادہ تو نہیں تھا ان کے پاس جانے کا مگر امی نے بہت اصرار کیا تھا کہ اُن سے ضرور ملوں۔ پتہ ہے دُری! سوری۔ تم نے برا تو نہیں منایا؟ میں تمہیں دُری کہہ کر بلا رہا ہوں۔''

''نہیں، اچھا لگا ہے۔''

''تھینک یو۔ ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میرا بچپن یہاں ہی گزرا ہے، اسی شہر میں۔ اور یہ بات میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں بتائی۔ دس گیارہ سال کا تھا میں جب ہم لاہور شفٹ ہوئے تھے۔''

''ہاں جی، ابھی نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو آپ نے مجھے نہیں بتائیں۔''

''کیا بات ہے دُری! آج بہت خوش لگ رہی ہو۔''

''بھئی صاف صاف پوچھ لیں بلکہ کہہ دیں کہ میرے آنے سے خوشی ہو رہی ہے۔ تو کیا ہے، آپ دوست نہیں ہیں؟ اور دوستوں کے آنے سے خوشی نہیں ہوتی؟''

''جی ہاں ..... تو دُری! میں تمہیں بتا رہا تھا نا کہ بچپن میں ہم یہیں رہتے تھے اور یہ جو ڈاکٹر ہاشمی ہیں نا، ابو کے بہت گہرے دوست تھے، اتنے گہرے کہ ابو نے کبھی ہم میں اور ان کے بچوں میں فرق نہیں کیا تھا۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈاکٹر ہاشمی ابو کے دوست ہیں۔ ہم تو انہیں ابو کا بھائی ہی سمجھتے تھے۔ میں تو خیر ان دنوں بہت چھوٹا تھا لیکن تیمور بھائی ان سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ مگر پھر پتہ نہیں کیا ہوا، امی بتاتی ہیں کہ ڈاکٹر ہاشمی کو ہم لوگوں سے بدظن کرنے میں ان کی وائف کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ عورتیں ایسی کیوں ہوتی ہیں دُری؟''

''اور یہ مرد ایسے کیوں ہوتے ہیں نوید شہریار! کہ عورتوں کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ ان کے کہے کو سچ جان لیتے ہیں۔ کیا ان کے پاس اپنی آنکھیں، اپنے کان، اپنا دماغ نہیں ہوتا؟ تو جناب، اب بتائیں، قصور کس کا ہے؟''

''قصور تو نور جہاں کا ہے۔''

''واقعی۔'' میں ہنس دی۔ ''قصور تو نور جہاں کا ہی ہے۔''

''پتہ ہے نایاب! ابو کی زندگی میں ہی ڈاکٹر ہاشمی کے رویوں میں سرد مہری آ گئی تھی۔ شدید محبتیں رسمی تعلقات میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور محبتیں ...... اتنی شدید محبتیں کیسے ختم ہو جاتی ہیں؟ ابو بیمار ہوتے تو ڈاکٹر ہاشمی ساری رات ان کے سرہانے بیٹھے رہتے تھے اور ڈاکٹر ہاشمی بیمار ہوتے تو ابو کی راتوں کی نیند اُڑ جاتی تھی۔ پھر یوں بھی ہوا کہ ابو......''

''یہ وہ..... ڈاکٹر رفیق ہاشمی تو نہیں ہیں؟''

تم اداس ہو رہے تھے نا۔ اس لئے میں نے تمہیں ٹوک دیا۔

''اور ان کی وائف کا نام عابدہ ہے۔''

''ہاں۔''

''اور ان کے بڑے بیٹے کا نام تنویر ہے۔ پھر منصور اور پھر مسعود۔''

''ہاں.....'' تم حیران ہو رہے تھے۔

''وہ ڈاکٹر ہاشمی بابا کے بھی دوست ہیں۔ بہت گہرے تو نہیں مگر بس دوست ہیں۔ کبھی کبھی بابا جب ویک اینڈ پر گھر آتے ہیں تو ان کے پاس ضرور جاتے ہیں۔ کبھی کبھار میں بھی چلی جاتی ہوں۔''

''اچھا پھر تو میں ضرور جاؤں گا ڈاکٹر ہاشمی کے ہاں۔ کیا خبر کہیں آتے جاتے تم پر بھی نظر پڑ جائے۔''

''ہر روز عید نیست۔ آج اگر اتفاق سے میں آپ کو نظر آ گئی ہوں تو ضروری تو نہیں کہ پھر کبھی ایسا اتفاق ہو جائے۔ ممکن ہے آپ دس سال بھی یہاں رہیں تو میں آپ کو نظر نہ آؤں۔''

''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن نایاب! یہ بات مان لو کہ یہ اتفاق نہیں تھا۔ پتہ نہیں قدرت ہمیں ایک دوسرے کے قریب کیوں لا رہی ہے۔''

تم کچھ کچھ اپ سیٹ سے ہو گئے تھے۔ اگرچہ ظاہر نہیں کر رہے تھے لیکن میں فیل کر رہی تھی۔

''دیکھو نا دُری! کیا اب یہ ضروری تھا کہ اس پہلے اتفاق کے بعد یہ دوسرا اتفاق بھی ہوتا کہ ڈاکٹر ہاشمی میرے اور تمہارے بابا دونوں کے دوست ہیں۔''

''ہوتا ہے..... ہوتا ہے..... کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ آخر دنیا گول ہے۔''

''اور تمہیں یاد ہے شہریار! اُس روز تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ''اگر اجازت ہو تو کبھی کبھی تمہیں فون کر لیا کروں۔ آخر تمہارے شہر میں آنے کا اتنا ایڈوانٹیج تو ملنا چاہئے نا مجھے۔''

''جی ضرور......'' میں نے کہا تھا۔

''اور پتہ ہے، جب میں نے تمہیں لاہور سے فون کیا تھا تو تم کتنی زیادہ خفا ہوئی تھیں......کتنا ڈانٹا تھا مجھے۔ اور اگر میں نے ای کی قسم نہ کھائی ہوتی تو تم کبھی میرا یقین نہ کرتیں۔''

پتہ نہیں کیا بات تھی شہریار! تم ہمیشہ ہی مجھے میرا پچھلا رویہ یاد دلاتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تمہارے اندر دوسروں کے منفی یا مثبت ہر طرح کے رویے بہت اثر چھوڑتے ہیں۔

تم بھولتے نہیں ہو۔

یہی وجہ تھی کہ تمہیں سب سے گلے تھے۔

ایسے گلے، ایسے شکوے جو کبھی تم ان سے نہیں کر سکے تھے جن سے تمہیں گلے تھے۔

لیکن یہ شکوے تمہارے اندر موجود تھے، تہہ در تہہ دھرے ہوئے تھے اور ان چھوٹے چھوٹے شکووں اور گلوں نے اکٹھا ہو کر تمہارے دل کے پیالے کو بھر دیا تھا۔ اس لئے تمہارے لہجے میں کبھی کبھی تلخی آ جاتی تھی۔ اس لئے میں تمہیں تمہارے اردگرد موجود ننھی ننھی مسرتوں اور خوشیوں کا احساس دلاتی رہتی تھی اور میں چاہتی تھی کہ تم ان خوشیوں کو پوری طرح محسوس کرو، تمام تر شدتوں کے ساتھ۔ انہیں انجوائے کرو اور خدا کا شکر ادا کرو کہ خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے اور تمہارے اِردگرد بہت ساری خوشیوں کے ڈھیر لگے ہیں اور اگر تم انہیں پوری طرح محسوس نہیں کرتے تو یہ تمہاری نظروں کا قصور ہے۔

حالانکہ تمہارا ہمیشہ یہی موقف رہا ہے کہ قصور تو نور جہاں کا ہے اور میں کہتی تھی، قصور صرف نور جہاں کا ہی نہیں ہے اور لوگوں کا بھی ہے۔

تم یہاں ایڈجسٹ ہو گئے تھے مگر ابھی ہوٹل میں ہی تھے اور ابھی تک تم ڈاکٹر ہاشمی کے ہاں بھی نہیں جا سکے تھے۔

اب میرے اور تمہارے درمیان خطوط کا سلسلہ نہیں تھا لیکن ہفتے میں ایک بار فون پر ضرور بات ہوتی تھی۔

کبھی مختصر۔

کبھی طویل۔

ایک دن تم نے فون کیا تو تم بہت مطمئن تھے۔

''نایاب! آج میں ڈاکٹر ہاشمی کے ہاں گیا تھا۔''

''کس طرح ملے تھے؟''

''بس سو سو...... حسبِ توقع رسمی انداز میں۔''

''تمہارا مسئلہ حل ہوا؟''

''ہاں ...... انہوں نے کہا تو ہے کہ وہ پتہ کریں گے۔ پتہ ہے نایاب، میرا بڑا دل چاہ رہا تھا کہ میں آنٹی سے اور بچوں سے ملوں۔ پتہ ہے، وہ مسعود جو ہے نا، وہ میرا ہم عمر ہی تھا اور ہم دونوں بچپن میں دوست ہوا کرتے تھے۔ مگر انکل ہاشمی نے ایک بار بھی مجھے گھر چلنے کو نہیں کہا۔''

''انسان کو کسی سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔''

''دوستوں اور اپنوں سے بھی نہیں؟''

''ہاں، دوستوں اور اپنوں سے بھی نہیں۔ اس لئے کہ یہی لوگ جب توقعات پر پورے نہیں اترتے تو دُکھ زیادہ ہوتا ہے۔ غیروں سے توقعات ہوتی ہی نہیں ہیں بابا۔''

''اچھا مس صاحبہ!''

کبھی کبھی بابا کی نسبت سے تم مجھے مِس صاحبہ کہہ دیا کرتے تھے۔

''تم بھی اپنے بابا کے ساتھ یونیورسٹی چلی جایا کرو۔ بہت سے بے چارے طلباء تمہارے لیکچر سے مستفید ہو سکیں گے۔''

''ہاں ...... میں نے تو آفر کی تھی لیکن یونیورسٹی والوں کو نقصِ امن کا خطرہ تھا۔ سو انہوں نے بصد احترام واپس پویلین میں بھیج دیا۔''

پھر کچھ دنوں کے لئے تم چھٹی لے کر گھر چلے گئے۔

اور یقین کرو میں نے تمہیں بہت مِس کیا۔

اور پھر کئی دن بعد تمہارا خط آیا۔

تم نے چھٹی بڑھوا لی تھی۔ اس لئے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور ڈاکٹر تمہیں اُلٹی سیدھی باتیں کہہ رہے تھے۔

''اچانک یہ بیماری کہاں سے ٹپک پڑی ہے؟'' میں نے پہلی بار تمہارے گھر فون کیا

تھا۔

تم حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔

میں تمہارے لئے بہت پریشان تھی۔

''یہ بیماری اچانک نہیں ٹپکی ہے دوست! بہت دنوں سے ہے۔ بہت سارے دنوں سے۔ کچھ لوگ بہت مضبوط ہوتے ہیں نایاب! میں شاید اندر سے اتنا مضبوط نہیں تھا، اس لئے ہار گیا ہوں۔ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے اندر سے سارا تھک چکا ہوں دُری! ختم ہو چکا ہوں۔''

''بری بات ...... بہت بری بات۔ یو آر اے ینگ مین۔''

''ارے کہاں ینگ ہوں۔''

''آپ میرے ہی ایج گروپ سے تعلق رکھتے ہیں، آپ نے بتایا تھا نا مجھے۔ اور میں تو ینگ ہوں۔''

''ہاں مجھے پتہ ہے، تم ینگ ہو۔ لیکن بڑھاپا صرف عمروں سے تو نہیں ہوتا نا۔ یہ تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ تم ایسے حالات سے نہیں گزری ہو نایاب جن سے میں گزرا ہوں۔ ابو کی موت کے بعد میں اندر سے بالکل ڈھے گیا تھا۔ تمہیں نہیں معلوم بچھڑ جانے والوں کا دُکھ کیا ہوتا ہے۔ مر کر بچھڑ جانے والوں کا دُکھ اور زندہ لوگوں کے بچھڑ جانے کا دُکھ۔''

''ہوں......'' میں دل ہی دل میں تمہاری بے خبری پر مسکرا دی تھی۔

تمہیں بھی کیا خبر تھی کہ میں ان دونوں دکھوں سے آشنا ہوں۔

اور صرف آشنا ہی نہیں، میں نے ان دکھوں کا کرب اپنے دل پر جھیلا ہے، سہا ہے۔

لیکن تب میں نے اپنے بارے میں تمہیں کچھ زیادہ نہیں بتا رکھا تھا۔

تم صرف اتنا جانتے تھے کہ میں دُرِ نایاب ہوں۔

اور بہت اچھا شعری ذوق رکھتی ہوں اور کبھی کبھی کسی میگزین یا اخبار میں میری کوئی نظم یا غزل چھپ جاتی ہے اور یہ کہ میں نے انگلش میں ماسٹرز کر رکھا ہے اور میرے بابا پروفیسر ہیں۔

''لیکن شہریار! ہر دوسرے شخص کے اندر اگر آپ جھانک کر دیکھیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اس نے بچھڑ جانے والوں کا دُکھ سہا ہے۔

زندگی میں بچھڑ جانے والوں کا دُکھ۔

اور مر کر بچھڑ جانے والوں کا دُکھ۔ لیکن لوگ اس طرح حوصلہ تو نہیں ہارتے۔''

''ہاں ...... شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر دُری تمہیں کیا خبر۔

یہ لوگ......

یہ میرے اپنے لوگ میری محبتوں کے بھی قاتل ہیں۔

انہوں نے ...... ان سب نے مل کر میری محبتوں کا قتل کیا ہے۔

اور میں خود قتل ہوا ہوں۔

اپنی مرضی سے۔

اپنی رضامندی سے۔

صرف اس لئے کہ میں ان سے بھی بہت محبت کرتا تھا اور ان سب کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ایک اپنی محبت پانے کے لئے اتنی بہت ساری محبتوں سے دامن چھڑانا، ان سب کو خفا کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔

اور میرے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جس کی بات رد کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔

نگاہوں میں اُمید اور یقین لئے۔

اعتماد کا عصا تھامے۔

اور میں اُس شخص سے اعتماد کا یہ عصا چھین نہیں سکا دُری!

میں اُس کی آنکھوں میں جلتے اُمید اور یقین کے رنگ مٹا نہیں سکا۔

وہ شخص میرا باپ تھا۔

مجھے بے تحاشا چاہنے والا۔

مجھ سے محبت کرنے والا۔

میں نے لمحہ بھر کے لئے سوچا تھا کہ اگر میں اُس کے سامنے کھڑا ہوتا یونہی اعتماد اور اُمید کے رنگوں کا کشکول اٹھائے تو یہ شخص اعتماد کے موتیوں سے، اُمید کے سکوں سے میرا کشکول بھر دیتا۔ چاہے خود اسے اپنا آپ بیچنا پڑتا۔

اپنی زندگی مٹانی پڑتی۔

وہ ایسا ہی ایک شخص تھا دُری! جس نے دوسروں کے لئے، اپنے عزیزوں اور اپنے بہن بھائیوں کے لئے بڑی قربانیاں دی تھیں اور پھر میں تو اُس کا خون تھا، اس کا بیٹا تھا جسے شاید وہ سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ یقیناً وہ ایک لمحہ بھی سوچے بنا میرے لئے، میری خاطر اپنا آپ داؤ پر لگا سکتا تھا۔

پھر میں کیوں نہیں ...... میں کیوں نہیں ایسا کر سکتا۔

میں شاید بہت بزدل تھا۔ بہت کمزور۔ اندر سے تنکے سے بھی زیادہ کمزور اور بے بس جو ہوا کے زور پر پانی کی لہروں پر بہتا چلا جاتا ہے ...... میری بھی کوئی مرضی نہیں رہی تھی۔ میں بھی ان سب کی محبتوں کے پُر شور ریلے میں بہتا چلا گیا اور خود اپنی مرضی سے صلیب پر چڑھ گیا اور میرے اندر اپنوں نے، مجھ سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں نے میرے ہاتھوں اور پیروں میں میخیں گاڑ دیں۔

میرے لئے راتوں کو جاگنے والی ماں نے اور میرے اچھے اور خوبصورت مستقبل کے خواب دیکھنے والے باپ نے میرا سب سے خوبصورت خواب مجھ سے چھین لیا۔

اُس باپ نے جس نے بچپن سے لے کر اب تک میری ہر خواہش پوری کی تھی۔

جس چیز پر ہاتھ رکھا، وہ چیز میری ہو گئی تھی۔ جو میں نے چاہا، وہ اس نے حاضر کر دیا۔''

تمہاری آواز میں آنسو گھلنے لگے تھے اور ان کی نمی مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہو رہی تھی اور میرا حلق اندر سے نمکین ہو رہا تھا اور میں بہت خاموشی سے تمہاری بات سن رہی تھی۔

تم لمحہ بھر کو چپ ہوئے تو میں نے پوچھا۔

''شہریار! تمہاری بیوی اور تمہارے بچے۔ تم نے کبھی پہلے ان کا ذکر نہیں کیا۔ کیسے ہیں؟ کتنے بچے ہیں؟ بیوی کیسی ہے؟''

''دُری! مجھے صلیب پر تو چڑھا دیا گیا ہے لیکن میں آج بھی اپنی صلیب اٹھائے پھر رہا ہوں کہ شاید عیسیٰؑ کی طرح مجھے بھی زندہ اُٹھا لیا جائے۔

شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔ شاید میرے وجود میں گڑی میخیں خود بخود گر جائیں اور میں ایک بار پھر زندہ ہو جاؤں۔

لیکن نہ تو میں عیسیٰؑ ہوں اور نہ ہی میرا دور معجزوں کا ہے۔

اگر ایسے ہی معجزے ہونے ہوتے نایاب! تو یہ معجزہ اُس وقت نہ ہو جاتا جب ابو اور ماں جی، آپو اور تیمور بھائی نے میری پسند کو سراہا تھا اور اس کی ممی سے کہا تھا کہ بہت جلد ہم شہریار کا باقاعدہ پرپوزل لے کر آئیں گے۔ آج سے یہ ہماری بیٹی ہے۔ ہمارے شہریار کی امانت۔

اُس روز میں کتنا خوش تھا۔

تم میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔

میں نے جس کا ساتھ چاہا تھا، جس کی رفاقت کی تمنا کی تھی، جس کے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے تھے، جسے دن رات سوچا تھا اُسے پانے میں کوئی دقت نہیں تھی۔

بہت جلد ہم دونوں زندگی کے سفر میں اکٹھے ہونے والے تھے اور آنے والے دنوں میں مجھے اُس کی ہمراہی کی خوشی ملنے والی تھی اور اس خوشی میں سب شریک تھے۔

اور یہ بات بھی میرے لئے بہت خوشی کی تھی کہ خوشی کے اس سفر میں جاذب بھائی کی طرح میں اکیلا نہیں تھا۔

انہوں نے بھی اپنی محبت کو پا لیا تھا۔

مگر وہ اکیلے تھے۔ تنہا تھے۔

شاید رافعہ بھابی کو پا کر وہ اتنا بھرپور خوش نہ ہو سکے جتنا خوش میں تھا۔ مجھے میری محبت بھی مل رہی تھی اور میرے اپنوں کی خوشی بھی اس میں شامل تھی۔

اُس روز مجھے جاذب بھائی بہت یاد آئے تھے۔

میں نے اُنہیں بہت مِس کیا تھا اور بہت دیر تک تیمور بھائی سے اس بات پر بحث کی تھی کہ ابو کو اب جاذب بھائی کو معاف کر دینا چاہئے اور میں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ میں پہلی فرصت میں ان کے گھر جاؤں گا اور ان کو، بھابی کو اور گڑیا کو گھر لے کر آؤں گا۔ پھر بابا ان سے کہاں خفا رہ سکیں گے اور امی تو ان سے خفا تھیں ہی نہیں۔

میں نے اکثر انہیں روتے اور جاذب بھائی کو یاد کرتے دیکھا تھا۔

مگر نایاب، انسان جو کچھ سوچتا ہے، ایسا ہوتا نہیں ہے۔

اوپر آسمانوں پر کچھ اور ہی فیصلے ہو رہے تھے۔ تقدیر کوئی اور ہی وار کرنے والی تھی مجھ پر۔

چھوٹی خالہ کی شدید بیماری کی اطلاع۔

آپو نے اطلاع دی تھی کہ وہ ہم سب سے ملنے کی شدید خواہش مند ہیں۔ آپو ...... میری سگی بڑی بہن چھوٹی خالہ کی بہو تھیں۔ امی رونے لگی تھیں۔

اور ہم سب اسی وقت سیالکوٹ روانہ ہو گئے تھے۔

اور پھر خالہ جان نے امی اور ابو سے وہ مانگ لیا جو دینا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔

وہ انہیں یہ بھی نہ بتا سکے کہ وہ ابھی ابھی کسی سے وعدہ کر کے آ رہے ہیں۔

آپو کی آنکھوں میں التجا تھی۔

ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
شاید یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا تھا۔
منیب بھائی کی آنکھوں میں نظر نہ آنے والی دھمکی تھی، تنبیہ تھی۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہوں، زبان سے کچھ کہنے سے پہلے سوچ لینا۔ تڑپ کا پتا میرے ہاتھ میں ہے۔
اپنی بیٹی اور بہن کی خوشیوں کا دھیان رکھنا۔
یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔
آپو نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس نے ننھے زین کو بڑی خاموشی سے میری گود میں ڈال دیا تھا اور رشنا اور ایما کا ہاتھ پکڑ کر ابو کے پاس بٹھا دیا تھا۔ بغیر کچھ کہے اس نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔
پتہ نہیں یہ سودا مہنگا تھا یا سستا مگر آنکھوں آنکھوں میں ہی بارگیننگ ہو رہی تھی۔ کون بِک رہا تھا، کون نیلام ہو رہا تھا اس سے کسی کو غرض نہیں تھی نایاب! دونوں پارٹیوں کو اپنے اپنے نفع کی فکر تھی۔
اور شاید دونوں ہی نقصان میں نہیں رہے تھے۔ نیلام ہونے والے یا بکنے والے کے کرب کو کون جان سکتا ہے؟
میں یوں ساکت بیٹھا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے پتھر ہو گیا ہوں اور زین کو میرے پتھر ہاتھوں نے تھام رکھا تھا۔ میرے پتھر وجود میں صرف میری بصارت اور میری سماعت زندہ تھی۔ میری نگاہیں ابو کے چہرے پر تھیں اور میرے کان اس فیصلے کے منتظر تھے جو میری ذات کے متعلق سنایا جانے والا تھا۔ اور جس میں میری حیثیت نہ مدعی کی تھی، نہ دعویدار کی۔ بلکہ میں تو وہ مجرم تھا جسے ابھی لمحہ بھر بعد پھانسی کا حکم ہونے والا تھا اور جسے عدالت نے بھی ازراہِ کرم کوئی وکیل مہیا نہیں کیا تھا۔
بس ایک آخری اپیل۔ رحم کی اپیل باقی تھی۔ جسے کرنے والا کوئی نہیں تھا۔
اور پھر یہ حکم صادر ہو گیا۔
کسی نے رحم کی اپیل نہیں کی ڈری!
اور مجھے دار پر لٹکا دیا گیا۔
ابو نے آپو کے سُتے ہوئے چہرے سے نظریں ہٹا کر ایک ہاتھ سے رشنا اور ایما کو اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا اور دوسرا ہاتھ خالہ کے سر پر رکھا تھا۔

''پریشان کیوں ہوتی ہو کنیز بہن! گھر کی بات ہے...... آج سے شہریار تمہارا بیٹا ہے اور گڈی میری بیٹی۔ میری بہو سب کچھ ہے۔''
لمحہ بھر کو مجھے یوں لگا تھا جیسے میری آنکھوں میں کسی نے گرم سلائیاں پھیر دی ہوں اور کانوں میں سیسہ ڈال دیا ہو...... میری بصارتیں اور میری سماعتیں بھی تھوڑی دیر کو مفلوج ہو گئی تھیں۔ جب کچھ دیر بعد میں کچھ سننے سمجھنے کے قابل ہوا تو میرے اردگرد کا منظر بدل چکا تھا۔
آپو کے تھکے ہوئے مضمحل چہرے پر زندگی کے رنگ جھلملانے لگے تھے اور خوفزدہ آنکھوں میں یقین اور اعتماد کی چمک لوٹ آئی تھی۔
میری تمناؤں کا خون کر کے...... میری آرزوؤں کا قتل کر کے...... ابو نے آپو کا گھر بچا لیا تھا۔
مگر میرا گھر تو بننے سے پہلے ہی ڈھے گیا تھا ڈری!
منیب بھائی نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنے چہرے پر جو چہرہ سجا رکھا تھا، کسی وڈیرے کا چہرہ...... خونخوار ساڈراتا دھمکاتا ہوا چہرہ...... اس کی جگہ اب نیا چہرہ پہن لیا تھا...... محبتوں کا اظہار کرتا ہوا۔
نہ جانے کب زین میرے بازوؤں سے اُن کی بانہوں میں منتقل ہو چکا تھا اور اُس کے رخسار سے رخسار ٹکائے جانے اس سے کیا کہہ رہے تھے۔
یکا یک ہر چیز سے مجھے نفرت ہونے لگی۔
اس ہنستے ہوئے ماحول سے۔
چھوٹی خالہ کے پُرسکون چہرے سے۔
رشنا، ایما اور زین کے معصوم چہروں سے، سب سے اور آپو کی خوشی سے۔
ابو اور امی کے اطمینان سے۔
ابھی چند گھنٹے پہلے وہ کیا وعدہ کر آئے تھے، یہ سب انہوں نے بھلا دیا تھا۔
وہ وعدہ جو وہ کر کے آئے تھے ان کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں تیزی سے باہر لپکا۔
تیمور بھائی نے مجھے باہر جاتے دیکھا اور میرے پیچھے آئے۔
''پلیز تیمور بھائی!'' میں نے مُڑ کر ملتجی نظروں سے انہیں دیکھا۔
تیمور بھائی خاموشی سے واپس پلٹ گئے۔

میرے اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ مچی تھی۔ بڑا دھواں تھا، بڑی گھٹن تھی۔ یوں جیسے کوئی بہت بڑا پلازہ ایک دم زلزلوں کی زد میں آ گیا ہو۔

میں ٹیرس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت دیر تک کھڑا رہا۔ اور جب میری ٹانگوں میں سکت ختم ہو گئی تو میں وہیں بیٹھ گیا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں دُری! اُس کرب، اس اذیت کا جس سے اس وقت میں گزرا تھا۔ اس لئے کہ تم نے اس طرح کا کرب کبھی نہیں جھیلا۔''

میں نے اس طرح کا کرب نہیں سہا شہریار! لیکن میں نے اس سے ملتے جلتے کرب ضرور تنہا اپنے دل پر جھیلے تھے۔ مگر میں نے تم سے کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ میں چاہتی تھی کہ تم بولتے رہو۔ جانے کب سے، کتنے برسوں سے یہ لاوا تمہارے دل میں پک رہا تھا۔ اچھا ہے، تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اگر تم میرے قریب ہوتے تو میں تمہارے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تمہیں احساس دلاتی کہ تمہارا درد میرے دل میں اُتر آیا ہے اور میں تمہارے کرب کو بالکل اسی طرح محسوس کر رہی ہوں جس طرح تم نے اپنے دل پر جھیلا ہے۔ لیکن تم بہت دور تھے اور ایسے موقعوں پر لفظ بالکل بیکار ہوتے ہیں۔

سو میں خاموشی سے تمہاری بات سن رہی تھی۔

''دُری! میں کس طرح اس درد کو تمہارے سامنے مجسم کر کے دکھاؤں جو اس وقت میرے دل کو چھیل رہا تھا۔ تم شعر کہتی ہو۔ یقیناً سمجھتی ہو گی۔''

''ہوں......''

''دُری! میں نے اس سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ کبھی اسے اپنی محبتوں کا اس طرح یقین نہیں دلایا تھا جس طرح کوئی مرد کسی عورت کو دلاتا ہے۔ ہم نے شاید کبھی ایک دوسرے کو یہ نہیں کہا تھا کہ I LOVE YOU لیکن ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔

بہت گہری اور بہت شدید محبت۔

تم اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔

جہاں محبتیں اتنی شدید اور گہری ہوں، لفظ کے سہاروں کی ضرورت نہیں ہوتی اور میں نے اس لئے بھی اس سے کچھ نہیں کہا تھا، کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اپنے وعدوں اور لفظوں میں جھوٹا نہیں ہونا چاہتا تھا۔

میرے سامنے جاذب بھائی تھے۔

اُن کی بغاوت تھی۔

تیمور بھائی کی خاموش پسندی تھی۔

جسے انہوں نے جاذب بھائی کے انجام کو دیکھتے ہوئے ذہن سے نکال دیا تھا۔

میں اُس سے محبت کرتا تھا۔

اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

زندگی کا سارا سفر اُس کی ہمراہی میں طے کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس کی آنکھوں میں کوئی خواب سجانے کی بجائے اس کی جھولی میں یکدم تعبیر ڈالنا چاہتا تھا۔

مگر کیا ہوا تھا......

میں اپنے وعدوں میں جھوٹا ہو گیا تھا۔

اُس کا وہ چراغ جو ابھی چند گھنٹوں پہلے میں اس کی ہتھیلی پر جلا کر رکھ آیا تھا وہ اسے روشنی دینے کی بجائے اُسے جلا دے گا یہ کب پتہ تھا مجھے...... کب جانتا تھا میں۔

اگر جانتا تو ایسا کیوں ہوتا۔

دُری! تم اس شخص کی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتیں جس کے ہونٹوں سے پانی کا پیالہ چھو کر واپس لے لیا گیا ہو۔

جیسے جنت کی جھلک دکھا کر دوزخ میں ڈال دیا گیا ہو۔''

تمہاری آواز بھرا گئی تھی۔ شاید تم رو پڑے تھے۔

''پلیز شہریار! ریلیکس۔ پلیز...... اچھا چلیں، کوئی اور بات کرتے ہیں۔ کوئی اچھی سی بات۔ وہ کیا بتایا تھا آپ نے کہ آپ کے ڈی ایم صاحب بڑے عجیب آدمی ہیں۔ کیسے چلتے ہیں جیسے کوئی ڈرم لڑھک رہا ہو۔ دھپ دھپ، جیسے کوئی روڑی کوٹ رہا ہو۔''

''پلیز نایاب، مجھے مت روکو...... کہنے دو مجھے سب...... میں نے کسی سے یہ سب نہیں کہا...... کسی سے نہیں...... میں نے کہا تھا نا کہ برسوں سے میرے اندر برف جمی ہے۔ آج یہ برف پگھل رہی ہے تو پلیز...... اگر یہ پانی اندر ہی اکٹھا ہو گیا تو سیلاب آ جائے گا اور جب سیلاب آتا ہے تو سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ مجھے مت روکو دُری!''

''ٹھیک ہے شہریار! میں تو آپ کے لئے کہہ رہی تھی نا۔''

''اور پتہ ہے نایاب، میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ میرے اندر باہر آگ سی لگی

تھی۔ میں نے اپنے رخسار ٹیرس کی ریلنگ سے ٹکا لئے تھے لیکن ریلنگ کی ٹھنڈک بھی اس آگ کو مدھم نہیں کر رہی تھی۔

بہت دیر بعد تیمور بھائی آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا، خاموشی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی تھی۔ میں جلتے بدن اور جلتی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں رویا نہیں تھا لیکن میرا پورا وجود آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ میرے اندر باہر دریا بن گئے تھے اور میں جیسے اس دریا میں ڈوب رہا تھا۔

ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

اور لگتا تھا کوئی بھی ظالم لہر مجھے کسی بھی لمحے اپنی آغوش میں لے لے گی۔

اور پھر دائمی سکون۔

مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

میں زندہ رہا۔

بس میرے اندر سے زندگی مر گئی۔

خالہ کی طبیعت سنبھلتے ہی ہم واپس آ گئے۔ لمحوں میں کیسی قیامت گزر گئی تھی۔ ابو مجھ سے نظریں چرا رہے تھے اور تیمور بھائی بغیر کچھ کہے میرا دھیان رکھ رہے تھے۔''

''شہریار ...... حوصلہ کرو یار۔'' اُس روز تیمور بھائی واپس جا رہے تھے اپنی جاب پر۔

''میں ابھی نہ جاتا کچھ دن۔ پر میری مزید چھٹی نہیں ہے۔''

میں خاموش ہی رہا۔ کیا کہتا، وہ یہاں رک جاتے تو کیا ہو جاتا؟ کیا وہ معاہدہ جو ابو چھوٹی خالہ سے کر کے آئے تھے، ٹوٹ جاتا؟ کیا اُن کے رکنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جاتا؟

''شہریار! تمہاری حالت دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں، کاش میں نے شادی کرنے میں جلدی نہ کی ہوتی۔''

''پلیز تیمور بھائی!'' میں نے اپنا سر ان کے کندھے پر رکھ دیا اور بند ٹوٹ گیا۔

میں بہت دیر تک روتا رہا۔ دونوں بازوؤں میں مجھے بھینچتے ہوئے میری پیشانی پر پیار کرتے ہوئے تیمور بھائی نے مجھے سمجھایا۔

''گڑیا اچھی لڑکی ہے ...... پیاری ہے۔ تم نے شاید کبھی غور سے اسے نہیں دیکھا۔

''کیا کہوں گا میں اس سے۔ کیسے سامنا کر سکوں گا ان سب کا۔ کیا میں کہوں گا کہ

وہ سب جو میرے والدین نے تمہارے والدین سے کہا تھا، وہ جھوٹ تھا؟

محض ایک مذاق؟

وہ معاہدہ جو تمہارے والدین سے کیا گیا تھا، محض اس لئے منسوخ ہو گیا کہ تم میرے خاندان میں سے نہیں تھیں۔

تمہارے والدین کے ہاتھ میں منیب بھائی کی طرح وہ ترپ پتا نہیں تھا جسے شو کرا کے وہ سارے پتے سمیٹ لیتے۔

میں نے اس وقت تک اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا تیمور بھائی! جب تک ابو اور امی کی رضامندی مجھے نہیں ملی تھی کہ میں اپنے وعدوں اور قسموں میں جھوٹا نہیں ہونا چاہتا تھا۔''

تیمور بھائی ہولے ہولے مجھے تھپک رہے تھے۔

''میں خود وہاں جا کر معذرت کر لوں گا۔'' ابو نہ جانے کب اندر آ گئے تھے۔

''ہوں ...... معذرت کرنے سے کیا ہو گا؟'' میں نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا تو انہوں نے نظریں چرا لیں۔

میرا دل چاہا، میں بھی جاذب بھائی کی طرح بغاوت کر دوں۔

کہہ دوں، مجھے ان کا فیصلہ منظور نہیں ہے۔

اس کے سوا کسی اور کا ساتھ مجھے قبول نہیں ہے۔

لیکن ابو آنکھوں میں مان اور یقین لئے مجھے تک رہے تھے۔

''بیٹا! بہنوں اور بیٹیوں کے گھر اُجاڑے نہیں جاتے بلکہ بسائے جاتے ہیں تاکہ وہ زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوں۔''

اور شاید ان بہنوں اور بیٹیوں کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ اُن کے گھروں کو مضبوط بنانے کے لئے اُن کی بنیادوں میں کتنا اور کس کا خون ڈالا گیا ہے۔

میں ابو کا مان نہیں توڑ سکا اور اپنی محبت سے کنارہ کش ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم نایاب! ابو نے وہاں جا کر کیا کہا؟ کیسے معذرت کی؟ کیسے اپنی مجبوری کی کہانی سنائی؟ نہ میں نے ان سے پوچھا نہ انہوں نے مجھے بتایا۔ ہاں اس کے خط میرے پاس آئے۔

لفظ لفظ آنسوؤں میں پرو دیا۔

وہ مجھے بلا رہی تھی۔

ایک بار ملنے کو کہہ رہی تھی۔
لیکن میں کیسے سامنا کرتا اُس کا ڈری؟
کیا کہتا اُس سے؟
سو میں نہیں گیا۔
تب اُس کی ممی نے مجھے فون کیا۔
''ایک بار شہریار! تم اسے آ کر سمجھاؤ۔ بہت اچھا پرپوزل آیا ہے اس کے لئے۔ وہ تمہاری بات مان لے گی۔''
اور میں آخری بار اس سے ملنے گیا۔
بس اُس کے آنسو اُس کے رخساروں پر پھیلتے رہے۔
وہ روتی رہی اور میں اُسے خاموش ہی نہیں کرا سکا۔ میرا دل کٹ رہا تھا مگر میرے پاس لفظ نہیں تھے۔ میرے آنسو میرے اندر گر رہے تھے اور اس کے آنسو رخساروں پر۔''
تم چپ کر گئے تھے، جیسے اب بھی تصور میں اسے اپنے سامنے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔
کچھ دیر بعد تم نے بتایا کہ اُس کی شادی ہوگئی۔
''وہ کون تھی؟''
''میری ہم جماعت تھی۔ ہم ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھے۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی نایاب! بہت محبت کرنے والی۔''
''کیا نام تھا اُس کا...... کہاں گھر ہے اُس کا؟''
اور تم ٹال گئے۔
شاید ان دنوں تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ میں تھوڑا سا شاک ہوئی مگر پھر میں نے سوچا شہریار، ہمیں ملے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ تم ہر بات مجھ سے کہتے۔ بہت سی باتیں دوسروں سے نہیں کی جا سکتیں نا۔
پھر تمہیں اِدھر اُدھر کی چند مزیدار باتیں بتا کر میں نے تمہیں خدا حافظ کہہ دیا۔
اور پھر جب تک تم اپنی جاب پر واپس نہیں آئے تم مجھے فون کرتے اور خط لکھتے رہے۔
میں کوشش کرتی تھی کہ تمہاری زیادہ سے زیادہ دل جوئی کر سکوں۔
تمہارا دھیان ہٹا سکوں۔

ہم مختلف کتابوں پر ڈسکس کرتے، ایک دوسرے کو اچھے اچھے شعر سناتے اور کبھی کبھی باتوں کے دوران تم اُس کا بھی ذکر کر دیتے۔ اُس کی کوئی بات اچانک تمہیں یاد آ جاتی۔
''پتہ ہے نایاب! ہم گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک بار شادی کے بعد اُس نے مجھے خط لکھا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ ٹھیک کیا نا؟''
''ہوں......''
''میں نے اُسے کہا تھا کہ وہ مجھے بھول جائے اور گھر اور اپنے شوہر پر توجہ دے۔''
''کیا اب وہ خوش ہے، مطمئن ہے؟''
''ہاں شاید۔ اس کے بچے ہیں۔ گھر ہے۔ کہیں کسی مقام پر آ کر تو آدمی کو خود کو مطمئن کرنا ہی پڑتا ہے نایاب۔''
''پھر آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی شہریار! آپ اگر شادی کر لیتے تو مجھے یقین ہے آپ اس سے زیادہ اچھی اور مطمئن زندگی گزار رہے ہوتے جو آج گزار رہے ہیں۔ پتہ ہے آدمی کے دل میں بہت سی محبتوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ممکن ہے آپ اس لڑکی سے اتنی محبت نہ کر سکتے، اتنی شدید جتنی آپ اس سے کرتے تھے۔ لیکن یہ طے ہے کہ وہ آپ کی بیوی اور آپ کے بچوں کی ماں بن کر آپ کی محبت ضرور حاصل کر لیتی۔ آپ کو ضرور شادی کر لینی چاہئے۔''
''اب تو چل چلاؤ ہے...... اب کیا شادی کرنی۔''
''فضول۔'' میں نے ناراضگی سے کہا۔ ''مجھ سے آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ آپ کا دل بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''
''مگر ڈاکٹروں کا تو کچھ اور خیال ہے۔''
''غلط کہتے ہیں ڈاکٹر۔ کب واپسی ہے؟''
''ایک دو روز میں۔''
اور پھر تم واپس آ گئے شہریار! لیکن تم بہت بجھے بجھے اور تھکے تھکے سے لگتے تھے۔ شاید اندر سے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اور میں کوشش کرتی تھی کہ تم سے ہلکی پھلکی باتیں کیا کروں، ہنسنے مسکرانے والی۔ تمہیں یاد ہے نا شہریار، کبھی کبھی تو تم میری باتوں پر ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑتے تھے، بہت بے ساختہ ہنسی ہوتی تھی تمہاری اور مجھے لگتا تھا جیسے تمہارے اوپر چڑھا اُداسی کا خول آہستہ آہستہ اُتر رہا ہو۔ تمہارے ساتھ مل کر میں

بھی ہنسنے لگی تھی۔ پہلی بار جب کسی بات پر میں بے ساختہ ہنسی تھی تو خود ہی حیران رہ گئی تھی۔

مجھے خود اپنی ہنسی بڑی عجیب لگی تھی شہریار! کتنے سارے سالوں بعد میں اس طرح ہنسی تھی، بے ساختہ اور پھر ہم اکثر ہنسنے لگے تھے۔ تم اکثر لنچ ٹائم یا چائے کے وقفے میں فون کرتے تو میں کہتی۔

''یہ کیسی آوازیں ہیں شڑپ شڑپ کی ...... اچھا تو چائے پی جا رہی ہے۔''

''ہاں مجبوری ہے ...... تمہیں جو اس طرح پسند ہے چائے پینا۔ تو بس تمہارا دل رکھنے کے لئے پی لیتا ہوں۔''

میں لاجواب ہو جاتی تو ہم دونوں ہنس پڑتے۔

کبھی کبھی ہم دونوں نہ ہنسنے والی باتوں پر بھی خوب ہنستے۔

اُس روز تم بہت اُداس تھے۔ امریکہ سے تمہارے بھائی جان کا فون آیا تھا۔

''توقیر بھائی جان میرے سب سے بڑے بھائی ہیں۔ کافی عرصے سے تقریباً دس سال سے وہاں ہی سیٹل ہیں، اپنی فیملی کے ساتھ۔ انہوں نے تمہیں وہاں بلایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تم وہاں چیک اپ کروالو۔

''ٹھیک کہتے ہیں وہ۔ آپ چلے جائیں۔''

''ہاں ...... تیمور بھائی کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرا دل نہیں چاہ رہا۔ میں لاہور پہنچ ڈاکٹر سے مشورہ کروں گا پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔''

اُس روز تم نے بتایا تھا کہ توقیر بھائی جان سب سے بڑے ہیں، پھر جاذب بھائی ہیں۔ جاذب بھائی سے چھوٹی آپو ہیں۔ پھر تیمور بھائی۔ ان سے چھوٹے تم اور تم سے چھوٹی دو بہنیں اور پھر سب سے چھوٹا تعبیر تھا۔

تم پانچ بھائی اور تین بہنیں تھے۔

ہم نے اپنی اپنی فیملی کا کبھی ایک دوسرے سے باقاعدہ تعارف نہیں کروایا تھا۔ یونہی باتوں باتوں میں کسی فرد کا ذکر آتا تو ہم اُس کے متعلق بات کر لیتے تھے۔ آج پہلی بار تم نے اپنی پوری فیملی کا ذکر کیا تھا۔

''پتہ ہے نایاب! توقیر بھائی کی شادی ان کی پسند سے ہوئی ہے، فیملی سے باہر۔ لیکن اس میں امی اور ابو کی مرضی شامل تھی۔ جاذب بھائی نے لو میرج کی تھی اور ہم میں سے کوئی بھی ان کی شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کہ یہ ابو کا حکم تھا۔

پھر تیمور بھائی کی شادی سراسر ابو اور امی کی پسند سے ہوئی۔ اگرچہ ان کی شادی بھی فیملی سے باہر ہوئی تھی مگر عجیب بات ہے نایاب! تینوں بھابیاں بہت حد تک ایک ہی جیسی سوچ رکھتی ہیں۔ آئی مین سسرالی رشتوں کے متعلق یہ ساری لڑکیاں سسرال والوں کے متعلق ایک سا کیوں سوچتی ہیں؟''

''پتہ نہیں ...... میں خود بھی اکثر سوچتی ہوں ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''بہت اچھی، بہت مخلص، بہت پیار کرنے والی لڑکیاں بھی بعض اوقات شادی کے بعد اس طرح بدل جاتی ہیں جیسے ملمع چڑھی انگوٹھیاں جن کا ملمع اُتر جائے تو وہ بدرنگ اور بدوضع لگنے لگتی ہیں۔''

''لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ...... بعض لڑکیوں کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ سارے سسرال والے اپنے اتنے پیارے بیٹوں کی بیویوں سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔ یعنی سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے مگر ایک بات ہے نوید شہریار! میرا مشاہدہ ہے کہ زیادہ تر اچھی، پیاری نیچر والی لڑکیوں کو برے سسرال والے ملتے ہیں اور اچھے سسرال والوں کو میرے مزاج کی لڑکیاں ملتی ہیں۔''

''اور اگر تیز مزاج والوں کو تیز مزاج مل جائیں تو پھر؟''

''پھر ٹھاں ٹھاں، ٹھوں ٹھوں...... صبح و شام۔''

''ہاں یار! سب ایک جیسی نہیں ہوتی ہیں۔ میری چھوٹی بھابھی یعنی تیمور بھائی کی وائف میں بہت ساری خوبیاں ہیں اور وہ باقی دونوں بھابیوں کے مقابلے میں بہت اچھی ہیں، بہت محبت کرنے والی۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی پتہ نہیں کیوں بعض باتوں میں وہ ان کے جیسی ہی لگنے لگتی ہیں۔''

''جہاں آدمی میں اتنی بہت ساری خوبیاں ہوں، وہاں ایک آدھ خامی نظر انداز بھی کی جا سکتی ہے۔''

''ہاں، یہ صحیح ہے۔ ہم سب ان سے پیار کرتے ہیں۔ بس کبھی کبھی تیمور بھائی جب ہمارے ساتھ بہت انوالو ہو جاتے ہیں تو وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ جاتی ہیں جو سینے میں ترازو ہو جاتی ہے۔''

''یہ سب نیچرل ہوتا ہے ...... عورت مرد کو کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ چاہے وہ اس کے ماں باپ، بہن بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ اب تک بہت محبتیں لُٹا چکا ہے۔ اب ان محبتوں پر سارا حق اُس کا ہے۔ بہت کم عورتیں

ایسی ہوتی ہیں شہریار! جو محبت کے اس درجے پر پہنچتی ہیں جہاں شوہر سے وابستہ ہر ہستی انہیں عزیز ہو جاتی ہے۔ پتہ ہے، ہماری بھابیاں تو یہ بھی برداشت نہیں کرتیں کہ بھائی ہم سے ہنس کر بات کرلیں۔ تینوں بھابیوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں۔ اس لحاظ سے تو آپ لکی ہیں۔''

اب میں تم سے کبھی کبھی اپنی ذات کے دُکھوں کے حوالے سے بھی بات کرنے لگی تھی۔ اس لئے نہیں کہ تمہیں اپنے زخم دکھا سکوں بلکہ اس لئے کہ تمہیں ڈھارس ہو کہ صرف تمہارے ساتھ کوئی انہونی نہیں ہوئی، دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔

''وہ بھائی جن کے ساتھ مل کر ہم نے پٹھو گرم کھیلا تھا۔

لڈو کی بازیاں جمائی تھیں۔

کارڈز اور کیرم کھیلتے ہوئے ہار کر شور شرابہ کیا تھا، وہ بھائی لمحوں میں کیسے پرائے ہو جاتے ہیں شہریار!

میں ایڈمٹ کرتی ہوں کہ محبتیں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن کاش محبتیں صرف تقسیم ہوتیں، ختم نہ ہوتیں۔''

میرا دکھ میری آواز میں گھلنے لگا تو لمحہ بھر کے توقف کے بعد میں ہنسی۔

''ارے یاد آیا...... آج بہت مزے کا لطیفہ پڑھا تھا میں نے۔ سنو، ایک بار ایک شخص ہوتا ہے نا وہ......''

اور تم نے ہنستے ہنستے یکدم کہا تھا۔

''مجھے حیرت ہوتی ہے دُری! کیسے کر لیتی ہو تم یہ؟''

یہ تو مجھے خود بھی پتہ نہیں تھا کیسے کر لیتی تھی میں یہ سب۔ شاید وہ جو مجھے دوسروں سے آنسو چھپانے کی عادت تھی اس لئے یا پھر مجھے تمہارا زیادہ خیال رہنے لگا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم ذرا سی دیر کے لئے بھی اُداس ہو جاؤ۔

تم بیمار تھے۔

تم نے محبتوں کے حوالے سے دُکھ اٹھائے تھے۔

تم سب سے خفا تھے۔

کیونکہ تم پر فیصلہ ٹھونسا گیا تھا۔ اگر تم خود فیصلہ کرتے تو شاید...... بلکہ یقیناً تمہارا فیصلہ بھی یہی ہوتا۔ یہ کیسے ممکن تھا شہریار! کہ تم آپو کے گھر کو جلنے دیتے۔

ناممکن...... تمہیں شاید اندر سے یہ دکھ تھا کہ تم سے کسی نے رائے نہیں لی، کسی نے

نہیں پوچھا اور فیصلہ کر دیا اور پھر کسی نے تمہیں ڈھارس نہیں دی۔

تسلی نہیں بندھائی۔

کسی نے یہ نہیں کہا کہ تم نے قربانی دی ہے۔

کسی نے اعتراف نہیں کیا کہ تم ان کے لئے دل ہارے ہو۔

شاید شہریار! کسی کو تمہاری محبتوں کی شدت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔

اس وقت اگر ابو جانتے ہوتے کہ تم اتنا چاہتے ہو اسے...... اتنی شدت سے...... تو شاید وہ پہلے تمہارا دل موم کرتے۔ شاید آہستہ آہستہ تمہیں رضامند کرتے۔ مگر پتہ نہیں کیوں، میرا دل کہتا ہے کہ انہیں ان شدتوں کا اندازہ نہیں تھا۔

اور شاید تمہیں خود بھی پتہ نہیں تھا کہ تم اتنی شدت سے اسے چاہتے تھے۔

تم نے بتایا تھا نا شہریار! کہ اس کے فوراً بعد ہی ابو بیمار ہو گئے تھے اور پھر اچانک تم سب کو چھوڑ گئے تھے۔

اور ابو کے بعد توقیر بھائی، جاذب بھائی اور دکھ تو یہ تھا کہ اس میں تیمور بھائی بھی شامل ہو گئے تھے۔

سب نے اپنے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا تھا اور بابا کے اکاؤنٹ میں موجود رقم بھی انہوں نے بانٹ لی تھی۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ہمارا کیا ہو گا۔ میں، تعبیر، عافیہ، نازیہ، امی۔ میرے بھائی کبھی بھی اتنے لالچی نہیں تھے نایاب! پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا انہیں۔

شاید ان کی بیویوں نے ان سے کہا ہو کہ وہ اپنا حصہ لے لیں ورنہ دوسرے ہڑپ کر لیں گے۔''

''ہاں شہریار! کبھی کبھی میں بھی سوچا کرتی ہوں کہ میرے سمندر دل بھائیوں کی بیویوں کے دل اتنے تنگ کیوں ہیں؟''

''اور تیمور بھائی تو بالکل بھی ایسے نہیں تھے۔ شاید ان دنوں وہ جاب لیس تھے اس لئے یا پھر اس لئے کہ انہوں نے سوچا ہو یہ ان کا حق ہے۔ بعد میں تیمور بھائی نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔

عافیہ کی شادی میں۔

میری جاب کے سلسلے میں۔

جب تک مجھے جاب نہیں ملی نایاب! انہوں نے گھر کا خرچ بھی اٹھایا اور اب بھی ...... اب بھی میں تمہیں بتاؤں، توقیر بھائی سے انہوں نے ہی کہا ہو گا۔ وہ خود مجھ سے

کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ ایک بار باہر جا کر چیک اپ کروا لو، تسلی ہو جائے گی۔ مگر میں سوچتا ہوں ابھی نازی کی شادی کرنا ہے۔ تعبیر کی ایجوکیشن ہے ...... ڈاکٹر بننا اس کا خواب ہے۔ اور میں چاہتا ہوں اس کا خواب ضرور پورا ہو۔"

"نہیں ......آپ کو ضرور جانا چاہئے اور آپ ضرور جائیں گے۔ تیمور بھائی بالکل صحیح کہتے ہیں۔"

اور پتہ ہے شہریار! جب اچانک تم پر اپنی ذمے داریاں آ پڑیں نا اور تم خود کو اکیلا سمجھنے لگے۔

جاذب بھائی اور توقیر بھائی کی سرد مہری۔

معاشی پرابلم۔

ابو کی کمی۔

ان سب نے مل کر تمہارے اندر شدتیں پیدا کر دیں۔ تم جب بھی تنہا ہوتے ہو گے اسے سوچتے ہو گے اور ان نو سالوں میں تم نے اس سے جتنی محبت کی، گزرے دو سالوں میں نہیں کی ہو گی۔ پتہ ہے شہریار! اگر ابو زندہ رہتے اور ایک دو سال بعد تمہاری شادی ہو جاتی تو تم اب تک ایڈجسٹ ہو چکے ہوتے اور تمہارے دو چار بچے ہوتے ٹیں ٹیں کرتے ہوئے۔

مگر ایسا نہیں ہوا اور ان نو سالوں میں تم نے اسے بہت سوچا اور ہر گزرتا دن اُس کی محبت کو تمہارے اندر گہرا کرتا گیا۔

"آپ نے کبھی اس سے، اپنی خالہ زاد سے بات کی؟ کبھی کوشش کی کہ اُسے اپنے رنگ میں رنگ لیں؟"

"نہیں ...... شروع میں کبھی کبھی بات کر لیتا تھا۔ پھر بہت عرصہ ہو گیا۔ اب کبھی بات نہیں ہوئی۔"

"دراصل شہریار! آپ نے کبھی چاہا ہی نہیں۔ ورنہ کم از کم آپ کو اس سے یہ گلہ نہ ہوتا کہ وہ ایجوکیٹڈ نہیں ہے۔ ابھی نو سال پہلے وہ میٹرک پاس تھی تو اب تک ماسٹرز کر چکی ہوتی اگر آپ نے چاہا ہوتا۔"

"پلیز نایاب! کوئی اور بات کرو۔"

"جی نہیں، میں یہی بات کروں گی۔ بتائیں نا مجھے، آپ کی ان سے باقاعدہ منگنی ہو چکی ہے؟"

"نہیں، بات ہوئی تھی صرف۔"

"اور گھر میں کبھی شادی کی بات ہوئی ہے؟"

"ہوتی رہتی ہے۔"

"فیملی میں اور بھی تو لڑکے ہوں گے۔"

"ہاں۔"

"تو پھر آپ انہیں صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے؟"

"پتہ ہے انہیں سب۔"

"یہ زیادتی ہے بھئی اس لڑکی کے ساتھ۔ خواہ مخواہ آپ نے ......"

"کیا جواز دوں؟ وہ خوبصورت ہے، اچھی نیچر کی ہے اور جو لڑکی جواز ہو سکتی تھی، وہ تین بچوں کی ماں بن چکی ہے۔"

"عجیب ہیں آپ بھی۔ کیا ان نو سالوں میں کوئی اور بھی آپ کو اچھا نہیں لگا؟ کوئی لڑکی؟"

"ہے ایک لڑکی جو بہت اچھی ہے ...... بہت اپنی اپنی سی۔"

"تو پھر آپ اُس لڑکی سے شادی کر لیں اور اپنی خالہ زاد کی کسی اچھی جگہ شادی کروا دیں۔"

تم لمحہ بھر کو چپ چاپ سے ہو گئے تھے شہریار!

"تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو۔ ورنہ ماں باپ جہاں چاہتے ہیں شادی کر لو۔"

میں نے تمہیں چھیڑا۔ تم ہنسنے لگے تھے۔

پھر کئی دن تک تم بہت مصروف رہے۔ آفس سے اٹھ کر تم گھر کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ تم ہوٹل کے کھانے کھا کھا کر تنگ آ گئے تھے۔

"میں چاہتا ہوں ایک بیڈ روم والا فلیٹ مل جائے تو کوئی ملازم رکھ لوں۔ بلکہ ملازم تو پہلے سے ہی ہے، جب بھی لاہور جاتا ہوں ماں جی کہتی ہیں لے جاؤ اسے ساتھ۔"

"یعنی انٹینا لگ چکا ہے۔ بس ٹی وی آنا ہے۔"

"ہاں......" تم بے اختیار ہنس دیئے۔

جانے تمہارے ذہن میں کیا بات آئی تھی مگر تم نے میرے اصرار پر بھی مجھے نہیں بتایا۔ پھر تم ویک اینڈ پر گھر چلے گئے اور جب واپس آئے تو تم نے مجھے بتایا کہ وہاں

جا کر تمہاری طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ تم پورے دو گھنٹے بے ہوش رہے تھے۔
کراچی سے تیمور بھائی بھی آ گئے تھے۔

''اور اب شاید ایک ماہ تک میں امریکہ چلا جاؤں۔ تیمور بھائی میرا پاسپورٹ لے گئے ہیں۔ انہوں نے ویزے کے لئے اپلائی کر دیا ہے۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔''

''کچھ نہیں ...... بس ایک والو بند ہے شاید۔ کبھی کام کرنے لگتا ہے، کبھی نہیں کرتا۔ یہاں کے ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ مجھے آپریشن کروانا چاہئے۔ میں ابھی آپریشن نہیں کروانا چاہتا تھا مگر تیمور بھائی بہت مجبور کر رہے ہیں۔''

''وہ صحیح کہتے ہیں ...... خواہ مخواہ بیماری بڑھانے کا فائدہ؟''

''بیماری تو کب کی بڑھ چکی ہے نایاب!''

''جھوٹ ...... بالکل غلط ...... یہ سب آپ کا وہم ہے۔''

''ہاں ......شاید وہم ہی ہو۔''

''اچھا سنیں، ایک مشورہ۔ بالکل مفت۔''

''جی ارشاد۔''

''آپ شادی کر کے جائیں۔''

''کیوں......؟''

''بس، میں کہہ رہی ہوں نا اس لئے۔ آپ کے گھر والے نہیں کہتے۔ اتنی آپ کی ایج ہوگئی ہے پھر اب تو آپ کو ضرور کرنی چاہئے۔''

''پاگل ہو تم ...... اور جو تم سوچ رہی ہو وہ میں سمجھ رہا ہوں لیکن میں بے حس نہیں ہوں کہ......''

میں لمحہ بھر کو چپ سی کر گئی۔

''تم سوچ رہی ہو کہ اگر میں مرحوم ہو گیا تو......''

''اچھا فضول باتیں مت کریں آپ۔ شکل اچھی نہ ہو تو بات اچھی کرنی چاہئے۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''قسم کھا کر بتاؤ، تمہارے ذہن میں یہی بات تھی نا کہ......''

''مجھے کچھ نہیں سننا۔'' میں نے تمہیں ٹوک دیا۔

''ویسے تو بڑی حقیقت پسند بنتی ہو۔ بڑی فلسفیانہ باتیں کرتی ہو۔ حقیقت کی ننگی

پتا نہیں ......خوابوں کے جزیرے۔''

''کوئی نہیں ...... کوئی ایسی بات نہیں کرتی۔''

''پتہ ہے نایاب!'' تم ایک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

''ممکن ہے میں اب ...... اب جبکہ میں معاشی طور پر مطمئن ہوں، عافی کی شادی ہو چکی ہے، نازی کا نکاح ہو چکا ہے ...... رخصتی کے لئے بس تیاری مکمل ہے، کوئی بڑی ذمے داری اب مجھ پر نہیں ہے تو شاید میں شادی کر لیتا کہ اس لڑکی کا کیا قصور جو میرے نام پر بیٹھی ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں نے ذہنی طور پر اسے تسلیم کر لیا ہے بلکہ اس لئے کہ شادی ایک معاشرتی ضرورت بھی ہے اور آدمی کی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں مگر اب نہیں۔''

''کیوں ...... بیماری کی وجہ سے؟''

''ایک وجہ یہ بھی ہے۔ جب تک ڈاکٹر مجھے اطمینان نہیں دلاتے، میں کسی لڑکی کو چند دن کی خوشی دے کر ہمیشہ کا عذاب نہیں دینا چاہتا۔ لیکن ایک اور وجہ بھی ہے۔''

''کیا......؟''

تم لمحہ بھر چپ سے ہو گئے۔

''ڈری! میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک لڑکی ہے جو مجھے اچھی لگی ہے۔ اس سے ملنے کے بعد اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر میں اچھا ہو گیا تو میں اس سے شادی کروں گا۔''

''اور وہ لڑکی ...... کیا وہ بھی آپ سے محبت کرتی ہے؟ آئی مین پسند کرتی ہے؟''

''پتہ نہیں ...... میں نے اس سے کبھی نہیں پوچھا اور نہ ہی کبھی میں نے اسے بتایا ہے کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں اور اُسے سوچتا ہوں۔''

''اوہو بھئی، کیا 1858ء والی افسانوی محبت ہے ...... یعنی لڑکی کو معلوم ہی نہیں اور موصوف اس سے شادی کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔''

''میں امریکہ سے واپس آ کر اسے بتاؤں گا۔''

''اور تب تک اس کی شادی ہو گئی تو؟''

مجھے اچھی خاصی تشویش ہو گئی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم پھر کسی ایسے صدمے سے دوچار ہو جس سے ایک بار پہلے ہو چکے ہو۔ ابھی تمہارے دل سے پرانے نقش نہیں مٹے تھے، ابھی کسک موجود تھی۔ تم اس لڑکی ...... جس کا نام تم نے مجھے نہیں بتایا تھا، ذکر

کرتے ہوئے افسردہ ہو جاتے تھے اور یہ لڑکی جو اب تمہاری زندگی میں داخل ہوئی
اور بقول تمہارے جس نے نہ جانے کیوں تمہیں اٹریکٹ کیا تھا، یقیناً اس میں کوئی ا
خوبی ضرور ہوگی کہ کسی دن یہ کسک بھی ختم ہو جائے۔

"لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ تمہاری شادی تمہاری خالہ زاد کی بجائے اس سے
جائے؟"

"ہاں ...... ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

تم نے کہا تھا نا شہریار، تمہیں یاد ہے۔

اور تب کئی بار میں نے تمہیں مجبور کیا کہ تم اس لڑکی کو اپنی محبت کے متعلق بتا دو۔

"آخر تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟"

"اس لئے کہ میں نہیں چاہتی کہ تم واپس آؤ تو اس پرانے بام پر وہ صورت زیبا نہ
ہو۔"

"اُسے معلوم ہوگا تو وہ تمہارا انتظار کر سکتی ہے۔"

"تمہیں یقین ہے میں واپس آؤں گا؟"

"ہاں، یقین ہے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ وہ خفا نہ ہو جائے۔ وہ جانتی ہے کہ میں مہرین سے محبت کرتا تھا
کرتا ہوں۔"

تو اُس کا نام مہرین تھا۔ کتنا خوبصورت نام ہے۔ یقیناً وہ اپنے نام کی طرح ہی
خوبصورت بھی ہوگی۔ میں نے سوچا۔

تم نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا۔ ورنہ تم نے میرے پوچھنے پر بھی نہیں بتایا تھا۔

"یہ کوئی کُلیہ تو نہیں ہے نا کہ آدمی پہلی محبت کے بعد پھر کبھی محبت کر ہی نہ سکے۔
کتابوں میں لکھا ہے کہ آدمی کے دل میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک کے بعد دوسری،
دوسری کے بعد تیسری محبت کی گنجائش۔"

"میں اُسے خفا نہیں کرنا چاہتا۔"

"مجھے بتا دیں ...... کون ہے وہ ...... میں بتا دوں گی اُسے۔ خفا نہیں ہونے دوں
گی۔"

"پرامس کہ تم اُسے خفا نہیں ہونے دو گی؟"

"ہاں ...... پرامس۔"

"وہ لڑکی تم ہو نایاب!"

"نہیں......" میں یک دم حیران رہ گئی تھی۔ "آپ نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں۔ صحیح
طرح سے جانتے تک نہیں۔ مذاق کر رہے ہیں۔"

"نہیں۔" تم سنجیدہ تھے۔ "اور دیکھا تو میں نے تمہیں لیا ہے اس شہر میں آتے ہی۔"

"صحیح طرح سے تو نہیں دیکھا تھا نا۔"

"دیکھا ہے...... کیا تم خفا ہوگئی ہو؟"

"نہیں ہنسی آرہی ہے۔ بائی داوے، یہ انکشاف کب ہوا آپ پر؟"

"بہت دن ہوگئے...... ایک کانٹا سا چبھا ہے۔"

"نکال دیں۔"

"نہیں نکلتا۔"

"اچھا خیر چلیں، ایک لطیفہ سنیں۔"

"نہیں سننا...... تمہیں بہت شوق تھا جاننے کا۔ اب جان لیا ہے تو بھاگتی کیوں ہو؟"

"بھاگ کہاں رہی ہوں؟ بے فکر رہو۔ ایک روز یہ کانٹا نکل جائے گا تو افاقہ ہو
جائے گا۔ ہاں تو لطیفہ......"

"کیا ہوتا ہے یہ لطیفہ۔ نہیں سننا مجھے۔"

"لطیفہ، لطیف کی بہن کو کہتے ہیں اور ایک دفعہ......"

تم بے اختیار ہنسنے لگے تھے اور حسبِ منشا میں نے موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ اب تم
مجھے لطیفہ سنا رہے تھے۔ اور ہم دونوں بے اختیار ہنس رہے تھے۔

میرا خیال تھا شہریار! کہ چونکہ میں نے تمہاری تنہائی کو شیئر کیا تھا، تم نے اپنے دل کا
بوجھ میرے سامنے ہلکا کیا تھا شاید اس لئے۔

یا پھر ہم دونوں کا ہم ذوق ہونا۔ ذہنی ہم آہنگی۔

تم اپنی خالہ زاد سے بیزار تھے، گھر والوں سے دل میں خفا تھے۔ ایسے میں مجھ سے
اتفاقیہ ٹکراؤ سے تم وقتی طور پر میری طرف جھک گئے ہو اور بس ...... میں چاہتی تھی کہ تم
مجھے ملو۔ مجھے اچھی طرح دیکھ لو تا کہ تمہارے دل سے یہ خلش نکل جائے۔

خواہ مخواہ کا ایک اور روگ۔

"میں ایک عام سی، معمولی سی شکل و صورت کی لڑکی ہوں۔ کالی۔" میں نے تمہیں
بتایا۔ "اور میری عمر بھی کافی زیادہ ہے۔"

''اور میں تو جیسے بچہ ہوں نا۔ تم سے چند سال بڑا ہی ہوں گا۔''
''آپ کی ڈیٹ آف برتھ کیا ہے؟''
اور جب تم نے بتایا تو میں نے کہا۔
''جناب! اس لحاظ سے میں آپ سے تین ماہ تین دن بڑی ہوں۔''
''ارے دو تین ماہ کی بڑائی چھوٹائی کچھ نہیں ہوتی۔''
''دراصل تم اپنے جذبے کو سمجھ نہیں رہے ہو۔''
''مجھ پر سب کلیئر ہے۔ اپنے سارے جذبوں کو سمجھتا ہوں۔ لیکن تم کلیئر نہیں ہو خود پر ...... تم میرے لئے سوچتی ہو، میرے لئے پریشان ہوتی ہو۔ فکر کرتی ہو میری۔ یہ کیا جذبہ ہے؟''
''پتہ نہیں ...... دوست جو ہو تم۔''
میں واقعی خود پر کلیئر نہیں تھی۔ لیکن شہریار، میں تمہارے لئے مخلص ضرور تھی۔ ایک سچے دوست کی طرح۔ اور میں نے سوچا تھا کہ مجھے کم از کم تم سے ایک بار ضرور ملنا چاہئے تا کہ تم اس کنفیوژن سے نکل آؤ۔ اور میں ابھی کوئی راستہ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ تم نے بتایا کہ تمہاری رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے۔
کل شام اچانک ہی تمہارے انکل ہاشمی مل گئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک دوسرے بابا صاحب بھی تھے۔ اتفاق سے وہ ابو کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ ان کے دوست بھی تھے۔
''بہت محبت سے ملے۔ بہت دیر تک ابو کی باتیں کرتے رہے اور مجھے اپنی انیکسی میں رہنے کی آفر کر دی۔ بے چارے ڈاکٹر ہاشمی بور ہو رہے تھے۔ میں بھی جان بوجھ کر باتیں کرتا رہا۔ بڑے نائس آدمی ہیں۔ بہت اچھے لگے مجھے۔ آج جاؤں گا آفس سے اٹھ کر۔ وہ کہہ رہے تھے میں آج کل گھر پر ہوں اس لئے ان کی موجودگی میں ہی آ جاؤں تو بہتر ہے۔''
میں ذرا سا چونکی۔ کل بابا بھی ڈاکٹر ہاشمی کی طرف گئے تھے اور ہماری انیکسی بھی خالی پڑی تھی۔
''کیا نام تھا اُن کا؟''
''نام ...... ہوں، نام تو پوچھا ہی نہیں۔ ڈاکٹر ہاشمی انہیں پروفیسر صاحب کہہ کر بلا رہے تھے۔''
''وہ میرے بابا تھے۔''

''ریئلی ......؟'' تم اچھل پڑے تھے شہریار!
''اب تم اس اتفاق کو کیا کہو گی؟ مان لو کہ یہ سب اتفاقات یوں ہی نہیں ہو رہے ہیں۔ قدرت ہمیں ایک دوسرے کے قریب لا رہی ہے۔''
اور اسی شام تم ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور بابا تم سے میرا تعارف کروا رہے تھے۔
''یہ میری بیٹی ہے دُرِ نایاب۔ بہت کم گو اور خاموش طبع سی ہے۔''
تم ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا دیئے۔
بابا کو کیا پتہ کہ ان کی یہ کم گو بیٹی تم سے کتنی ڈھیروں باتیں کرتی ہے۔ اتنی کہ تم سن سن کر تھک جاتے ہو۔ عین اسی وقت بابا کا ایک ضروری فون آ گیا تو وہ تم سے معذرت کر کے چلے گئے۔ میں ابھی تک کھڑی تھی۔ جھک کر نیچے دیکھنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں اور سوالیہ نظروں سے تمہیں دیکھا۔
''کانٹا گر گیا ہے؟''
''اوہ!''
تم فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ کارپٹ پر اور اِدھر اُدھر صوفے کے نیچے دیکھنے لگے۔
میں نے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا۔
تم نے میرے سوال کو سمجھا نہیں تھا بلکہ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں نے کان میں کچھ پہن رکھا تھا جو نیچے گر گیا ہے۔
تم بڑے انہماک سے جھک کر تلاش کر رہے تھے۔
''یہاں تو نہیں ہے۔'' تم نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ''ہونا تو یہیں چاہئے تھا۔''
''یہیں گرا تھا، آپ کو یقین ہے؟''
''اوہ!'' تم جھینپ سے گئے۔ تم نے اب بات سمجھی تھی۔ ''شرارتی ......'' واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے تم مسکرائے۔
''جھاڑ کا کانٹا ہے۔ گہرائی میں پھنس گیا ہے۔ نکلنے یا گرنے کا امکان نہیں ہے۔''
''اچھا۔''
میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا لیکن تم مجھے ذرا بھی اجنبی نہیں لگے تھے۔
یوں جیسے پہلی بار تمہیں دیکھا ہو۔ تم دلچسپی اور شوق سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی تمہیں دیکھا۔ دل میں اندر کہیں ہلچل سی ہوئی۔

تمہیں یاد ہے شہریار! میں نے اُس روز سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا اور وہ مارچ کی 29 تاریخ تھی۔ تم نے بھی سیاہ ڈنر سوٹ پہن رکھا تھا اور بہت ینگ لگ رہے تھے۔ میں نے تمہیں کہہ بھی دیا تھا۔

''یو آر لکنگ سو ینگ!''

''میں تمہارا ہم عمر ہوں...... اتنا ینگ نہیں ہوں۔''

تب ہی بابا آ گئے تھے اور پھر بابا کے اصرار پر تم اسی روز انیکسی میں اٹھ آئے تھے۔

بعد میں کئی بار ہم اس کانٹا ڈھونڈنے والی بات پر ہنسے تھے شہریار!

''بہت شرارتی ہو تم۔ شروع شروع میں تو بڑی سنجیدہ لگتی تھیں۔'' تم اکثر کہتے تھے۔

''صحبت کا اثر ہے...... جمالِ ہم نشیں بر من اثر کرد۔''

بابا ایک ہفتے کی چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ وہ جتنے دن رہے انہوں نے تمہیں کھانا باہر نہیں کھانے دیا۔

''کوئی خاص چیز کھانا چاہو تو زرینہ بی بی سے کہہ دینا۔ بہت اچھی کک ہے۔''

''نہیں انکل، مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے۔''

''یار! تمہارے والد تو اچھے کھانوں کے شائق تھے۔ بٹیر، تیتر وغیرہ بہت شوق سے کھاتے تھے۔''

بابا چلے گئے تھے لیکن تمہارے لئے حکم تھا کہ ہر ویک اینڈ پر جب بابا آئیں گے تو تم کھانا اِدھر ہی کھاؤ گے۔ تمہارا ملازم بھی آ گیا تھا۔

تم شام کو اکثر آ جاتے اور پھر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے ہم ڈھیروں باتیں کرتے تھے۔

کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جس پر ہم نے بات نہ کی ہو۔

شاعری...... ادب...... سیاست......

راجہ انور کی ''جھوٹے روپ کے درشن'' سے لے کر ''زندہ بھٹو مردہ بھٹو'' تک کتابیں زیر بحث آئیں۔

غزلیں، نظمیں سنائی جاتیں۔

تمہیں بھی میری طرح بے شمار غزلیں اور نظمیں یاد تھیں۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا شہریار...... زرینہ بی بی رات کے کھانے کا بتانے آتیں تو پتہ چلتا کہ اتنا وقت گزر گیا ہے۔

انہی دنوں ہم پر یہ انکشاف ہونا شروع ہوا شہریار! کہ ہماری بہت سی باتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ حالانکہ لڑکی ہونے کے ناتے میرے اور تمہارے مزاج میں، پسند ناپسند میں کچھ فرق ہونا چاہئے تھا۔ شروع شروع میں ہم خوش ہوئے اور پھر چونکنے لگے تھے۔ اور اُس روز جب ہوئیسٹ والی بات ہوئی تھی تو میں دیر تک جاگ کر سوچتی رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے؟

''کیا قدرت نے ہمیں اسی لئے ملایا ہے شہریار؟''

میں اُس رات دیر تک جاگنے کے باوجود خود پر کلیئر نہیں ہوئی تھی۔ ساری بات یہ تھی کہ ہمارے مزاج کے رنگ مل گئے تھے جو وقتی طور پر اٹریکٹ کر رہے تھے۔ یاد ہے نا اس کے بعد یکے بعد دیگرے کتنی ایسی باتیں ہوئی تھیں جن سے ہم خوفزدہ ہو گئے تھے۔

اُس روز جب میں نے تمہیں ٹی وی لاؤنج والی پینٹنگ دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ میں نے خریدی تھی۔ اسے PASSAVIT کہتے ہیں۔ تصویر میں بہت شاندار سا گھوڑا پاؤں اوپر اٹھائے سیدھا کھڑا تھا۔

''پتہ ہے اسے خریدنے پر سب نے مذاق اُڑایا تھا۔ آپا اور بھیا نے تو بہت زیادہ۔ آپ کو پتہ ہے، مجھے گھوڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔ رائیڈنگ بھی پسند ہے۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے میرے پاس ایک گھوڑا ہو سفید رنگ کا یا بالکل سیاہ اور میں ٹخ ٹخ...... آہا......''

''اور اگر میں یہ کہوں کہ میں اور تیمور بھائی ایک بار سچ مچ گھوڑا خرید لائے تھے تو؟''

''تو کیا...... نقل کی پرانی عادت ہے آپ کو۔''

تم سوچ میں کھو سے گئے تو میں نے تمہارا دھیان بٹانے کے لئے پوچھا۔

''آج آفس سے آ کر کیا کرتے رہے آپ؟''

''اپنا ماؤزر صاف کر رہا تھا۔''

''ہائے...... ماؤزر ہے آپ کے پاس؟'' میں اشتیاق سے اچھل پڑی۔ ''چلیں نا دکھائیں مجھے...... میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ میرے پاس ماؤزر ہو...... بابا کے پاس دو گنیں ہیں۔ ایک شیفن گن کی امریکہ کی بنی ہوئی۔ بہت یونیک چیز ہے۔ اور ایک وہ تڑتڑ، آٹو میٹک، کیا نام ہے بھئی......''

''ذری......!'' تم ایک دم سے پریشان ہو گئے تھے اور جھلا رہے تھے۔ ''یہ سب کیا ہے...... تم لڑکی ہو۔ کیوں پسند کرتی ہو ایسی چیزیں؟''

''ایسی چیزیں پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے ...... کیا میں لڑکا بن جاؤں گی؟ لڑکی ہی ہوں۔''

''اچھا مجھے کیا پتہ، لڑکے ہی ہو۔''

''جی نہیں، لڑکی ہوں۔ اتنے لمبے لمبے بال نظر نہیں آ رہے؟''

''وہ تو لڑکوں کے بھی ہوتے ہیں۔ کہو تو چیک کر لوں ...... قریب آ کر دیکھ لوں؟''

تمہاری آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''جی نہیں ...... دور سے ہی پتہ چل رہا ہے۔''

تم ہنسنے لگے تھے۔ پھر زرینہ بی چائے لے آئیں اور ہم کسی اور موضوع پر بات کرنے لگے لیکن تم اس بات کو بھولے نہیں۔

اُس روز ریڈیو پر پرانے گانے لگے ہوئے تھے۔

''یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے۔''

''ہمارے گھر یہ ریکارڈ ہے ...... بابا کو بہت شوق تھا۔ ہمارے گھر تین ڈبے بھرے ہوئے ہیں ریکارڈز سے ...... اختر بائی کلکتے والی اور ...... پتہ ہے، ہمارے گھر دو گراموفون ہیں۔ ایک بڑا والا ...... وہ بھونپو والا جس پر ایک کتا بنا ہوتا ہے اور ایک چھوٹا سا۔''

''ہمارے گھر بھی ہے۔'' تم نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہمارے گھر بھی بے شمار ریکارڈز ہیں اور گراموفون بھی۔ اور بچپن میں وہ ریکارڈز سنتے تھے مزاحیہ سے، وہ والے 'دینہ بیمار ہے'، 'آج اتوار ہے' اور وہ والا بھی۔''

''آج اتوار ہے ...... اور وہ والا بھی ......''

''تہ ...... تت ...... تم ...... م ...... میری نقل کر رہے ہو۔'' تم نے میری بات مکمل کر دی۔

''ہاں بالکل یہی۔''

''عجیب بات۔'' تم خوف زدہ سی ہنسی ہنسے۔

''کیا ہے شہریار!'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں ...... مجھے ڈر لگنے لگا ہے ڈری، خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ یہ ہم دونوں کے درمیان سب کچھ اتنا کیوں مل رہا ہے؟ یہ ماؤزر کی پسندیدگی ...... یہ ہوئیسٹ۔ ڈری! شاید میں نہ رہوں۔ شاید بہت جلد ہم دونوں بچھڑ جائیں۔ شاید قدرت مجھے یہ دکھا رہی ہے ڈری! کہ ایسا بھی ہوتا ہے ...... اس طرح بھی۔''

''کچھ نہیں ہو گا آپ کو۔ وہم نہ کیا کریں۔ اور یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ بہت سارے لوگوں کی پسند ناپسند ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ بتاتے نہیں اور ہم بتا دیتے ہیں۔''

''یہ وہم نہیں ہے ڈری! اس کے اندر کہیں کوئی سنگین حقیقت ہے۔ میں جو نو سال تک مہرین کی یادوں کو سینے سے لگائے خدا سے بھی خفا رہا، اس کی رضا پر راضی نہ ہوا تو اب خدا نے مجھے تم سے ملایا ہے، یہ بتانے کے لئے کہ دیکھو مہرین کے علاوہ بھی کوئی ہے جو تمہارے مزاج کے زیادہ قریب ہے، اُس سے بھی زیادہ ...... اور پھر ...... پھر تمہیں مجھ سے ملا کر......''

تم نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا شہریار! پہلے یونہی باتوں باتوں میں کوئی بات ہو جاتی تھی لیکن اب ہم جان بوجھ کر ایک دوسرے کو اپنی پسند ناپسند بتانے لگے تھے۔ شاید اس امید پر کہ کوئی کہہ دے کہ نہیں مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ کوئی اختلاف کرے۔

میں نے تمہیں بتایا، مجھے پلاؤ پسند نہیں ہے۔ بوائل چاول پسند ہیں ...... تم نے کہا، مجھے بھی۔

تم نے کہا مجھے سلاد پسند ہے۔ خاص طور پر کھیرا۔ اور مجھے بھی کھیرا پسند تھا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا مجھے بانسری بجانے کا بہت شوق تھا اور ایک زمانے میں سیکھنا بھی شروع کیا تھا۔ مگر پھر بھیا نے منع کر دیا۔ انہیں وہ صاحب پسند نہیں تھے جن سے میں بانسری بجانا سیکھ رہی تھی۔

اور تم نے مجھے بتایا کہ تم بھی بہت اچھی بانسری بجاتے ہو۔

ظہیر عباس میرے پسندیدہ کرکٹر تھے۔ لوگ زیادہ تر عمران خان کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے ظہیر عباس پسند تھے۔ عمران خان میرے فیورٹ کرکٹر اب بنے ہیں، کینسر ہسپتال بنانے کے بعد۔ اور تمہارا بھی یہی خیال تھا۔

مجھے ہاکی پسند تھی۔ شروع میں ہاکی میرا فیورٹ کھیل تھا۔ کرکٹ بعد میں فیورٹ ہوا، ون ڈے میچز کی وجہ سے ...... اور تم بھی پہلے ہاکی کے کھلاڑی تھے اور اگر تمہارے ابو کی اس طرح اچانک ڈیتھ نہ ہو جاتی تو تم آج قومی ہاکی ٹیم میں ہوتے۔

''پتہ ہے ڈری! میں قومی ہاکی ٹیم کے لئے سلیکٹ بھی ہو گیا تھا لیکن ان دنوں ابو بہت بیمار تھے۔ میں کیمپ میں نہ جا سکا۔''

تم کرکٹ کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ اور پتہ ہے، میں بھی پلیئر تھی۔

"اتھلیٹ بھی تھی سکول اور کالج لائف میں۔ اور یہ جو ڈھیروں کپ اور ٹرافیاں پڑی ہیں نا، یہ سب میں نے جیتی ہیں۔"

"اور کبھی میرے گھر آؤ نا تم تو ایسی بے شمار ٹرافیاں اور کپ وہاں بھی سجے ہیں۔" تم نے بتایا تھا۔

کہیں کوئی اختلاف کا پہلو نہیں مل رہا تھا شہریار! اور یہ سب بہت حیران کر دینے والا تھا اور بہت عجیب تھا۔

اب تو میں بھی خوف زدہ ہو گئی تھی شہریار! شاید تم صحیح کہتے تھے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک نے نہیں رہنا تھا۔ اب تو ہم کترانے لگے تھے ایسی کوئی بات کرنے سے۔ اپنی ذات کے متعلق بات کرتے کرتے ڈر جاتے۔ بات ادھوری چھوڑ دیتے۔

اُس روز زرینہ بی نے میرے سفید تولیے رنگ دار پانی میں ڈال دیئے تھے اور ان پر ہلکا رنگ چڑھ گیا تھا اور میں الجھ رہی تھی کہ تم آ گئے۔

"کیا ہو رہا ہے......؟"

"کچھ نہیں ...... میں ہمیشہ سفید تولیے استعمال کرتی ہوں، مجھے کلرڈ تولیے بالکل پسند نہیں ہیں۔ اور زرینہ بی نے رنگ چڑھا دیا ہے ان پر۔ اب نئے لانے پڑیں گے۔"

"اور میں ...... مجھے تو بلیک پسند ہیں۔ بلیک استعمال کرتا ہوں۔" تم نے جھلا کر کہا اور وہیں کچن کے باہر پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"چلو اچھا ہے، کہیں تو ہماری پسند ٹکرائی۔"

"جی! کبھی دیکھے ہیں تم نے بلیک ٹاول؟"

"ہاں، دیکھے ہیں۔ پچھلے سال کیتھی بھابھی اور بھائی جان یہاں آئے تھے تو ان کے پاس بلیک ٹاول تھا۔"

"میں ...... میں بھی ہمیشہ وائٹ ...... بالکل وائٹ ٹاول یوز کرتا ہوں ...... پاگل کر دو گی تم مجھے ڈری!"

اور اُس روز تو میں بھی سچ مچ خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"سنو ...... آج مجھے راستے میں لطیف کی بہن ملی تھی۔ بہت ناراض ہو رہی تھی۔ بہت دنوں سے تم نے اسے بلایا نہیں۔ بلاؤ بھئی، اُداس ہو گیا ہوں اس کے بغیر۔"

"اچھا بلاتی ہوں۔ ایک بچہ ہوتا ہے نا تو سوتے میں اُس کے اوپر سے چوہا گزر جاتا ہے۔ صبح اٹھ کر وہ رو رہا ہوتا ہے تو اس کے ڈیڈی کہتے ہیں کہ کیوں رو رہے ہو؟

وہ کہتا ہے کہ رات سو رہا تھا تو میرے اوپر سے چوہا گزر گیا۔

"تو بھئی اس میں رونے کی کیا بات ہے، چوہا ہی تو تھا نا، کوئی ہاتھی تو نہیں تھا۔"

"یہی تو رونا ہے ...... آج چوہا گزرا ہے تو کل ہاتھی گزرے گا۔ گزرگاہ تو بن گئی ہے نا۔"

"واقعی ...... گزرگاہ تو بن گئی ہے۔" تم معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور تمہیں یاد ہے نا شہریار! بعد میں تم نے کتنی بار اس چوہے، ہاتھی اور گزرگاہ والی بات سے انجوائے کیا تھا۔ ایک دوسرے کو تنگ کیا تھا۔ لطیف کی بہن کی طرح یہ بھی ہماری گفتگو میں ایک علامت بن گئی تھی۔ اُس روز تم نے بتایا تھا کہ تمہارے کاغذات مکمل ہو گئے ہیں۔ تیمور بھائی نے تمہیں فون پر اطلاع دی ہے اور شاید تم پندرہ بیس دن تک چلے جاؤ۔

تمہیں ملتان جاذب بھائی سے ملنا تھا اور پھر وہاں سے ہی سیدھا کراچی فلائی کر جانا تھا۔ جانے سے پہلے ہفتہ بھر تم کراچی رہنا چاہتے تھے، تیمور بھائی کے پاس۔ ان کی خواہش تھی کہ تم ان کے پاس رہو۔

تم ان دنوں بہت اُداس، بہت پریشان رہتے تھے اور میں تمہیں خوش رکھنے کے کتنے جتن کرتی تھی۔ مجھے لطیفوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن اب میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لطیفے پڑھتی، تمہیں سناتی۔ تمہاری سنجیدہ باتوں کو بھی ہنسی میں اُڑا دیتی اور تمہارے لئے ...... تمہاری زندگی کے لئے خدا سے دعائیں کرتی۔ یہ کون سا جذبہ تھا شہریار! یہ کیا تھا، مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ تم ایک دم مجھے بہت عزیز ہو گئے تھے۔ تمہاری بیماری اور تمہارے جانے کے تصور سے میرا دل کٹنے لگتا تھا۔ تمہارے سامنے میں ہنستی رہتی تھی لیکن جب میں اپنے کمرے میں اکیلی ہوتی تو خوب روتی۔

"مجھے موت کا کوئی خوف نہیں ہے ڈری! بس یہ پریشانی ہے کہ مجھے کچھ ہو گیا تو تم مجھے بہت مِس کرو گی۔ میں نے اپنی محبتوں کا اعتراف کر کے شاید انجانے میں تم سے زیادتی کر دی ہے۔ تم بھلے اعتراف کرو یا نہ کرو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگی ہو۔ مگر تم نے ہی کہا تھا کہ اس لڑکی کو تو بتا دوں۔ آئی لو یو ڈری! آئی لو یو!"

"اور میں ...... میں بھی۔" میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"اچھا حوصلہ کرو جان! ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کچھ نہیں ہو گا۔ تم دعا کرنا۔"

لیکن میں تمہارا ہاتھ تھامے روتی رہی۔
''اتنی مضبوطی سے ہاتھ کیوں پکڑا ہے؟ اس طرح موت سے بچا لو گی مجھے......؟''
''شہریار...... پلیز شہریار!'' میں نے تمہارا ہاتھ چھوڑ دیا۔
''دیکھو، بس کرو اب دُری! مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ مت روؤ۔''
اور میں نے تمہاری خاطر آنسو پونچھ لئے۔
''دیکھو گزرگاہ بن گئی تھی نا۔ آج ہاتھی گزر گیا۔'' تم نے مجھے چھیڑا۔
''ہوں۔''
یہ کیا ہوا تھا شہریار...... یہ میں نے کیا کِیا تھا...... وہ کون سا لمحہ تھا شہریار جب تمہاری محبت کا کانٹا میرے دل میں چبھ گیا تھا اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔
تم ایک تقسیم شدہ شخص تھے۔
محبتوں میں بٹے ہوئے۔
مہرین کی محبت جسے مسلسل نو سال سے اپنا خونِ دل دے کر سینچ رہے تھے۔
اور وہ ایک لڑکی ...... جو تمہاری منگیتر تھی اور جس کا تم پر حق تھا...... لیکن تم حق کو تسلیم نہیں کر رہے تھے۔
لیکن مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔
بس میں اتنا جانتی تھی کہ تم شہریار ہو اور میں دُرِ نایاب ہوں...... اور تم سے محبت کرتی ہوں۔
اس سے پہلے کیا تھا اور بعد میں کیا ہوگا، یہ میں نے سوچا ہی نہیں۔
میں تو کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالنے والی لڑکی نہیں تھی۔ لیکن پھر میں نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے خود معلوم نہیں۔
شاید وہ جو کتابوں میں لکھا ہوتا ہے کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے، صحیح ہی ہوتا ہے۔ میں نے بھی تم سے محبت کی نہیں تھی، ہو گئی تھی۔ سب کچھ تو پتہ تھا مجھے پھر بھی میں نے تمہیں چاہا شہریار! تمام تر شدتوں کے ساتھ۔
شاید تم کبھی بھی ان شدتوں کا اندازہ نہ لگا سکو۔
محبت کے اس اعتراف نے ہمیں ایک دوسرے کے اور قریب کر دیا۔ ہماری گفتگو میں معنی خیز اور پُر لطف باتیں بھی ہوتیں۔ ہم ایک دوسرے کو ہنساتے بھی تھے، سنائے گئے لطیفوں کا سہارا لے کر۔ ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔

''یار! میں تمہیں ڈیزرو نہیں کرتا۔''
''مجبوری ہے...... اب جیسے بھی ہو، مینڈک ہو یا مینڈک کے بچے، سینے سے تو لگانا ہی پڑے گا۔'' میں ایک لطیفے کو دُہراتی تو تم ہنس پڑتے۔
''تمہاری یہ باتیں مجھے بہت یاد آئیں گی۔ یہ لطیف کی بہن...... چوہا اور ہاتھی...... مینڈک کی اولاد۔ ساؤنڈ ایفیکٹس زبردست ہوتے ہیں تمہارے۔''
''اچھا اب رُوں رُوں نہیں ہونی چاہئے۔''
''نہیں، رُوں رُوں نہیں ہوگی بلکہ......'' تم نے جیب سے ہوئیسٹ نکالی۔
''اچھا کِٹک کِٹک ہونے لگی ہے۔''
''ہاں......'' تم بے اختیار ہنس دیئے تھے۔
اُن دنوں ہم کتنا ہنستے تھے۔ خواہ مخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر...... شاید اپنے اندر کے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے...... کوئی ہماری گفتگو سنتا تو حیران رہ جاتا۔ شاید وہ ہمیں پاگل سمجھتا۔
اور ہم پاگل ہی تو تھے شہریار!
بہتے پانیوں پر مکان بناتے چلے گئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہتے پانیوں پر مکان نہیں بنائے جاتے۔
یہ عجیب تھیں محبتیں۔
تم ان دنوں خوابوں کی باتیں کرنے لگے تھے۔
''پتہ ہے دُری! جب ہماری شادی ہوگی نا......''
''ہماری نہیں، آپ کی۔''
''میری شادی تمہارے ساتھ ہی ہوگی نا۔ کسی اور سے نہیں۔''
تم سگریٹ بہت پیتے تھے شہریار! میں منع کرتی تو تم کہتے، چھوڑ دوں گا۔
''شادی کی پہلی رات سگریٹ چھوڑ دوں گا۔ اور پتہ ہے تم اس دن آف وائٹ کپڑے پہننا اور......''
''ٹھک، ٹھک...... ڈاکٹر صاحب ہیں؟''
''ہیں...... آ جاؤ۔''
تم ہنس پڑتے اور میں تمہیں خوابوں سے واپس لے آتی۔
یاد ہے نا شہریار! یہ ڈاکٹر صاحب والا لطیفہ تم نے ایک بار سنایا تھا اور تب سے ڈاکٹر

صاحب بھی اکثر و بیشتر ہماری گفتگو میں انٹرفیئر کرنے لگے تھے۔

''پتہ ہے، میں تمہارے ساتھ باہر جایا کروں گا خوب شاپنگ کریں گے۔''

''اور ...... مجھے سیاحت کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں بہت دل چاہتا تھا میرا کہ ساری دنیا گھوموں ...... پہلے پاکستان کا چپہ چپہ دیکھوں پھر...... تمہیں تو شوق نہیں ہے نا شہریار!''

''نہیں ...... بالکل بھی نہیں۔'' تم نگاہیں چرا لیتے۔

''شکر ہے کہ اب ہم میں اختلاف کے پہلو نکلنے لگے ہیں۔''

''جی بجا فرمایا آپ نے۔ ویسے ہی ہم خوفزدہ ہو گئے تھے۔''

''جی ہاں۔''

''ایک بات کا تو مجھے پکا یقین ہے، کم از کم یہ شوق آپ کو ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

تمہاری جاب جیالوجی سے متعلق تھی اس لئے میں نے تمہیں بتایا۔

''پتہ ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایک ڈرامہ لکھوں، اسے پروڈیوس کروں اور ...... آپ کے دل میں ایسا خیال کبھی نہیں آیا ہو گا۔''

''جی، اطلاعاً عرض ہے دُرِ نایاب بی بی! کہ میں نے ایک ڈرامہ لکھا اور اسٹیج بھی کیا اور......''

''نہیں......'' میں نے حیرت سے تمہیں دیکھا۔

''اچھا ...... اچھا کچھ نہیں ہوتا۔ اُداس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ...... ایویں ہی ہوتا ہے۔ مل جاتی ہیں کبھی کبھی ایسی عادات۔''

''جی۔'' میں یک دم خاموش ہو گئی۔

''کوجو!'' تم نے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''مت پریشان ہوا کرو۔ تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو...... پارو! میں تمہیں بہت مِس کروں گا۔ کیسے گزریں گے دن تمہارے بغیر۔ عادی بنا دیا ہے تم نے مجھے اپنا۔''

پارو، کوجو، مٹھو، سوہنو۔ تم نے میرے بہت سارے نام رکھ چھوڑے تھے۔ تم کتنی بے تحاشا محبت دے رہے تھے مجھے شہریار!

اور میں ...... میں تو پاگل ہو رہی تھی تمہاری محبت میں۔ اور مجھے سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ تمہیں تمہاری ان محبتوں کا کس طرح ریٹرن دوں۔ یہ سب میرے لئے بہت نیا، بہت خوبصورت تھا شہریار! یہ محبت بھرے بول میں نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ کسی مرد

نے مجھے اس طرح اتنی محبت سے نہیں دیکھا تھا۔

تمہیں یاد ہے نا، شروع شروع میں جب ہم ایک دوسرے کو شعر سناتے تھے تو فوراً وضاحت کرتے تھے، مطلب کوئی نہیں ہے۔ یونہی شعر سنایا ہے۔

تمہیں بھی میری طرح سینکڑوں شعر، نظمیں اور غزلیں یاد تھیں اور تمہیں گانے بھی بہت یاد تھے۔ اکثر تم مجھے اپنے پسندیدہ گانے سنایا کرتے تھے۔

زندگی اُن دنوں کتنی بے تحاشا خوبصورت ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، ہم یہ بھی بھول گئے تھے کہ تمہیں علاج کے لئے امریکہ جانا ہے اور پھر ...... پھر نہ جانے کیا ہو گا۔ میرے ذہن میں اگر یہ خیال آتا بھی تھا تو میں تم پر ظاہر نہیں کرتی تھی۔ میں چاہتی تھی جتنے دن بھی تم یہاں رہو، خوش رہو۔

اُس روز چھٹی تھی۔ تم لان میں کرسی بچھائے پتہ نہیں کیا سوچ رہے تھے کہ میری آمد کی تمہیں خبر بھی نہ ہوئی۔

''مُنّے کے ابا!''

''کیا......؟'' تم نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔

''بھئی آپ کی وائف آپ کو ایسے ہی بلایا کرے گی نا۔''

''جی مُنّے کی اماں!''

''کہاں ہے مُنّے کی اماں؟''

''یہ میرے سامنے۔''

''جی نہیں ...... وہ تو بہت دور سیالکوٹ میں ہے۔ ویسے نام کیا ہے آپ کی کزن کا؟''

''ہے ایک نام۔ چھوڑو۔''

میں بہت شاکڈ ہوئی تھی شہریار! مہرین کا نام بھی تم نے مجھے نہیں بتایا تھا بلکہ شہر کا نام بھی غلط بتایا تھا۔ اور اب اپنی منگیتر کا نام پوچھنے پر بھی تم ٹال رہے تھے۔ پتہ نہیں تمہارے دل میں کیا تھا۔ میں کبھی نہیں جان سکی۔

''کیا تم مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھتے ہو کہ ان کے نام......''

''فار گاڈ سیک دُری...... غلط سمجھ رہی ہو تم۔ میں نے تو بس یونہی ...... میں دراصل اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا اس لئے۔ روبی نام ہے اس کا۔ چلو اب موڈ ٹھیک کرو کوجو!''

اور اُس روز ہماری یادوں کے اثاثے میں مُنّے کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ بقول

ہمارے انٹینا تو لگ گیا تھا، ٹی وی بھی آ جاتا۔ یعنی مُنّے میاں تو آ گئے، ان کی اماں بھی آ جائیں گی ایک دن۔

پھر تم نے مجھے بہت ساری غزلیں سنائی تھیں ...... اور فرحت عباس شاہ کی وہ غزل یاد ہے نا۔

تُو نے دیکھا ہے کبھی ایک نظر شام کے بعد
کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد
اتنے چپ چاپ کہ رستے بھی رہیں گے لاعلم
چھوڑ جائیں گے کسی روز نگر شام کے بعد

تمہارے لہجے میں اُداسیاں گھلنے لگی تھیں ...... میں نے تمہاری پسند کا شعر سنایا۔

''آپ کے ذوق کے عین مطابق۔

''...... شیشی بھری گلاب کی ......

جمالِ ہم نشیں ہے ناورنہ پہلے میرا ذوق ایسا نہ تھا''

اور ہم دونوں کتنا ہنسے تھے شہریار! حالانکہ اندر جل تھل ہو رہا تھا۔ دونوں کے دلوں میں شاید ایک ہی بات تھی۔ اور پھر ہنستے ہنستے میں ایک دم رو پڑی۔

''مت سنایا کریں مجھے ایسی غزلیں۔ نہیں سنوں گی ...... کبھی نہیں سنوں گی۔''

''پاگل ...... جھلّی۔'' تم نے میرے آنسو پونچھ دیئے تھے۔ ''کچھ نہیں ...... کوئی مطلب تھوڑا ہی تھا میرا۔ یونہی سنا دی بس۔ ہماری بات کا کبھی کوئی مطلب ہوتا ہے؟ مت رویا کرو میری جان! میری زندگی! میری روح ...... آئی لو یو ...... آئی لو یو ڈری!''

تم ایک دم بہت جذباتی ہو گئے تھے شہریار!

''میں دل دی دنیا وچ تیرے باجوں کوئی وساواں تے کافر آکھیں
ساری حیاتی میں تیری چوکھٹ تو سر اٹھاواں تے کافر آکھیں
جے میری پوجا وچ فرق آوے اعجاز خنجر دی لوڑ کوئی نئیں
خدا گواہ ہے تُوں اکھ چا بدلیں میں مر نہ جاواں تے کافر آکھیں''

(اگر میں دل کی دنیا میں تیرے سوا اور کسی کو بساؤں تو مجھے کافر کہنا۔ ساری زندگی اگر میں تمہاری چوکھٹ سے سر اٹھاؤں تو مجھے کافر کہنا۔ اے اعجاز اگر میری پوجا میں فرق آئے تو خنجر کی ضرورت نہیں۔ خدا گواہ ہے تمہی آنکھیں بدل لینا میں مر نہ جاؤں تو مجھے کافر کہنا)

میں کتنی خوش قسمت تھی شہریار! کہ مجھے تمہاری اتنی بے تحاشا محبتیں ملی تھیں ...... اتنی کہ مجھے اپنا دامن تنگ لگنے لگا تھا۔ میں بھلا اس قابل کہاں تھی۔

اتنی محبتوں کے۔

عام سی شکل و صورت کی لڑکی ...... جس کی رنگت بھی سانولی تھی ...... جس کے نقوش میں بھی کوئی خاص جاذبیت نہیں تھی۔ اور جو عمر کے میزان میں بھی مات کھا لیتی تھی۔

میں تمہیں بالکل بھی DESERVE نہیں کیا کرتی تھی شہریار!

''تمہیں معلوم نہیں ہے ڈری! تم عام لڑکی نہیں ہو۔ تم ہر طرح سے مجھے (ڈیزرو) DESERVE کرتی ہو۔ پتہ ہے جب ہماری شادی ہو گی اور ہم ساتھ ساتھ چلیں گے تو لوگ ہمارے کپل کو رشک سے دیکھیں گے۔''

تم پھر خواب دیکھنے لگے تھے۔ پتہ نہیں تم کیوں ایسی باتیں کرتے تھے شہریار! حالانکہ تم جس حقیقت سے باخبر تھے، میں اس سے بالکل بے خبر تھی۔ اور جتنی میں باخبر تھی، وہ حقیقت بھی مجھے ایسا کوئی خواب دیکھنے سے منع کرتی تھی۔ پھر بھی میں تمہارے ساتھ تمہارے خوابوں کو شیئر کرنے لگتی تھی۔

''جی ...... اور لوگ آپ سے پوچھیں گے، سر یہ آپ کی آنٹی ہیں یا......''

''شٹ اَپ ڈری......'' تم نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔ ''فضول باتیں مت کیا کرو۔ دو ماہ بڑی کیا ہو گئی ہو کہ ...... ڈری! تم مجھے DESERVE کرتی ہو سمجھیں۔ تم بہت پیاری ہو، بہت خوبصورت ہو۔

سنگِ مرمر سے تراشا ہوا یہ شوخ بدن
اتنا دلکش ہے کہ اپنانے کو جی چاہتا ہے
سرخ ہونٹوں پہ تھرکتی ہے وہ رنگین شراب
جس کو پی پی کے بہک جانے کو جی چاہتا ہے''

⁂☆⁂

میں تو تمہاری ان محبتوں سے پاگل ہو رہی تھی شہریار! سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اپنی زندگی بھی تمہارے نام کر دوں ...... تمہارے حصے کے سارے دُکھ، ساری پریشانیاں میں لے لوں اور اپنی ساری خوشیاں، ساری مسرتیں، اگر کوئی ہیں تو تمہیں دے دوں۔

دن کتنی جلدی جلدی گزر رہے تھے شہریار!

کراچی سے تیمور بھائی کا فون آ گیا تھا۔ تمہاری سیٹ کنفرم ہو گئی تھی اور وہ چاہتے

تھے کہ کم از کم پندرہ دن پہلے تم کراچی آ جاؤ۔

تم نے چھٹی کے لئے درخواست دے دی تھی۔

ایک ہفتے بعد تم گھر جا رہے تھے۔ ہم دونوں بہت اُداس تھے۔ اندر ہی اندر جیسے کوئی دل کو چھیل رہا تھا۔ مگر تمہاری اُداسی دور کرنے کے لئے میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی تھی۔

''مجھے علی نام بہت پسند ہے۔ میں نے آپا سے بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا نام علی رکھیں مگر...... اور پتہ ہے شہریار! جب آپا کی شادی نہیں ہوئی تھی نا تو میں کوئی غزل کہتی تو آپا اس کے جواب میں غزل یا نظم کہتیں جو باری باری اخبار میں چھپا کرتی تھی۔ ایک ہفتہ اُن کی......''

تم ایک دم کھڑے ہو گئے تھے اور تمہارے چہرے پر پیلاہٹ آ گئی تھی۔

''میں نہیں بچوں گا دُری ...... یہ سب ...... یہ سب بہت حیران کن ہے۔ شاید کبھی کسی کے ساتھ ایسا نہ ہوا ہو ...... میں اور تیمور بھائی بھی اسی طرح کیا کرتے تھے ...... میں نے جان بوجھ کر تمہیں نہیں بتایا تھا دُری کہ میں بھی شعر کہتا ہوں اور میرا فیورٹ نام بھی علی ہے۔''

''کچھ نہیں ...... کچھ نہیں ہوتا ...... یہ اتفاق ہے نا۔''

''میں تمہیں ایک بات بتاؤں، ڈاکٹرز نے مجھے کچھ زیادہ امید نہیں دلائی ہے دُری! شاید میں آپریشن ٹیبل پر......''

''نہیں پلیز، ایسا مت کہو۔ مت کرو ایسی باتیں۔'' میں رو پڑی۔ روتی رہی اور تم خاموشی سے مجھے روتے ہوئے دیکھتے رہے۔ شاید کسی آنے والے لمحے کے خوف نے تمہارے سارے احساسات منجمد کر دیئے تھے۔

''دُری ...... میں نے تمہارے ساتھ انجانے میں زیادتی کر دی ہے۔ میں تو مجھے تمہیں اپنی محبتوں کا اسیر نہیں بنانا چاہئے تھا۔ تم مجھ میں بہت زیادہ انوالو ہو گئی ہو۔''

''پچھتا رہے ہیں آپ؟''

''نہیں۔

ہم تو وہ لوگ ہیں پچھتائیں تو مر جاتے ہیں

بس مجھے تمہارا خیال آ رہا ہے۔ مجھے کچھ ہو گیا تو تم کیا کرو گی؟''

''کچھ نہیں ہو گا آپ کو ...... اچھے بھلے ہیں آپ۔ بہت سارے لوگ ہیں جن کا

مجھے پتہ ہے کہ انہوں نے آپریشن کروایا ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''میرے ابو کہا کرتے تھے دُری! کہ بارش آتی ہے تو آنے سے پہلے بارش کا رنگ بنتا ہے۔ تو رنگ تو بن گیا ہے میری جان!

جانتے تو ہم بھی تھے مانتے تو ہم بھی تھے
اتنی تیز آندھی میں کب چراغ جلتا ہے

تم بہت افسردہ تھے۔

''جی نہیں۔

دُعائے نیم شبی ہے کہ کاش ایسا ہو
ہوائیں تیز ہوں لیکن چراغ جلتا رہے

''کاش ایسا ہی ہو۔''

''جی ایسا ہی ہو گا انشاء اللہ۔ اور جناب! ایک بات یاد رکھ لیں آپ۔ میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ میں آپ کی ممنون ہوں بہت زیادہ کہ آپ نے مجھے محبتیں دیں۔ بہت بڑا اثاثہ ہے ...... بہت بڑا خزانہ ہے یہ میرے لئے۔ میری باقی ماندہ زندگی کے لئے روشنی ...... میری زندگی کے چراغ کا تیل۔''

''دُری! میں تمہارے لئے پریشان ہو گیا ہوں ...... کیسے اُٹھیں گے میرے قدم یہاں سے ...... کیسے جا پاؤں گا میں......؟''

''مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔''

میں بہت کم گو، بہت شرمیلی تھی مگر شہریار! تمہاری محبت کی شدتوں نے مجھے بہادر بنا دیا تھا۔ میں بہت بولڈ ہو گئی تھی۔ بہت جرأت مند۔ میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا ...... تمہیں خوشی دینے کا ...... اُن محبتوں کے عوض جو تم نے مجھے دی تھیں۔

تم نے اپنی محبت سے محرومی کا دُکھ اٹھایا تھا۔

میں اُس دُکھ کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔

''جانے سے پہلے مجھ سے شادی کر لیں۔ میں بابا کو منا لوں گی۔ قائل کر لوں گی۔ یوں بھی بابا آپ کو پسند کرتے ہیں۔ اور وہ تو خود چاہتے ہیں کہ میں شادی کر لوں۔ یہ تو میں خود ہی نہیں کرتی ان کی تنہائی کے خیال سے ...... میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ دیکھ بھال کروں گی۔ وہاں اکیلے ہوں گے۔ میں بھیا سے کہہ کر جلد ہی ویزا لگوا لوں گی۔ بھائی جان وہاں نیوجرسی میں مجھے اسپانسر بھی کر سکتے ہیں۔ پلیز شہریار!''

"نہیں، پاگل ہوگئی ہو ڈری ...... میں تمہیں عمر بھر کے لئے عذاب دے جاؤں ...... عمر بھر کا رونا تمہارے لئے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"نہیں شہریار! میں باقی ماندہ دن آپ کی رفاقت میں گزاروں گی۔ آپ ٹھیک ہو گئے تو بے شک اس کے بعد مجھے ڈائیورس کر دینا اور اپنی منگیتر سے شادی کر لینا لیکن ابھی مجھے ساتھ لے چلیں۔"

"اچھا ڈری! میں پوری سچائی سے تم سے وعدہ کرتا ہوں اگر ڈاکٹرز نے مجھے اطمینان دلایا تو میں واپس آ کر تم سے شادی کر لوں گا۔ لیکن اگر ڈاکٹرز نے کوئی امید نہ دلائی اور بتایا کہ میں دو تین ماہ......"

"نہیں ...... آپ مجھ سے پرامس کریں کہ چاہے ڈاکٹرز نے یہ بھی کہا کہ آپ کے پاس صرف چند دن ہیں تو آپ مجھ سے شادی کر لیں گے۔ چاہے آپ کے پاس ایک دن بھی ہو شہریار ...... وہ ایک دن میں آپ کے ساتھ، بے شک آپ کے ساتھ گزاروں گی۔"

اور تم نے مجھ سے پرامس کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے ڈری! اگر ڈاکٹروں نے مجھے امید نہ بھی دلائی تو بھی میں واپس آ کر شادی کر لوں گا تم سے۔ اور پھر ہم دونوں ...... کتنے اچھے دن ہوں گے وہ۔ تم میری پسند کے کپڑے پہننا۔ ہم خوب گھومیں گے ...... خوب انجوائے کریں گے۔ زندگی کے ایک ایک لمحے سے خوشی کشید کریں گے۔ لیکن تم میرے ساتھ ایک پرامس کرو۔"

"کیا......؟"

"پہلے پرامس کرو ...... میری قسم کھاؤ کہ میری بات مانو گی۔"

"جی۔"

"ڈری! مجھے کچھ ہو گیا تو تم شادی کر لینا۔ اپنی زندگی کو عذاب مت بنانا ...... اور اگر میری عدم موجودگی میں کوئی اچھا پرپوزل آ گیا تو تم اسے ٹھکرانا مت، شادی کر لینا۔"

"شہریار ......" میں چیخ پڑی۔ "نہیں کرتی میں ایسا کوئی پرامس۔ کوئی شوق نہیں ہے مجھے شادی کا۔ پلیز اپنی قسم، اپنا وعدہ واپس لے لو۔ مجھے اس قسم سے آزاد کر دو ...... پلیز شہریار!"

اور تمہیں یاد ہے نا، میں اتنا روئی تھی کہ تمہیں اپنی قسم واپس لینا پڑی تھی۔ لیکن تم

میری شدتوں سے کچھ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ میں نے تمہیں یقین دلایا تھا شہریار کہ اگر تم ٹھیک ہو گئے تو میں تم سے ایسی کوئی بات نہیں کہوں گی...... کوئی ضد نہیں کروں گی۔

"میں جانتی ہوں تمہارے پاؤں میں رشتوں کی زنجیریں ہیں۔ تم مجبور ہو۔ اگر مجبور نہ ہوتے تو مہرین کی محبت تم سے کیوں بچھڑتی۔ میری محبت میں طلب نہیں ہے، کوئی غرض نہیں ہے اور یہ جو میں نے تمہیں شادی کے لئے کہا ہے تو یہ ایک بالکل الگ جذبہ ہے شہریار! صرف تمہیں خوشی دینے کا۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می۔"

"جانو! سمجھتا ہوں ...... بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ مگر مت کرو مجھ سے اتنی شدید محبت کہ میرے لئے مرنا بھی مشکل ہو جائے۔"

"مگر شہریار! یہ محبت اپنے اختیار کی بات تو نہیں ہے نا۔"

یہ آخری ہفتہ پتہ نہیں کیسے گزر گیا۔

ہم کبھی ہنستے، کبھی ہنستے ہنستے رو پڑتے۔

اس ایک ہفتے میں تم نے کئی بار مجھے سنایا اور میں نے بار بار تم سے سنا۔

"میں دل دی دنیا وچ تیرے باجوں......"

بارہا تم نے اپنی محبت کا یقین دلایا۔

یوں لگتا تھا جیسے ہم محبت کی اُس منزل پر آ گئے ہیں جہاں من و تو کا فرق نہیں رہتا۔ تم میں اور میں تم تھے۔ اور یہ کتنی عجیب بات تھی شہریار! کہ اتنی جلدی ہم نے ساری مسافتیں طے کر لی تھیں۔

اور جس صبح تم نے جانا تھا، اس شام پہلی بار میں تمہارے ساتھ باہر گئی تھی۔ تمہارا دل گھبرا رہا تھا۔ تم نے کہا تھا۔

"چلو نایاب! باہر چلتے ہیں۔ کہیں کھلی فضا میں۔"

اور پھر ہم دونوں یونہی بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے پھرے تھے۔ اور شہر سے باہر ایک چھپر ہوٹل میں بان کی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھ کر چائے پی تھی جو اتنی میٹھی تھی کہ ہونٹ چپک گئے تھے اور وہاں ہی بیٹھے بیٹھے میں نے تمہیں وہ نظم سنائی تھی۔ یاد ہے نا، طاہر محمود کی وہ نظم......

"تمہاری خاطر ردائے دل پر دعائیں تحریر کر رہا ہوں
منافقت کی اُداس شب میں
نہ تم اندھیروں سے ہار جانا

میں اپنے حصے کی ساری محبتیں تمہارے چہرے پر لکھ چکا ہوں
میں جانتا ہوں تمہارے رستے بہت کٹھن ہیں
مگر کبھی جب سفر پہ جانا، مری وفاؤں کو یاد رکھنا
یہ جان لینا کہ میرے جذبے چراغ بن کر
تمہارے رستے اُجال دیں گے"

اور یہ کہ......

"ہوا کے جھونکوں پہ اپنے دل کی تمام باتوں کو لکھتے رہنا
مری دعاؤں، مری صداؤں کا دھیان رکھنا
مری محبت نہ مرنے دینا"

دل چاہتا تھا، وقت یہیں تھم جائے۔ ہم ساری زندگی وہاں ہی بیٹھے رہیں۔ تم ساری زندگی یونہی مجھے وارفتگی سے تکتے رہو اور زندگی ختم ہو جائے۔

اُس روز میں نے گرین سوٹ پہنا تھا اور تمہارے کہنے پر آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ تم نے میرے لئے گرین چوڑیاں خریدی تھیں۔ تم نے آف وائٹ سوٹ اور گولڈن کھسے پہنے ہوئے تھے۔

"بس ایک سہرے کی کمی ہے ...... باقی تو سب تیاری ہے، ٹوں ٹوں، ٹوں ٹوں کی۔" میں نے تمہیں جان بوجھ کر چھیڑا تھا اور تم بھی مسکرانے لگے تھے۔

اور پھر تم چلے گئے تھے شہریار!

کتنے مشکل دن تھے وہ۔ میں نے ساری رات جاگ کر تمہارے لئے دعائیں کیں نفل پڑھے۔ جب تمہارا خیال آتا تو رو رو کر میں بے حال ہو جاتی۔ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر، اوپر نیچے آتی رہتی۔ کہیں دل نہ لگتا تھا۔

نہ پڑھنے میں ...... نہ ٹی وی دیکھنے میں۔

تم نے مجھے کراچی کا ایڈریس دیا تھا۔ میں نے تمہارے جاتے ہی تمہیں خط لکھا تھا۔ ہنستا مسکراتا۔ اپنی بے تابیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا میں نے۔ میں چاہتی تھی شہریار! کوئی بات، کوئی یاد تمہیں اُداس نہ کرے۔

میں نے سوچا تھا، میں تمہیں ہر روز ایک خط لکھوں گی اور تمہیں اُداس نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں زندہ رہنے کا حوصلہ دوں گی۔ تمہیں اپنی بیماری سے جنگ کرنے کی جرأت دوں گی۔ اور تم زندہ رہو گے ...... بہت ...... بہت سارے سال۔

میں نے تمہیں مزیدار لطیفے سنائے تھے۔ یاد ہے نا تمہیں۔ اور تمہارے ذوق کے مطابق وہی "شیشی بھری گلاب کی" جیسے شعر لکھے تھے۔ تمہارا ذوق جو بقول تمہارے میری ہم نشینی سے خراب ہو گیا تھا۔ میں نے تم سے کبھی پوچھا نہیں شہریار!

لیکن پردیس میں میرے خط پڑھ کر ایک بار تو تمہارے لبوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہو گی نا ...... اور یہی تو میں چاہتی تھی کہ تمہارے ذہن سے تمہاری بیماری کا خیال نکل جائے۔

تم نے کراچی جانے کے چند دن بعد مجھے فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ میرے وہ خط تمہیں مل چکے ہیں اور تم آج مجھے خط لکھو گے۔

میں تمہاری آواز سن رہی تھی ...... اتنے بہت سے دنوں کے بعد۔ مجھ سے تو کوئی بات ہی نہ کی جا سکی اور لائن کٹ بھی گئی۔

اور پھر تمہارا خط آ گیا۔ میری طرح تم نے بھی ہنسنے کی کوشش کی تھی۔ لطیف کی بہن، ڈاکٹر صاحب اور منے کو یاد کیا تھا۔ لیکن تمہارے خط میں کہیں کہیں اُداسی کی جھلک بھی تھی۔ تم بھی مجھے یاد کر رہے تھے شہریار! میں نے تمہارے خط کو کوئی دسوں بار پڑھا تھا پھر بھی جی چاہتا تھا پڑھوں، پڑھتی رہوں۔ ایک ایک لفظ محبتوں کا اظہار کرتا تھا شہریار!

تم نے یہ چند خطوط جو مجھے کراچی سے لکھے ہیں، میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ جب کبھی میں اداس ہوتی ہوں، جب کبھی مجھے اپنے اوپر سے اعتماد اٹھنے لگتا ہے تو میں تمہارے یہ خط نکال کر پڑھتی ہوں تو یہ خط مجھے بڑا سہارا دیتے ہیں، بڑی تقویت ملتی ہے مجھے ان سے۔

یہ خط مجھے ان محبتوں کا یقین دلاتے ہیں جو تم نے مجھے دیں ...... میرے اعتماد کو بحال کرتے ہیں ...... مجھے بتاتے ہیں کہ میں چاہی گئی ہوں ...... مجھ سے محبت کی گئی ہے اور یہ محبت جھوٹی نہیں تھی۔

تمہارے لکھے گئے شعر اور نظمیں تو میرے دل پر ثبت ہو گئی ہیں۔ تم نے کتنی بہت ساری غزلیں اور نظمیں لکھی تھیں۔ یاد ہے نا۔

'ہوا تھی تیز پھر بھی بادبان ثبت ہو گئے'

اور

'ہجر کی مسافت میں
دل تمہارے بن جاناں'

اور وہ

’کاغذ، کاغذ حرف سجایا کرتا ہے

تنہائی میں شہر بسایا کرتا ہے‘

تمہارے خط پڑھ کر میں بہت روئی بھی ہوں۔ کہیں کہیں ہنستے ہنستے جب تم کوئی مایوسی کی بات کر جاتے تھے تو میرے اندر سے سمندر اُبل پڑتے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ یاد ہے نا ایک بار تم نے ایک نظم لکھی تھی۔

’’ایک بار ایک دوست نے سنائی تھی، نہ جانے کس کی ہے لیکن مجھے اچھی لگتی ہے: سنو گی؟ تم نے لکھا تھا۔‘‘

نہ بستی نہ جنگل تیرا، نہ سورج نہ بادل
نہ تو دن کا اُجیارا ہے نہ ہی رات کا آنچل

اور

چھوٹی سی اِک کٹیا ہے تیری وہ بھی بیچ ہے جنگل
رستہ جس کا کوئی نہیں ہے چاروں اور ہے دلدل

تمہیں پتہ تھا نا شہریار! کہ میں تم سے لڑوں گی، ناراض ہوؤں گی اور روؤں گی۔

اس لئے تم نے ساتھ ہی لکھا تھا۔

’’مطلب کوئی نہیں ہے۔ اور تمہیں تو پتہ ہے جانو، ہماری باتوں کا خاص کر نظموں کا تو کوئی مطلب نہیں ہوتا ...... یوں ہی یاد آ گئی تو لکھ دی۔‘‘

اور تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں جواب میں کیا لکھا تھا۔ اُس نظم کی پیروڈی کر ڈالی۔ یاد ہے نا، میں نے لکھا تھا۔

نہ تو دن کا اُجیارا ہو اور نہ ہی رات کا آنچل
نہ وہ مست نشیلی آنکھیں نہ وہ آنکھ کا کاجل
اُس بستی میں جانے کی تُو بات نہ کر او پاگل
من میں پیت کی جوت جلا لے
دل میں عشق کی آگ لگا لے
بستی تیری، جنگل تیرے، سورج تیرا بادل تیرے
دلدل کے اُس اور کھڑی وہ ناری تیری
اُس کی آنکھ کا کاجل تیرا، اُس کی زلف......

اور آخر میں، میں نے لکھا تھا۔

چھوٹی سی اِک کٹیا وہ بھی بیچ ہے جنگل
رستہ جس کا ......
اُس کٹیا کو آگ لگا دے
جس کا در نہ دروازہ ہو
باغوں میں اِک محل بنا لے
جس میں اتنے در کھلتے ہوں

اور تم کتنے محظوظ ہوئے تھے شہریار! اور تم نے لکھا تھا کہ تم نے اسے بہت بار پڑھا ہے۔

اور پھر وہ خط جو تم نے اس رات لکھا تھا جس صبح تمہاری فلائٹ تھی، تمہارے اُس خط نے مجھے بہت رُلایا تھا شہریار! میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے بہت روئی تھی ......بہت زور زور سے۔

اُس روز بابا بھی گھر پر تھے نا اور بابا کے سامنے بھی میرے آنسو نہیں رک رہے تھے اور میں نے بہانہ بنایا تھا کہ مجھے سب یاد آ رہے ہیں اور میرے سر میں بہت درد ہے۔

تم نے لکھا تھا شہریار! ۔

میں نے اس طور سے اکثر تجھے چاہا جاناں
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے
جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اُترے
جیسے خوشبو کو ہوا رنگ سے ہٹ کر چاہے

تم نے اس خوبصورت نظم کے تین بند لکھے تھے اور پھر لکھا تھا ......’’پارو ...... میری زندگی! اس وقت رات کے دو بجے ہیں اور صبح پانچ بجے میری فلائٹ ہے۔ پتہ نہیں آج کے بعد میں تمہیں خط بھی لکھ سکوں گا یا نہیں۔ کبھی فون پر بات نہ کر سکوں اور کبھی ...... میں زندہ رہا تو تم سے خود رابطہ کر لوں گا ...... اور اگر .... تو تمہیں اطلاع مل جائے گی۔ زیادہ پریشان مت ہونا ...... اور کسی بہت اچھے آدمی سے شادی کر لینا اور ایک بار میری تربت پر ضرور آنا ...... گلاب کے پھول لے کر۔‘‘

اور اس سے آگے میں تمہارا خط پڑھ ہی نہیں سکی تھی۔ آنسوؤں نے تحریر کو دُھندلا دیا تھا۔ آج اتنے برسوں بعد جب میں تمہارا خط دیکھتی ہوں تو وہاں کئی لفظ آنسوؤں سے

سے نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

تم نے واشنگٹن جا کر کوئی خط نہیں لکھا تھا ...... کوئی فون نہیں کیا تھا...... کوئی اطلاع نہیں دی تھی کہ تم کیسے ہو...... ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں۔

میں نے تم سے کہا تھا نا کہ آپریشن سے پہلے مجھے فون ضرور کرنا ...... اور دیکھو ہمت نہ ہارنا۔

تمہیں زندہ رہنا ہے ...... میرے لئے ...... امی کے لئے ...... تعبیر اور نازی کے لئے۔تم دیکھنا میں ہر لمحہ تمہارے پاس ہوں گی، تمہارے قریب۔ تم محسوس تو کرنا۔

مگر تم نے کوئی اطلاع نہیں دی۔

تم ان دنوں کی اذیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے، کیسے گزرتے تھے وہ شب و روز۔

کب صبح ہوتی تھی اور کب رات آ جاتی تھی۔

یوں جیسے کسی کو سُولی پر لٹکا دیا جائے اور پھر کہا جائے، حکمِ معافی کا انتظار کرو۔

موت یا زندگی۔

مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ تم پر کیا گزر رہی ہے۔ نہ تو میں تمہیں فون کر سکتی تھی اور نہ خط لکھ سکتی تھی۔

کاش ...... کاش تم میری بات مان سکتے اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔

لیکن تم نے کہا تھا شہریار!

”اتنی جلدی امی جی کو اور بھائی جان کو راضی کرنا بہت مشکل ہے ...... میں واپس آ کر تیمور بھائی سے بات کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے اور پھر چاہے میرے پاس ایک دن بھی ہو۔

میں ساری ساری رات جاگتی تھی۔

میں نے کئی بار تمہارے گھر فون کیا تھا۔

نازی کی زندگی سے بھرپور ہیلو مجھے تھوڑی دیر کو پُرسکون کر دیتی کہ سب ٹھیک ہے ...... تم اچھے ہو، خیریت سے ہو ...... میں ریسیور رکھ دیتی۔

مگر کچھ دیر بعد پھر وہی اضطراب۔

میں نے یہ بات تمہیں کبھی نہیں بتائی تھی کہ میں نے تمہاری عدم موجودگی میں کئی بار فون کیا تھا لیکن بات کئے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔تم آ گئے تھے تو ان دنوں کی وہ ساری

تکلیف، ساری اذیت مجھے بھول گئی تھی۔

مجھے یہ یقین تو تھا کہ تم ہو، موجود ہو۔ لیکن کس اذیت سے گزرے ہو، آپریشن ہوا یا نہیں ...... اس کی خبر نہیں تھی۔ اور تم کوئی اطلاع نہیں دے رہے تھے۔

تمہیں کوئی اطلاع تو دینی چاہئے تھی نا۔ مگر شاید تمہیں میری محبتوں کی شدت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔

تب ایک رات میں نے نظم لکھی تھی تمہارے نام بہت دنوں بعد۔ جب سے تم ملے تھے، میں نے لکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔تم سے باتیں کرنا یا پھر تمہیں سوچنا۔ حالانکہ تم نے کتنی بار مجھے کہا تھا...... کوئی نئی چیز لکھو......

”کوئی نئی چیز لکھو۔ بہت دنوں سے تمہارا کوئی شعری مجموعہ نہیں آیا۔ اب آنا چاہئے۔“

مگر پتہ نہیں کیا بات تھی، میں لکھ نہیں پاتی تھی۔مگر اُس روز میں نے لکھا۔

’صبا یہ اُس سے کہہ دینا
کہ ہم تم سے خفا ہیں
سنا ہے جس پرائے دیس میں تم ہو
وہاں پر
محبت کی کوئی وقعت نہیں ہے
وفاؤں کی کوئی قیمت نہیں ہے‘

یہ پہلی نظم تھی جو میں نے صبا کو مخاطب کر کے تمہارے نام لکھی تھی۔ اور پھر بعد میں ہم دونوں نے بے شمار نظمیں لکھیں۔ جب کبھی تم خفا ہو جاتے یا میں تو ہم یونہی نظمیں لکھ لکھ کر ایک دوسرے کو بھیجا کرتے تھے۔

’صبا کچھ دیر رُک جاؤ
میرا پیغام لے جاؤ
صبا اُس کے کوچے سے روز تیرا
گزر ہوتا ہے‘

وغیرہ وغیرہ۔

مگر وہ پہلی نظم تھی ...... ہمارے صبا نامے کی پہلی نظم جو میں نے تمہیں بھیجی نہیں تھی۔ بعد میں جب تم آئے تھے تو تمہیں دی تھی۔ یاد ہے نا۔ شاید ابھی بھی تمہارے پاس

...... میں تمہیں نظم نہیں بھیج سکی تھی لیکن تمہارا خط آ گیا تھا۔ پورے اٹھارہ دن بعد۔

یہ تمہارا ہی خط تھا شہریار!

تمہاری تحریر تھی۔

تم ٹھیک تھے ...... خیریت سے تھے۔ جب ہی تو تم نے خط لکھا تھا۔ میں نے پاگلوں کی طرح تمہارے خط کو بار بار چوما۔ اور میرے آنسو خط پر گرتے رہے۔

بڑی دیر بعد میں نے اسے کھولا۔

تم نے کراچی سے خط لکھا تھا۔ تم واپس آ گئے تھے۔ تم ٹھیک تھے۔ تمہارا آپریشن نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے میڈیسن تجویز کی تھیں جو چھ ماہ تمہیں استعمال کرنی تھیں۔

تم نے لکھا کہ بے شمار ٹیسٹ ہوئے ہیں، جو آپریشن سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ جنہوں نے تمہیں بہت کمزور کر دیا تھا اور تیمور بھائی فی الحال تمہیں آنے نہیں دے رہے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ تم وہاں اپنی کیئر نہیں کر سکو گے۔

"تیمور بھائی صحیح کہتے ہیں۔" میں نے تمہیں لکھا۔ "ابھی وہاں ہی رہیں۔ بھابھی کی میزبانی کا لطف اٹھائیں اور مجھے اچھے اچھے خط لکھیں۔"

اُس روز میں نے مسجد میں روپے بھجوائے۔ شکرانے کے نفل پڑھے اور تمہیں طویل خط لکھا۔ جب سے تم گئے تھے شہریار! میں نے تمہاری بیماری اور صحت کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا تھا اور اب تمہاری طرف سے اطمینان ہوا تھا تو مجھے اپنی بے تابی اور پاگل پن یاد آ رہا تھا۔ پتہ نہیں تم کیا سوچتے ہو گے شہریار!

تمہیں یاد ہے نا، جس روز تمہیں جانا تھا، ہم باہر گئے تھے۔ اور پھر اگلی صبح جانے سے پہلے ذرا ہی دیر کے لئے تم گھر آئے تھے۔ تم نے ٹیبل سے اپنی گلاسز اور گاڑی کی چابیاں اٹھائی تھیں۔ دروازے کے پاس رک کر مجھے دیکھا تھا۔ میں ڈرائنگ روم کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے ساکت کھڑی تھی تم لمحہ بھر مجھے یوں ہی دیکھتے رہے تھے۔ پھر یکا یک مڑ کر بالکل اچانک میری پیشانی کو چوم لیا تھا اور تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔ تمہارے ہونٹوں کا وہ لمس آج بھی میری پیشانی پر اسی طرح زندہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی تمہارے ہونٹوں نے میری پیشانی کو چھوا ہو۔

اور وہ جو میں نے آخری چند دنوں میں تم سے ضد کی تھی، اصرار کیا تھا کہ مجھے ساتھ لے چلو ...... کتنی پاگل ہو رہی تھی میں۔ شاید تم بھی اپنی صحت کی طرف سے کچھ مطمئن ہو کر میری باتوں کو سوچ رہے تھے تبھی تو تم نے مجھے لکھا تھا۔

"کبھی کبھی آدمی دوسروں کے فیصلوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ شاید میں بھی چڑھ جاؤں ڈری ...... بلکہ میں تو وہ بھیڑ ہوں جسے بہت عرصہ پہلے قربان گاہ کے لئے وقف کر دیا گیا ہو۔"

اس کے بعد بھی تم نے ایسی ہی اور اس طرح کی ملتی جلتی باتیں کئی بار لکھیں۔ پتہ نہیں تم مجھے کیا سمجھانا چاہتے تھے اور صاف صاف سمجھاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ مگر میں تو تمہارے لہجے کا ہر رنگ پہچاننے لگی تھی۔ میں نے تمہیں لکھا تھا۔

"شہریار! جانے سے پہلے میں نے تم سے جو ضد کی تھی، جو بھی کیا تھا وہ قطعی ایک اور جذبہ تھا۔ ایک بالکل مختلف جذبہ۔ تمہیں خوشی دینے کا جذبہ شاید کسی لغت میں اس جذبے کا کوئی نام نہ ہو۔ مگر تم جانتے ہو شہریار وہ کیا جذبہ تھا، بغیر میرے بتائے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

مگر اس محبت میں کوئی غرض، کوئی طلب نہیں ہے۔

میں نے جب تم سے محبت کی تھی تو میں جانتی تھی کہ تم مجھ سے پہلے ہی کسی سے منسوب ہو چکے ہو اور تم لاکھ چاہو تو بھی ان زنجیروں کو کاٹ نہیں سکتے۔ میں تمہیں اس وعدے سے آزاد کرتی ہوں شہریار! جو جانے سے پہلے میں نے تم سے لیا تھا۔ تم زندہ رہو ...... خوش رہو ...... اپنا گھر بناؤ۔ اس گھر میں تمہارے بیوی بچے ہوں۔ یہ میرے لئے بہت ہے۔"

میں آج تک نہیں جان سکی نوید شہریار! کہ تم نے محبت کے ابتدائی زمانے میں ایسے خواب کیوں دیکھے تھے جن کی کوئی تعبیر ہی نہیں تھی۔ حالانکہ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ زنجیریں بہت مضبوط ہیں۔

تم میرے سنگ زندگی گزارنے کی باتیں کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ممکن ہی کب تھا۔

شاید تم اپنے آپ کو بہلا رہے تھے یا مجھے اپنا اسیر کر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیا تھا شہریار ...... میں کبھی نہ جان سکی۔

پھر تم آ گئے شہریار ...... اور میں کتنی زیادہ خوش تھی۔ میرا دل چاہتا تھا تمہاری آمد کی خوشی میں سارے شہر میں چراغاں کر دوں۔ پورے شہر کو پھولوں سے سجا دوں۔

تم ایک بار پھر میرے پاس تھے۔

میرے قریب۔

میرا دل چاہتا تھا، بار بار تمہیں چھو کر دیکھوں کہ یہ تم ہی ہو نا۔ میری دعائیں رائیگاں

نہیں گئی تھیں۔ خدا نے میری سن لی تھی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا نایاب! کہ تمہاری دعاؤں میں اتنا اثر ہے۔'' تمہاری آنکھوں میں میرے لئے چاہت کے ڈھیروں رنگ کھلے تھے۔ تم بار بار میرے چہرے کی طرف دیکھتے تھے اور میرے رخسار تمہاری نظروں کی تپش سے دہک اٹھتے تھے۔

''کہیں باہر ملو نا پارو! میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں، اپنے سامنے بٹھا کر۔''

بابا گھر پر تھے۔ ان کی چھٹیاں تھیں نا۔

یاد ہے پھر ہم باہر گئے تھے۔

موسم کتنا خوبصورت ہو رہا تھا اس دن۔

ہلکی ہلکی پھوار میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے درختوں کے سائے تلے چلنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

تمہیں یاد ہے نا شہریار! تم نے چلتے چلتے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

''اپنا ہاتھ مجھے دے دو۔''

''اس کا مطلب سمجھتے ہیں؟'' میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے یونہی شرارت سے کہا تھا۔

لیکن تم چونک کر مجھے دیکھنے لگے تھے اور لمحہ بھر کو تمہارے چہرے پر سایہ سا آ گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی جب سے تم واپس آئے تھے، میں نے محسوس کیا تھا کہ تم ایسی کی بات پر چونک اٹھتے تھے۔ اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے۔

نہ ہی مستقبل کی باتیں کرتے تھے۔

''شہریار!'' میں نے تمہارے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''میرے ساتھ پرامس کرو کہ اگر کبھی تم نے محسوس کیا کہ تمہیں میرے ساتھ محبت نہیں ہے اور شاید یہ سب ایک وقتی چارم تھا تو پلیز مجھے بتا دینا۔ مجھے چیٹ نہیں کرنا۔ مجھے دھوکا مت دینا۔ جب تم خود پر کلیئر ہو جاؤ اور تمہیں پتہ چل جائے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تو میں یہ برداشت کرلوں گی لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گی کہ مجھے فریب دیا گیا۔

وہ محبت جو میرا ایمان ہے، وہ جھوٹ ہے۔

نہیں شہریار، میرے ساتھ ایسا مت کرنا ...... نہیں تو میں مر جاؤں گی ......

میں تمہاری جدائی برداشت کر سکتی ہوں۔

تم مجھ سے کبھی نہ ملو۔

کبھی بات نہ کرو۔

یہ سب میرے لئے قابل برداشت ہے۔

میں یہ سب پہلے سے جانتی ہوں اور یہ طے ہے کہ تمہاری شادی کے بعد مجھے تم سے نہیں ملنا۔ لیکن تمہاری محبت جھوٹ ہو، یہ کبھی برداشت نہیں ہوگا۔''

''ڈری ...... میری زندگی، میں اپنے اوپر اچھی طرح کلیئر ہوں۔ میری محبت جھوٹ نہیں ہے۔ یہ اتنی ہی کھری اور سچی ہے جتنی تمہاری محبت۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم زندگی کا سفر اکٹھا طے نہیں کرسکیں گے۔''

تم نے پہلی بار اعتراف کیا تھا اور اسی روز میں نے بھی طے کرلیا تھا شہریار! کہ اپنی آنکھوں میں تمہاری رفاقت کے خواب نہیں سجاؤں گی۔ اور وہ جو جانے سے پہلے ہم خواب دیکھا کرتے تھے اور جو میں نے تم سے کہا تھا ان سب کے لئے میں نے ایک بار پھر تم سے سوری کرلیا تھا۔

''میں اپنی جذباتیت پر نادم نہیں ہوں شہریار! مگر وہ ایک بالکل سچا جذبہ تھا۔''

''جانتا ہوں پاگل ...... مت کیا کرو ایسی باتیں ...... اور مجھ سے بھی ایک پرامس کرو ڈری! کہ کبھی مجھ سے بدگمان نہیں ہوگی۔ کبھی بے یقین نہیں ہوگی۔ اور اگر کوئی غلط فہمی ہوئی تو مجھے صفائی کا موقع ضرور دو گی۔''

''یقین ٹوٹنے کے لئے نہیں ہوتا شہریار! اور جو ٹوٹتا ہے وہ یقین نہیں ہوتا۔ تم نے ہی ایک بار اپنے خط میں لکھا تھا۔

''ڈری! میرا ایک بہت اچھا دوست تھا روشن خان۔ بہت گہرا ...... جان سے بھی زیادہ عزیز۔ لیکن اس نے مجھ پر یقین نہیں کیا تھا ...... مجھ پر، میری باتوں پر اعتماد نہیں کیا تھا۔ یقین نہیں کیا تھا۔ میری محبت کو بے اعتبار کر دیا تھا اُس نے۔

اور میں نے اُس سے قطع تعلق کرلیا۔

میں نے راتوں کی تنہائی میں اُسے یاد کیا ہے ...... کئی کئی دن اُسے سوچا ہے ...... اُس کی پریشانیوں کا سن کر اپ سیٹ ہوا ہوں۔ اس کی مسرتوں پر خوش ہوا ہوں ...... اس کے اچھے مستقبل کی دعائیں کی ہیں۔ لیکن میں کبھی لوٹ کر اس کی طرف نہیں گیا۔

کبھی مجھ پر، میری محبت پر شک نہیں کرنا زندگی ...... نہیں تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ تمہاری بے یقینی مجھے مار ڈالے گی پارو!''

اور وہ دن کتنا خوبصورت تھا جو ہم نے ایک ساتھ گزارا تھا۔ صبح سے شام تک تمہاری

قربت ...... تمہارا ساتھ۔

میں نے سوچا تھا، جب کبھی تم میرے نہیں ہو گے تو یہ یادیں میرے زندہ رہنے کا سامان ہوں گی۔

بابا کی چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہی ہماری روٹین۔

آفس سے آ کر تھوڑا آرام کرنے کے بعد تم ادھر ہی آ جاتے، لان میں یا ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر باتیں کی جاتی تھیں۔

تم کبھی مجھ سے بور نہیں ہوئے۔ کتنی بہت ساری باتیں تھیں جو ختم ہی نہیں ہوتی تھیں شہریار! میں سوچتی تھی، اب تو ساری باتیں کر لی ہیں ہر موضوع پر۔ اب بھلا کل کیا بات کریں گے؟ لیکن اگلے روز پھر اتنی ڈھیروں باتیں ہوتیں ہمارے پاس کرنے کو۔ اور جب تم جا رہے ہوتے تو میرا دل چاہتا کاش تھوڑی دیر اور رُک جاتے تم۔

پہلے کی طرح اب بھی ہم ایک دوسرے کو شعر سناتے۔ گانے گائے جاتے۔ لطیفے ہوتے اور کبھی کبھی کوئی پُر لطف بات، کوئی ذومعنی جملہ دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتا۔ کبھی کوئی شرارت۔

''تم بہت شرارتی اور بہت چالاک ہوگئی ہو۔'' تم اکثر کہتے۔ ''شروع شروع میں تو بہت معصوم اور سادہ سی لگتی تھیں، شرمیلی سی۔''

''ہاں ...... جمالِ ہم نشیں کا اثر ہے۔''

کبھی کبھی اب بھی ہماری کوئی بات مل جاتی تھی مگر اب ہم اتنے خوف زدہ نہیں ہوتے تھے بلکہ ہنسی میں اُڑا دیتے تھے۔

تمہارے باس نے پجیرو لی تھی۔ تم نے بتایا تھا۔

''مجھے پجیرو بالکل اچھی نہیں لگتی۔ ہمیں تو بس جیپ پسند ہے اور اسپورٹ کار بھی۔ بچپن میں میرا بڑا دل چاہتا تھا کہ میرے پاس ایک جیپ ہو اور میں شوں کر کے اُسے دوڑاتی پھروں۔''

''اور میں تمہیں یہ کبھی نہیں بتاؤں گا کہ ہمارے پاس جیپ تھی اور یہ بھی کہ مجھے بھی پجیرو اچھی نہیں لگتی۔''

''کبھی مجھے سیاست سے بہت دلچسپی ہوا کرتی تھی۔'' ایک بار میں نے تمہیں بتایا تھا۔ ''آپ کو تو نہیں ہے نا؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' تم ہنس دیئے تھے۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مجھے نقل کی

پرانی عادت ہے۔ چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔''

❋✫❋

وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا شہریار! کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں وقت کو تھام لیتی۔

پتہ ہی نہیں چلا اور ایک سال گزر گیا۔

اس ایک سال میں ہم کئی بار خفا بھی ہوئے۔

یاد ہے نا تمہیں بعض اوقات تم یونہی معمولی سی بات پر خفا ہو جاتے تھے۔ حالانکہ بات تو کچھ بھی نہیں ہوتی تھی اور ہماری ناراضگی بھی کتنی عجیب ہوتی تھی۔ ہم ملتے بھی تھے، بات بھی کرتے تھے، ایک دوسرے کو شعر بھی سناتے تھے (جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا) حال احوال بھی پوچھتے تھے مگر سنجیدگی کے ساتھ۔

تم پوچھتے۔ ''بابا کیسے ہیں؟''

میں کہتی۔ ''اچھے ہیں۔''

''آپا کا کوئی فون یا خط آیا؟ بھائی جان اور بھیا ٹھیک ہیں؟''

ایک بار میں نے چڑ کر کہا۔ ''جی ...... محلے والے بھی سب خیریت سے ہیں۔'' اور تم ہنس پڑے تھے۔ یوں ہماری ناراضگی ختم ہو جاتی تھی۔

لیکن اکثر تم مجھے خوب تنگ کر کے خوب رُلا کر موڈ ٹھیک کرتے تھے۔ اور پھر جب تمہارا موڈ ٹھیک ہو جاتا تو میں تمہیں وہ نظم سنایا کرتی تھی جو تمہاری ناراضگی میں لکھی جاتی تھی ...... کتنی بہت ساری نظمیں ہیں میرے پاس ...... تقریباً بیس نظمیں جنہیں میں کبھی کبھی پڑھتی ہوں تو وہ پچھلے دن میری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جاتے ہیں۔

تقریباً اتنی ہی تمہاری نظمیں بھی ہیں۔ لیکن ہم انہیں اکٹھا کر کے چھپوا نہیں سکتے شہریار! یاد ہے ایک بار غصے میں تم نے کہا تھا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی تو میں نے لکھا تھا۔

صبا اُس سے یہ کہہ دینا
اُسے کہنا
تمہیں کچھ یاد ہے جاناں
کہ پچھلی شب کو تم نے کیا کہا تھا
سنو

کبھی میری محبت کو
نگاہِ شک سے مت تکنا'

اور ایک بار جب محبت میں وصل ضروری ہے کہ نہیں، اس پر ہماری بحث بہت طویل ہوگئی تھی اور تم خفا ہوگئے تھے تو میں نے لکھا تھا۔

'صبا کوچے سے اُس کے
روز تیرے گزر ہوتا ہے
کبھی ممکن ہو تو
اُس کو میرا پیغام دے آنا
اُسے اتنا تو کہہ آنا
سنو آرام سے کہنا
محبت سے اُسے تکنا
بہت ہی پیار سے کہنا
...... محبت میں رفاقت کی تمنا
وصل کی خواہش بہت ہی نیچرل
مگر جاناں
رفاقت نہ ملے تو بھی محبت کم نہیں ہوتی'

اور ایک بار تم بہت زیادہ خفا ہوگئے تھے تو میں نے تمہیں لکھا تھا۔

'صبا کوچے سے اُس کے گزر ہو تیرا
تو یوں کرنا
ذرا سی دیر کو رک جانا
دریچے سے اُسے تکنا
میری آنکھوں کو اپنے ساتھ لے جانا
اگر وہ جاگتا ہو تو اُسے کہنا
کہ جگنو، تتلیاں بادل ہوا
حسین خطے سمندر وادیاں
کچھ بھی نہیں ہیں ...... سنو کچھ بھی نہیں ہیں
تمہاری آنکھوں میں سمٹے ہوئے

چاہت کے رنگوں کے مقابل میں
یہ سب رنگ ہیں جاناں'

اور ایک بار تم ویک اینڈ پر گئے تو پورے ایک ہفتے کے بعد آئے۔ میں کتنی پریشان ہوئی تھی اور آ کر بھی تم کئی دن تک ملنے نہیں آئے تھے۔ میں خفا تھی۔ تم نے نظم لکھ کر بھیجی تھی۔

'صبا اُس سے کہنا
فصیلِ شہر پہ کئی روز سے خیمہ زن ہے
کسی اجنبی دیس کا اجنبی آدمی
شہر میں اُسے داخلے کے لئے
امیرِ شہر کی اجازت نہیں'

کتنے اچھے تھے وہ دن شہریار! اُن دنوں میں نے اپنی ذات کے حوالے سے تم سے کتنی باتیں کی تھیں۔

رفاقت بھائی کی جدائی
اُن کی محبتیں
اُن کی چاہتیں
پھر ان کے بعد بھائی جان اور بھیا کی اجنبیت
بھابھیوں کے رویے

یہ سب میں نے انہی دنوں تم سے کہا تھا شہریار! تم کتنے اپنے اپنے لگتے تھے شہریار! ...... دل چاہتا تھا سارے آنسو جو میرے اندر ہی کہیں منجمد ہو چکے ہیں، ایک ہی بار تمہارے ہاتھوں کے پیالے میں بہا دوں اور پھر کبھی نہیں روؤں۔ اس لئے کہ تم جو میرے ساتھ ہو، مجھے حوصلہ دینے والے ہو۔

مگر شہریار! میں نے جتنے آنسو بہائے تھے، اس سے کہیں زیادہ آنسو میرے اندر جمع ہو گئے ہیں۔

اُن دنوں جو ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے تحاشا ہنستے تھے، کاش میں اُس ہنسی کو کہیں محفوظ کر لیتی، کسی فریزر میں رکھ دیتی۔

اور آج جب میرے چاروں اور گھور اندھیرے ہیں ...... کہیں کوئی آواز کا جگنو ...... کوئی ہنسی کا پھول نہیں ...... میں فریزر سے اس ہنسی کو نکال کر اپنے ویرانے میں بہار

لے آتی ہے۔

ان دنوں موسم گرما کی چھٹیاں تھیں۔ بابا بھی گھر پر تھے۔ آپا بھی بچوں کے ساتھ آ گئی تھیں۔ تم گھر آتے تو تمہارے ساتھ کچھ زیادہ بات نہ ہو پاتی۔ بس بابا کے پاس بیٹھ کر تم چلے جاتے تھے۔

تب تم نے بہت خوبصورت نظم لکھ کر مجھے بھیجی تھی شہریار!

’صبا اُس سے کہنا کہ
تنہائیاں دامنِ دل سے آ کر لپٹنے لگی ہیں
وحشتیں پھر سے روح کو ڈسنے لگی ہیں
خیمۂ جاں کی ساری طنابیں میری اب اُکھڑنے لگی ہیں‘

اور آخر میں تم نے لکھا تھا۔

’تم سے ممکن ہو تو بس گھڑی دو گھڑی کے لئے
تم چلے آؤ اب
ایک پل ہی سہی
چین تو آئے گا‘

اور میں تو جیسے کھنچی چلی آئی تھی۔ تم اس وقت آفس سے آئے تھے۔

’’آپ ٹھیک تو ہیں ...... چین PAIN تو نہیں ہو رہا؟ پھر تو تکلیف نہیں ہو رہی؟ میڈیسن لے رہے ہیں؟‘‘

’’تم آ گئی ہو تو سب ٹھیک ہے ...... میں تمہارے لئے بہت اُداس ہو گیا تھا پارو! کیسے تمہارے بغیر رہوں گا؟ اتنا عادی کیوں بنا دیا ہے تم نے مجھے اپنا؟‘‘

’’ہاں ..... شاید انجانے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کر دی تھی شہریار! میں سمجھتی تھی کہ محبت کا نہ ملنا عذاب نہیں ہوتا، مل کر بچھڑ جانا عذاب ہوتا ہے۔ لیکن میں نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت کر کے کھو دینا بالکل محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔ اور یہی بات میں نے تم سے کہی تھی۔ لیکن تم بہت اُداس ہو رہے تھے۔

’’ڈری! مجھے تم سے اپنی محبتوں کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے درحقیقت تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔‘‘

’’جی نہیں ...... آپ نے اچھا کیا ہے۔ بہت اچھا۔ چلیں باہر چلتے ہیں۔ بچوں کو بھی لے لیتے ہیں۔‘‘

اُس روز تمہارا بالکل موڈ نہیں تھا۔

پھر ہم نے ٹاس کیا تھا۔ YES اور NO کی پرچیاں لکھی تھیں۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ NO کی پرچی نکلی تھی پھر بھی ہم گھومنے چلے گئے تھے اور تم نے بتایا تھا کہ کچھ دنوں تک تم اسلام آباد چلے جاؤ گے، ہیڈ آفس میں۔ لیکن ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد تم یہاں بھی آؤ گے اور ایک دو دن رہا کرو گے۔

اور پھر تم چلے گئے شہریار!

اور بس کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی۔

کبھی بات نہ ہو پاتی تو تم خط لکھ دیتے اور جب تم آتے تو انہی دنوں بابا بھی آئے ہوتے۔ بس سرسری سی ملاقات ہو جاتی۔ چائے سرو کرتے ہوئے ذرا سی دیر کو سلام دعا ہو جاتی تھی۔ ان دنوں کیسی اُداسیاں تھیں شہریار!

شام ہوتے ہی دل گھبرانے لگتا۔

میں لان میں ٹی وی لاؤنج میں چپ بیٹھی تمہیں سوچا کرتی تھی۔

ایسی ہی ایک شام جب تم مجھے بہت یاد آ رہے تھے تو میں نے تمہیں لکھا تھا۔

’بڑی ویران شامیں ہیں
مری بستی کے سورج کو گھنے، گہرے اندھیرے بادلوں نے گھیر رکھا ہے
صبا معلوم ہے تم کو
کہ ایسا کس لئے ہے
کیوں
اُداسی تہہ در تہہ کُہر کی مانند
اُتر جاتی ہے دل میں شام سے پہلے
سنو وہ ہمنوا میرا
بہت دن ہو گئے
ویران کر کے شہر کو میرے‘

اور تم نے لکھا تھا۔

’’پارو! ان لفظوں کو سنبھال کے رکھنا۔ ہم انہیں چھپوائیں گے۔

مگر میرے تو کبھی کوئی خواب پورے نہیں ہوئے شہریار جو یہ خواب بھی پورا ہوتا۔

کبھی کبھی تم بے تحاشا محبتوں کا اظہار کرتے تھے۔

اور کبھی یوں لگتا...... جیسے بات کرتے کرتے تم کھو جاتے ہو۔ اَپ سیٹ سے ہو۔

''کیا بات ہے شہریار! تم مجھے کیوں نہیں بتاتے؟''

''کچھ نہیں جانو، ایسے ہی وہم ہے تمہارا۔''

مگر یہ میرا وہم نہیں تھا شہریار!

کہیں کوئی کمی ضرور ہو گئی تھی۔

شاید تم پچھتا رہے تھے۔

شاید تم گلٹی فیل کر رہے تھے۔ خود کو قصور وار سمجھ رہے تھے۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں تم سے اتنی شدید محبت کرنے لگوں گی۔

تم نے جب پہلی بار مجھے خط لکھا تھا تو شاید تمہارے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا۔ بس وہ نظم تمہیں اتنی اچھی لگی تھی کہ تم نے مجھے خط لکھ دیا۔ میرے جواب نہ دینے پر شاید تمہیں چڑ ہو گئی تھی۔ اس لئے تم نے پھر خط لکھے، فون کیا۔

اگر میں تمہیں پہلی بار ہی جواب دے دیتی تو نارملی بات آگے نہ بڑھتی۔

پھر یہ محض اتفاق تھا کہ تم ہمارے شہر میں آ گئے۔ تم بیمار تھے۔ ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ تمہارے ذہن میں شاید یہ بات ہو گی کہ وقتی انجوائے منٹ ہے۔ کچھ عرصے بعد تم چلے جاؤ گے تو بات ختم۔ لیکن بات تمہاری توقع کے خلاف بڑھ گئی تھی۔

ہم دونوں ہی ایک دوسرے میں انوالو ہو گئے تھے۔ ایسے ہی بہت ساری باتیں تھیں جو میں ان دنوں سوچنے لگی تھی۔

شاید تمہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا شہریار کہ یوں ہو جائے گا۔ شاید اسی لئے تم اپ سیٹ ہو...... پریشان ہو۔

تب میں تمہیں بار بار یقین دلانے لگی شہریار! کہ مجھے تمہاری رفاقت کی ضرورت نہیں ہے۔ میری محبت میں کوئی غرض، کوئی طلب نہیں ہے اور بہتر ہے کہ اب تم شادی کر لو۔

''اور میری شادی کے بعد تم کیا کرو گی؟''

''میں نے کیا کرنا ہے بابا۔ مزے سے لکھیں گے...... پڑھیں گے...... بھیا کے پاس جائیں گے...... میں اور میرے بابا عمرہ کرنے...... ممکن ہے، نیوجرسی بھی چلے جائیں۔''

''بھلا سکو گی مجھے؟''

''نہیں...... یہ آپ سے کس نے کہا ہے؟ میرے لئے یہ کافی ہو گا شہریار کہ آپ خوش ہیں۔ آپ کا ایک گھر ہے، بیوی ہے، بچے ہیں اور بس۔''

شاید تم یقین نہ کرو۔ شاید تم سوچ بھی نہ سکو کہ ایسا ہوتا ہے...... ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے کبھی یہ دُعا نہیں کی کہ تم اور میں زندگی کا سفر اکٹھے طے کریں۔

کبھی نہیں شہریار!

میں نے تمہاری زندگی، تمہاری خوشیوں اور تمہاری کامیابی کی دعائیں ضرور کی ہیں لیکن یہ دعا کبھی نہیں کی کہ تم میرے ہوتے۔ اس لئے کہ مجھے پتہ تھا کہ ایسا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ تمہارے بابا نے تم سے بند لبوں سے جو کہا تھا، مجھے اس کا مان تھا...... میں سمجھتی ہوں کہ ایک گھر بسانے کے لئے، ایک محبت پانے کے لئے بہت سی محبتوں کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

میں ظالم نہیں تھی شہریار! میں کسی عورت پر ظلم نہیں کر سکتی تھی۔ وہ عورت جو تمہاری بہن تھی۔ وہ عورت جو تمہاری ماں تھی۔ اور وہ جو تم سے منسوب تھی۔

میں ان سب پر کیسے ظلم کرتی۔ شاید مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری دعا قبول نہ ہو جائے اس لئے میں نے یہ دعا کبھی نہیں کی۔ میں نے اپنی ذات کے لئے کبھی دعا نہیں کی تھی۔ کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ اور جب مانگنے کا وقت آیا تو اتنی بے بس تھی کہ مانگ نہیں سکتی تھی۔

''اچھا اگر میں نے شادی کر لی تو کیا تم مجھ سے ملو گی؟ بات کرو گی؟'' بڑی دیر بعد تم نے پوچھا تھا۔

''نہیں...... کبھی نہیں۔''

''کیوں......؟''

''اس لئے کہ میں کبھی نہیں چاہتی کہ اس چند روزہ زندگی میں آپ ڈس اونسٹ کہلائیں اور میں ظالم و ستم گر۔''

اُس روز تم جلدی چلے گئے تھے اور تمہارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ پھر بہت دنوں بعد تم آئے تھے۔ سیدھے آفس میں اور وہیں سے تم نے فون کیا تھا۔

''میں بہت بزی ہوں...... بہت دیر سے گھر آؤں گا۔ تم سونا نہیں، باتیں کریں گے۔''

"نہیں۔ رات میں نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں اکیلی ہوں ...... ماسی گاؤں گئی ہوئی ہے ...... ابھی آ جائیں نا۔"

"آؤٹ ہو رہا ہے ...... نو بجے کے بعد ہی فارغ ہوں گا۔"

"تو پھر کل مل لیں گے۔"

"میں صبح پانچ بجے چلا جاؤں گا۔ ہیڈ آفس میں کام ہے۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں تم سے ملے، بات کئے۔ بہت اداس ہو رہا ہوں۔"

"اعتماد کی بات نہیں ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔"

اور تم بہت زیادہ خفا ہو گئے تھے۔ بہت دن خفا رہے تھے۔

یاد ہے نا تمہیں ...... تم نے کہا تھا کہ اگلی بار جب تم آؤ گے تو میرے خط مجھے واپس کر دو گے اور یہ کہ میں بھی تمہارے خطوط واپس کر دوں۔

اور ہمیشہ کی طرح صبا نے ایک اچھے قاصد کا رول ادا کرتے ہوئے ہماری صلح کروا دی تھی۔ یاد ہے نا تمہیں وہ نظم جو میں نے بھیجی تھی۔

'صبا آنچل میں اپنے آج تم کچھ پھول بھر لینا
یہ میرا آخری تحفہ بھی اس کی نظر کر دینا'

کئی صفحات پر مشتمل اس نظم میں، میں نے تمہیں لکھا تھا شہریار۔

'صبا اُس سے یہ کہہ دینا
اُسے کہنا
خدا حافظ
نہیں ٹھہرو ...... ذرا ٹھہرو
ذرا سی دیر رک جاؤ
ابھی کچھ اور کہنا ہے
بہت سی قیمتی چیزیں اُسے واپس لوٹانی ہیں
کہ اُس نے مجھ سے مانگی ہیں
بہت سے قیمتی لمحے
بہت سی پیار کی باتیں
وہ اُس کے ایک دو لیٹرز

اور آخر میں یاد ہے نا کیا لکھا تھا۔

'میرے قاصد
سنو تم آج خالی ہاتھ مت جانا
یہ سارے پھول لے جانا
یہ اُس کی نذر کر دینا
اُسے کچھ اور مت کہنا
جو ممکن ہو تو میرے بدگماں کو
تم محبت سے سنا لینا'

اور جواب میں تم نے صبا کو قاصد بنا کر بہت خوبصورت نظم لکھی تھی اور خود بخود ہی صلح ہو گئی تھی۔ اور اگلی بار جب تم آئے تھے تو وہی وارفتگی لئے، وہی پہلے کی طرح محبتیں لٹائے ہوئے۔ تمہیں جب کبھی مجھ پر بہت ٹوٹ کر پیار آتا تھا تو یاد ہے تم کیا کہتے تھے مجھے۔

"بتاؤ میرا سونیا کون ہے؟ ...... میرا مٹھو کون ہے؟ ...... میرا کوجا کون ہے؟"

ایسے میں تمہاری آنکھوں میں چاہت کے اتنے رنگ ہوتے اور تمہارے لہجے میں اتنی مٹھاس، اتنی شیرینی، اتنی محبت ہوتی کہ میں خود کو اس دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی

میرا دل چاہتا شہریار! کہ تم یونہی نگاہوں میں اتنی چاہت لئے مجھے تکتے رہو اور میری زندگی اسی لمحے ختم ہو جائے۔

پتہ نہیں شہریار! سب محبت کرنے والے اسی طرح محبت کرتے ہیں یا پھر تمہاری محبت کے انداز اور رنگ سب سے جدا تھے۔ تم اتنی بے تحاشا محبت کرنے والے تھے مجھ سے پھر بھی نہ جانے کیوں ان دنوں کبھی کبھی لمحہ بھر کے لئے میرا یقین متزلزل ہو جاتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے میں بے وقوف بنائی گئی ہوں ...... جیسے مجھ سے دھوکا ہوا ہو۔ اگرچہ یہ خیال لمحہ بھر کے لئے ہی آتا تھا۔ لیکن مجھے یوں لگتا جیسے میرا دل کسی نے چیر دیا ہو، کسی نے مجھے ...... میرے دل کو پاؤں تلے مسل ڈالا ہو۔

وہ اذیت جو اُس سمے میں محسوس کرتی تھی شہریار! تم شاید اس کا اندازہ نہ کر سکو۔ یوں جیسے کوئی کند چھری سے دھیرے دھیرے ذبح کر رہا ہو۔ میرا دم گھٹنے لگتا تھا اور سانس الجھنے لگتا۔

میں نے تم سے کہا تھا نا شہریار! اگر کسی روز مجھے علم ہوا کہ تمہاری محبت جھوٹی تھی تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ مجھے لگتا تھا جیسے وہ آخری دن آ گیا ہو۔

وہ محبت جس پر ایمان ہے کیا وہ جھوٹ موٹ ہے؟

لمحہ بھر کی وہ اذیت مجھے ادھ موا کر دیتی تھی شہریار!

''کیا بات ہے دُری! کیا تم بیمار ہو؟''

مجھے چپ چاپ دیکھ کر تم نے پوچھا تھا اور میں نے بتایا تھا۔ تب تم یک دم چپ کر گئے تھے۔

''تم نے ایسا سوچا دُری ...... میری محبت میں کہاں کمی ہے؟'' تم بہت (ہرٹ) HURT ہوئے تھے۔ میں نے انجانے میں تمہیں دکھ دیا تھا۔ حالانکہ میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔

تم اٹھ کر چلے گئے تھے ...... پھر دو تین روز جو تم یہاں رہے تھے تم نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ جاتے ہوئے تم نے خدا حافظ کہا تو میں رو پڑی تھی۔ مسلسل تین دن رو رو کر میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ تمہیں ہرٹ کر کے میں نے ایک لمحہ بھی سکون نہیں پایا تھا۔ اس روز مجھے احساس ہوا تھا کہ تمہیں خوش دیکھنا میری زندگی کی اولین خواہش ہے اور تمہاری معمولی سی رنجش میری برداشت سے باہر ہے۔

میں بہت شرمندہ تھی۔ بہت نادم تھی کہ میں نے تمہاری محبت پر شک کیا تھا۔ حالانکہ یہ شک تم پر نہیں تھا ...... شاید اپنے آپ پر تھا۔ اپنی کم مائیگی کا ...... اپنے کم صورت ہونے کا ...... عمر کے ان دلکش سالوں کا جو گزر گئے تھے، احساس تھا جو مجھے لمحہ بھر کے لئے بے اعتبار کر دیتا تھا۔ لیکن اُس روز تمہارے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بے تحاشا روتے ہوئے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا شہریار! کہ میرا یقین تم پر کبھی نہیں ٹوٹے گا۔

بس تم مجھے کبھی بے یقین مت کرنا۔

اور تم نے خراب موڈ کے باوجود میرے آنسو پونچھے تھے اور جاتے ہوئے میرے سر پر پیار کیا تھا۔

''اچھا اب رونا نہیں ...... اور مجھے اچھے اچھے خط لکھنا۔''

اور میں اپنے اس وعدے پر ہمیشہ قائم رہی شہریار!

میرا یقین تمہاری محبت پر ہمیشہ قائم رہا اور کبھی متزلزل نہیں ہوا۔

کبھی ایک لمحے کے لئے بھی میں نے یہ نہیں سوچا شہریار! کہ تمہاری محبت میں کہیں

کوئی کھوٹ تھا، کوئی جھوٹ تھا۔ میں نے ہمیشہ اُسے سچ جانا شہریار! اُس وقت بھی یہ یقین نہیں ٹوٹا شہریار جب انکل ہاشمی کی بیوی نے یونہی بائی دا وے تمہارا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ تمہارا نکاح ہو چکا ہے اپنی خالہ زاد سے اور تم کسی وجہ سے شادی میں تاخیر کر رہے ہو۔ شاید تم اور تمہاری امی چاہتی ہیں کہ پہلے تم بہنوں کی ذمے داریوں سے فارغ ہو جاؤ۔ شاید وہ ڈرتی ہیں کہ تم بھی اپنے بڑے بھائیوں کی طرح شادی کے بعد ان ذمے داریوں سے بھاگ نہ جاؤ۔

تب بھی میں نے شہریار! تم سے یہ تک نہ پوچھا کہ تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں چھپائی ...... تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری منگنی بھی نہیں ہوئی ...... بس بات ہوئی ہے۔

میں بے اعتبار نہیں ہوئی تھی شہریار! ہاں مجھے دکھ ضرور ہوا تھا کہ تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ تمہیں مجھ سے کیا خوف تھا شہریار! میں تو بہت بے ضرر سی لڑکی تھی۔ اور میں نے تو پہلے ہی لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

پھر بھی ...... میں نے تم سے گلہ نہیں کیا شہریار! اور میرا تو کوئی ارادہ بھی نہیں تھا تم سے کچھ کہنے کا۔ لیکن میں نے دل میں ضرور سوچ لیا تھا، تمہیں کہوں گی کہ اب رخصتی کروا لو۔

لیکن اُس روز جب میں نے تمہیں انکل ہاشمی اور ان کی مسز کی آمد کے متعلق بتایا تو جانے کیوں تم کھٹک سے گئے تھے۔

''میرے متعلق انہوں نے کوئی بات کی تھی؟''

''ہوں......''

''کیا......؟''

''کیوں بتاؤں؟''

میں تو تمہیں یونہی تنگ کر رہی تھی شہریار! ورنہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں مجھ سے شرمندگی ہو یا تم ندامت محسوس کرو۔ لیکن تم نے مجھے اپنی زندگی کی قسم دے ڈالی تھی اور میں نے بتا دیا تھا تو تم نے مجھ سے سوری کر لیا تھا۔

''ہاں ...... یہ بات میں نے تمہیں نہیں بتائی تھی پارو! لیکن میں نے تمہیں لکھا تھا نا کہ میں وہ بھیڑ ہوں جسے بہت پہلے قربان گاہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو۔''

تم بار بار معذرت کر رہے تھے۔

میں نے منع کیا۔

"تم کس بات کی معذرت کر رہے ہو شہریار! ایسا مت کرو...... مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ تمہارا نکاح نہ بھی ہوا ہوتا تب بھی کیا فرق پڑ جاتا۔ پہلے نہیں ہوا تھا تو اب ہو جاتا۔"

تم نے پتہ نہیں میری بات کو سمجھا یا نہیں۔ میں صحیح طرح سے اپنی بات درحقیقت تمہارے سامنے ایکسپلین نہیں کر سکی تھی کہ تم نے یک دم کہا۔

"ذری! مجھے چھوڑ دو۔ اور سمجھو کہ آج ہم آخری بار مل رہے ہیں۔"

میں نے حیرت سے تمہیں دیکھا۔ میں نے تو کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔

تم ہمیشہ کتنی آسانی سے یہ کہہ دیتے تھے۔ شاید تمہارے لئے یہ مشکل نہیں تھا۔ شاید تم ہمیشہ دل میں یہ سوچتے رہتے تھے کہ ہمیں ایک دن بچھڑنا ہے۔

شاید مینٹلی یعنی ذہنی طور پر تم اس بات کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ جبھی تو ذرا سی ناراضگی پر تم فوراً چھوڑ دینے کی بات کرنے لگتے تھے۔

میں تمہاری منزل کبھی نہیں رہی تھی شہریار!

تم مہرین سے محبت کرتے تھے...... وہ تمہاری اوّلین محبت ہی نہیں، تمہاری چاہت بھی تھی۔ تم نے اس کے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ تمہاری منزل تھی۔ لیکن پھر یہ خواب تمہاری آنکھوں سے چھین لئے گئے اور تمہارے لئے ایک اور منزل کی نشاندہی کی گئی۔ نشاندہی ہی نہیں کی گئی بلکہ تمہیں پابند کر دیا گیا تھا کہ یہی تمہاری منزل ہے اور اسی تک تمہیں پہنچنا ہے۔

تمہارا راستہ طویل بھی تھا شہریار! اور بے رنگ بھی۔

کوئی آرزو اور اشتیاق کی تتلی تمہاری مٹھی میں بند نہ تھی...... کسی تمنا کا جگنو تمہاری آنکھوں میں نہیں جھلملاتا تھا...... کوئی خوشبو تمہیں منزل کی طرف جانے پر اُکساتی نہ تھی...... کوئی جذبۂ شوق تمہارے قدموں کی رفتار کو تیز نہیں کرتا تھا۔

تم چل تو رہے تھے لیکن تھکن تمہاری رگوں میں اُتر گئی تھی۔

تم بار بار مُڑ کر پیچھے دیکھتے تھے...... بہت پیچھے...... جب تمہاری مٹھی میں آرزوؤں کی تتلیاں اور تمناؤں کے جگنو بند تھے...... جب تمہاری آنکھوں میں مستقبل کے حسین رنگ خواب تھے...... جب ایک الوہی خوشبو، محبت کی خوشبو تمہارے ہمراہ تھی...... تم کسی معجزے کے منتظر تھے۔ حالانکہ تم جانتے تھے کہ اس دور میں معجزے نہیں ہوتے۔ اس

لئے تم چل رہے تھے۔ حالانکہ تمہارے قدم تھکن سے نڈھال تھے۔

ایسے میں بے آب و گیاہ راستے پر ٹھنڈے میٹھے پانیوں والا چشمہ راستے میں آ گیا تو تم رُک گئے۔

راہ چلتے ہوئے کوئی مسافر کسی شجرِ سایہ دار تلے بیٹھ جائے تو شجرِ سایہ دار اس کی منزل تو نہیں ہوتا نا شہریار! چاہے وہ اسے کتنی ہی ٹھنڈک، کتنا ہی سکون اور کتنی ہی چھاؤں مہیا کیوں نہ کرے، وہ اس کی منزل نہیں ہو سکتا شہریار! چاہے وہ کتنی ہی دیر ٹھہرے، اسے آگے جانا تو ہوتا ہے نا۔

میں تمہارے لئے شجرِ سایہ دار تو تھی شہریار! لیکن منزل ہرگز نہیں تھی۔ اور یہ وہ حقیقت تھی جس کا مجھے علم بہت پہلے سے تھا...... لیکن یہ یقین مجھے ہمیشہ تقویت دیتا رہا شہریار! کہ تپتی دھوپ اور جلتی زمین پر چلنے والا مسافر اُس شجرِ سایہ دار کو کبھی نہیں بھولتا جس نے اسے سایہ مہیا کیا اور ٹھنڈک پہنچائی۔

تم چھوڑ دینے کی بات کر رہے تھے، صرف اتنی سی بات پر کہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ تم نے اسے چھپایا تھا۔ شاید اس میں تمہاری کوئی مصلحت رہی ہو گی۔ شاید تمہیں یہ خوف رہا ہو کہ یہ جان لینے کے بعد میرے دل سے تمہاری محبت ختم ہو جائے گی۔ حالانکہ حقیقی محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔

میں اچھے دوستوں کی طرح تم سے جدا ہونا چاہتی تھی لیکن تم ناراض ہو کر جا رہے تھے، کیوں؟ میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا تھا۔

آنٹی ہاشمی نے ایک بات بتائی تھی اور تمہارے اصرار پر میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔ نہ میں نے کوئی سوال کیا نہ کوئی گلہ۔ میں نے تو اپنے دل کو غنی کر لیا تھا شہریار! ہر طرح کی طلب سے غنی۔

شاید یہ بھی بے بسی کی انتہا ہوتی ہے۔ ایسا موڑ جہاں آدمی بے انتہا مایوس ہو کر خود کو غنی کر لیتا ہے۔ محبتوں سے غنی...... نفرتوں سے غنی۔

میرے جذبوں میں ہمیشہ بہت شدت رہی ہے شہریار! میں نے جسے چاہا، ٹوٹ کر چاہا اور جسے چاہا اس کے لئے اپنا آپ فنا کر دیا۔

رفاقت بھائی، بھیا، بھائی جان، آپی، ماں جی۔

میں نے سب سے ٹوٹ کر محبت کی شہریار! اور ان سب کے لئے اپنا آپ فنا کر

دیا۔ بغیر انہیں احساس دلائے کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ بغیر کسی صلے یا غرض کے۔

میں نے زندگی میں کبھی کسی سے نفرت نہیں کی۔ لیکن میں سوچتی ہوں شہریار! اگر مجھے کسی سے نفرت ہوتی تو شاید وہ بھی اتنی ہی شدید ہوتی ...... پتہ نہیں میرے جذبوں میں اتنی شدت کیوں ہے؟ حالانکہ میں بہت نرم خو اور نرم دل لڑکی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھنٹوں سوچ سوچ کر کڑھنے والی لڑکی، بہت کمزور اور کم ہمت۔

میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا شہریار!

اس لئے نہیں کہ مجھے تمہارے نکاح کا علم ہوا تھا۔ یہ تو مجھے دو ہفتوں سے معلوم تھا۔

اس لئے کہ تمہارا رویہ بہت عجیب تھا۔

تم مجھے چھوڑ دینے کی بات کر رہے تھے ...... ہمیشہ کے لئے مجھ سے رخصت ہو کر چلے گئے تھے۔ لیکن نہ تمہاری آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ ہی تمہارے لہجے میں جدائی کا کرب تھا۔

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی بے یقین نہیں ہوں گی۔ سو میں نے خود کو بے یقین نہیں ہونے دیا۔

میں نے تمہاری محبت پر اپنے یقین کو پختہ رکھا۔

محبت کر کے اسے کھو دینا، بالکل محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔ میں نے خود کو بار بار یقین دلایا کہ میں بہت خوش قسمت ہوں اور بہت خوش نصیب کہ مجھے تمہاری محبت ملی۔

اور ساری بات یہ ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب مجھے اور تمہیں بچھڑنا تھا ...... بس فرق یہ پڑا ہے کہ ہم اس طرح نہیں بچھڑ رہے جیسے میں نے سوچا تھا۔ اچھے دوستوں کی طرح خدا حافظ کہہ کر۔

تم کچھ ناراض ہو گئے ہو اور مجھے ناراضگی کی وجہ بھی نہیں معلوم۔ میں نے خود کو بہت بہلایا، بہت تسلیاں دیں ...... لیکن میرے اندر اندھیرا سا پھیلتا جا رہا تھا اور اس اندھیرے کو تمہارے یکے بعد دیگرے ملنے والے دو خطوط نے بھی کم نہیں کیا تھا۔ تم نے لکھا تھا۔

'صبا میرے گھر کے دریچوں سے لگ کر یہ کیا سوچتی ہو
کیا دیکھتی ہو
میرے خالی گھر میں کہیں قہقہے اب نہیں گونجتے'

اور دوسرے خط میں تم نے لکھا تھا۔

'صبا کچھ کہو نا
اُس شہر سے میرا جو بھی پیغام آیا
مجھ کو جلدی سناؤ
میرا پیغام سن کر کس قدر خوش ہوا وہ
اس کی آنکھوں میں کتنے ستارے روشن تھے
اس کے چہرے پر کتنا نکھار آ گیا تھا'

مگر پتہ نہیں کیا بات تھی میرے اندر پھیلتا ہوا سناٹا اور اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا ...... شاید کسی دن یہ اندھیرا اتنا بڑھ جائے کہ اس میں سب کچھ چھپ جائے۔

میں نے تمہیں خط بھی لکھا تھا، تم سے باتیں بھی کی تھیں، تمہاری باتوں کو سراہا بھی تھا۔ لطیف کی بہن اور ڈاکٹر صاحب کو بھی یاد کیا تھا ...... ہاتھی اور چوہے کا ذکر بھی آیا تھا ...... لیکن میرے اندر سے جیسے زندگی ہلکے ہلکے مر رہی تھی۔

میں ہنس رہی تھی لیکن مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ ہنسی میری نہ ہو ...... یہ آواز میری نہ ہو ...... شاید کسی آنے والے لمحے کا مجھے ادراک ہو گیا تھا جبھی تو ہنسی ہونٹوں پر آتے آتے بجھ سی جاتی تھی۔

تمہارا کام اسلام آباد میں ختم ہو گیا تھا۔ تم واپس آ گئے تھے اور خوش تھے ...... خوش تو میں بھی تھی شہریار ...... میں تو اپنی زندگی کا ہر وہ لمحہ تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی تھی جو اختیار میں تھا۔ لیکن آنے والے لمحے کا خوف مجھے پوری طرح خوش نہیں ہونے دیتا تھا۔

میں چاہتی تھی شہریار کہ اب تم اپنا گھر بسا لو۔ اُس معصوم لڑکی کا کیا قصور ہے جسے تم انتظار کی صلیب پر چڑھا آئے ہو

''ہاں ...... اُس کا کیا قصور ہے ...... لیکن کبھی کبھی دوسروں کے گناہوں کی سزا دوسروں کو بھی مل جاتی ہے۔ لیکن اسے تو کوئی سزا نہیں ملی پارو! جلد یا بدیر اس کا انتظار ختم ہو جائے گا۔ یہ سزا تو میں نے اپنے آپ کو دی ہے۔''

''کبھی کبھی مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے شہریار! کہ تمہاری فیملی والے تمہیں مجبور کیوں نہیں کرتے؟ کہتے کیوں نہیں؟ حالانکہ جن دنوں تم بیمار تھے تو میں سوچتی تھی امی......''

''جناب! ہم ابھی ینگ ہیں۔ بوڑھے تو نہیں ہو گئے۔ ہو جائے گی شادی بھی۔''

لیکن میری خواہش تھی کہ یہ شادی جلد ہو جائے۔

ہے نا عجیب بات۔

اور میں تو ہوں ہی عجیب ہمیشہ سے ...... میں تو وہ بات سوچتی ہوں جو دوسرے نہیں سوچتے۔ جتنا نقصان میں نے خود اپنے آپ کو پہنچایا ہے اتنا شاید دوسروں نے مجھے نہیں پہنچایا۔

میں تمہارے لئے جو بات سوچتی تھی، شاید تمہارے گھر والے نہیں سوچ رہے تھے۔

تم نے ایک دن باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ تمہارا آپریشن اس لئے ملتوی نہیں ہوا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس لئے ہوا تھا کہ ڈاکٹروں کے خیال کے مطابق یہ ممکن نہیں تھا۔

میں چاہتی تھی شہریار! کہ اب تم ایک لحہ ضائع کئے بغیر روبی کو گھر لے آؤ اور زندگی کے ایک ایک لمحے سے انجوائے کرو۔

تمہارے بچے ہوں ...... تمہارے نام لیوا ...... تمہارا عکس ...... تمہارے وجود کا حصہ۔

میں ہر روز تم سے اصرار کرتی تھی کہ تم اپنے گھر والوں سے خود کیوں نہیں کہتے؟ اگر نہیں احساس نہیں ہے تو تم انہیں احساس دلاؤ کہ اب رخصتی ہو جانی چاہئے۔

''تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے دُری؟''

''بس ہے نا۔''

''مجھے خود سے دور کر دینا چاہتی ہو؟''

''نہیں ...... تم ہمیشہ میرے قریب رہو گے۔''

''میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے نایاب! میں بہت سوچتا ہوں مگر اپنے آپ کو رضامند نہیں کر پاتا۔''

''کوشش تو کریں پلیز۔ یہی وقت ہے شہریار! پھر کیا بوڑھے ہو کر شادی کریں گے؟''

''مجھے پتہ تھا ...... مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم مجھے مجبور کرو گی۔ اسی لئے تو میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا دُری کہ میرا نکاح ہو چکا ہے۔''

''میں مجبور نہیں کر رہی شہریار! اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہوں اور میری اس خواہش کا تعلق تمہاری ذات کی خوشیوں سے ہے اور میری خوشی یہ ہے کہ تم خوش ہو گے تو میں بھی خوش رہوں گی۔''

''تمہارے پاس کیا ضمانت ہے نایاب کہ میں خوش رہوں گا؟''

''مجھے یقین ہے شہریار! کہ ایسا ہی ہو گا۔ تم فطرتاً محبت کرنے والے آدمی ہو۔

رفاقتیں، محبتوں کی بنیاد ہوا کرتی ہیں دوست۔ وہ دن رات تمہارے ساتھ ہو گی۔ تمہارے کپڑے استری کرے گی۔ تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھے گی۔ تمہاری طبیعت خراب ہو گی تو راتوں کو تمہارے لئے جاگے گی ...... تمہارے بچوں کی نیپیاں چینج کرے گی۔ رفاقت کی کھڈی پر محبت کا تانا بانا بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے شہریار! تم اُس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ پھر جب وہ بہت خوبصورت بھی ہے شہریار اور بہت اچھی بھی۔''

''پلیز دُری! چینج دی ٹاپک۔''

''ٹھیک ہے ...... لیکن میں اس موضوع پر ایک بات کروں گی پھر ...... پھر کبھی سہی۔''

اور میں کبھی کبھار باتوں باتوں میں تم سے ضرور ذکر کرتی اور اس حقیقت کا احساس دلاتی جس سے تم نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی تمہیں بڑی حیرت ہوتی تھی شہریار! تمہاری آنکھوں میں حیرت کے رنگ بڑے واضح اور گہرے ہوتے۔

شاید تم سمجھ گئے ہو گے شہریار! کہ میری محبت میں کہیں کوئی کمی ہے جو میں اتنی آسانی سے، اتنے آرام اور سکون سے بغیر جذباتی ہوئے تمہیں ایک دوسری لڑکی کا ہونے کو کہتی ہوں تو ایسا نہیں تھا شہریار! میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ میں اپنی محبتوں میں بہت اٹل اور مضبوط تھی۔ اور تم سے یہ سب کہنا خود سے جدائی کے لئے تیار کرنا آسان نہیں تھا۔ یہ تو اپنی ذات کی نفی کرنے کا وہ ہنر تھا شہریار! جو برسوں پہلے میں نے سیکھا تھا۔

جب رفاقت بھائی اچانک دنیا چھوڑ گئے تھے۔

اور منزہ بھابھی نے شادی کر لی تھی۔

آپا اپنے گھر میں تھیں ...... میرے سامنے ٹیپو، مائی، سارہ اور نومی تھے۔ اُمید بھری نظروں سے مجھے تکتے ہوئے۔

اور یہ ہنر ...... یہ اپنی ذات کو نفی کر دینے کا ہنر بعد میں بھی میرے کام آیا شہریار! جب ڈاکٹر شیر دل کا پرپوزل آیا تھا۔

بابا اور ماں جی بیمار تھے اور اکیلے تھے ...... آپا کینیڈا میں تھیں۔ اور بھیا اور بھائی جان کو ان کی بیویاں اغوا کر کے لے گئی تھیں ...... سو میں نے بھی اپنی ذات کی نفی کر دی تھی۔ میں اگر چاہتی شہریار! تو تمہیں روک سکتی تھی۔ تمہیں اپنا بنا سکتی تھی۔

عورت کی محبت بڑی پاور فل ہوتی ہے شہریار ...... پھر اگر مرد بھی اس عورت سے محبت کرتا ہو تو عورت کے لئے اس سے اپنی بات منوانا مشکل نہیں ہوتا۔

لیکن میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا کہ ہماری محبت دوسروں کے لئے عذاب بنے۔ مجھے تو روبی پر ترس آتا تھا شہریار! اس سے ہمدردی تھی ...... میرا دل اُس کے لئے کڑھتا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی یقین تھا کہ جلد یا بدیر بہر حال وہ سرخرو ہوگی۔ اور اس کے لئے میں نے طے کر رکھا تھا کہ تمہاری شادی کے بعد مجھے تم سے نہیں ملنا ...... تم سے بات نہیں کرنی۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری میرڈ لائف ڈسٹرب ہو۔ تمہارا دھیان میری طرف رہے اور تم روبی پر توجہ نہ دے سکو۔

اور تم کہتے تھے کہ اگر تم نے ایسا کچھ کیا تو میں خودکشی کرلوں گا۔ مر جاؤں گا ...... میں اندر سے بالکل ٹوٹ چکا ہوں۔ مجھے اتنا مت آزمانا ڈری کہ میں بکھر جاؤں اور تم ہاتھ ملتی رہ جاؤ۔ مجھے تو اپنا آپ ریت کی بھربھری دیوار لگتا ہے جسے تمہارے وجود نے سہارا دے رکھا ہے۔ تم نے اپنا آپ الگ کر لیا تو میں ڈھے جاؤں گا۔

اور میں سوچا کرتی تھی شہریار! کہ ایسا کوئی راستہ ہو کہ تم میری جدائی کو برداشت کرسکو۔ تم نے ایک بار مجھے اپنے دوست روشن کے متعلق بتاتے ہوئے کہا تھا کہ جو لڑکیاں بے وفا ہوتی ہیں انہیں مرد بہت جلد بھول جاتے ہیں چاہے وہ ان سے کتنی ہی شدید محبت کیوں نہ کرتے ہوں۔ روشن نے بھی نیلی کو کبھی یاد نہیں کیا۔

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک روز میں نے تم سے پوچھا تھا۔

''شہریار! اگر تمہیں پتہ چلے کہ میں تمہارے ساتھ مخلص نہیں تھی تو ......؟''

''تو ......'' تم ہولے سے ہنسے تھے۔ ''تم اپنی زبان سے بھی کہو گی کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں اور یہ کہ کسی اور سے محبت کرتی ہو تو میں تمہاری بات پر یقین نہیں کروں گا۔''

یہ کیسا یقین تھا تمہارا ...... اور کیسی محبت تھی۔

میرا دل فخر سے بھر گیا۔ مجھے تمہاری محبت پر بڑا فخر، بڑا غرور محسوس ہوا ...... تب میں نے تم سے کہا تھا۔

''اگر میں نہ رہوں تب تو تمہارے لئے زندگی گزارنا سہل ہو جائے گا نا ...... اور تم روبی کے ساتھ مطمئن زندگی گزار سکو گے؟

''اور اگر تم نے ایسا کچھ کیا تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

اور پتہ ہے شہریار! یہاں بھی ہماری سوچ کے رنگ مل گئے تھے۔ تم نے مجھے بتایا تھا نا کہ جب تم بیمار تھے اور واشنگٹن میں تھے، کئی بار تم نے سوچا تھا کہ مجھے خط لکھ دو کہ تمہاری محبت جھوٹ تھی اور تم نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا، سب غلط تھا اور یہ کہ تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی ...... اور تم صرف وقت گزار رہے تھے تاکہ اگر تمہیں کچھ ہو جائے تو میرے لئے تمہاری جدائی زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔ میں زیادہ نہ تڑپوں۔

ایسی باتیں تو کہانیوں میں ہوتی ہیں شہریار!

لیکن شاید کہانیاں بھی حقیقتوں سے جنم لیتی ہیں شہریار!

''سنو ڈری! تم مجھے اپنے سے دور تو کر رہی ہو لیکن کیا خوش رہ سکو گی؟ میرے بغیر مشکل نہیں ہو جائے گی تمہارے لئے؟''

ہاں ...... یہ سب آسان تو نہیں ہوگا۔ میں جانتی تھی ...... دو سالوں سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا ہمیں ...... تقریباً ہر روز ہی بات ہوتی تھی۔

وہ دن جو تم نے کراچی اور واشنگٹن میں گزارے ...... وہ دن جب تمہیں ہیڈ آفس بھیج دیا گیا ...... اور وہ دن جب تم ویک اینڈ پر گھر جاتے تھے ...... وہ دن کتنی مشکل سے کٹتے تھے ...... اتنے لمبے دن اور اتنی لمبی راتیں۔

لگتا تھا ایک ایک دن کئی کئی صدیوں پر محیط ہو۔ لیکن حقائق اپنی جگہ بہت تلخ ہوتے ہیں اور انہیں ان کی تمام تر تلخی سمیت ہمیں ہر حال میں قبول ہی کرنا پڑتا ہے ...... سو میں نے تم سے کہا تھا۔

''ہاں شہری! مشکل تو بہت ہوگا۔ لیکن تمہیں تمہارے گھر میں اپنے بچوں میں گھرا دیکھ کر میں کتنی خوش ہوں گی شہریار! تمہارے بڑے سے گھر کے بڑے سے آنگن میں علی اور زریاب کو اپنی چھوٹی چھوٹی سائیکلیں دوڑاتے ہوئے دیکھ کر۔''

تمہیں یاد ہے نا شہریار! ہمارے درمیان یہ نام پہلے ہی طے پا گئے تھے۔

علی شہریار اور زریاب شہریار۔

کتنی خراب عادت تھی ہماری انٹینا پہلے لگانے کی۔ حالانکہ ٹی وی تو ہماری قوتِ خرید میں تھا ہی۔

کتنے پاگل تھے ہم شہریار ......

پتہ نہیں سارے محبت کرنے والے یونہی پاگل پن کی باتیں کرتے ہیں یا صرف ہم

ایسے تھے۔

کیسی انسانوی سی بات تھی ...... کتنی عجیب شہریار! کہ میں ...... میں جو تم سے محبت کرتی تھی، مجبور کر رہی تھی کہ تم کسی اور کو شریک زندگی بنالو۔ اور تم ہار رہے تھے شہریار! کیونکہ تمہاری ہر طرح کی نارضامندی کے باوجود یہ تو ہونا ہی تھا ...... بلکہ ہو چکا تھا۔ بہت سال پہلے تم ایک معاہدے پر دستخط کر چکے تھے ...... خدا اور رسول ﷺ کو گواہ بنا کر۔

تیمور بھائی آئے ہوئے تھے اور گھر میں یہ ذکر بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ اب تمہیں اپنی ضد چھوڑ دینی چاہئے۔ تم اپ سیٹ تھے لیکن میں تمہیں حوصلہ دیتی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا ہولے ہولے ...... تھوڑا وقت لگے گا مگر تم سیٹ ہو جاؤ گے۔ اور دیکھنا ہم تمہیں یاد بھی نہیں آئیں گے۔''

''غلط کہتی ہو تم ...... میں تمہیں بھولوں گا ہی نہیں ...... بھول ہی نہیں سکتا۔ جینا مشکل ہو جائے گا۔ تمہاری ہنسی، تمہاری شرارتیں، تمہارا لہجہ، تمہاری آواز سب مجھے بہت تڑپائیں گی پارو! تم نے مجھے اپنا عادی بنا دیا ہے۔''

تمہارا تبادلہ واپس لاہور ہو گیا تھا لیکن تم جان بوجھ کر نہیں جا رہے تھے۔

''وہاں میرا دم گھٹتا ہے ڈری! ہر وقت ایک ہی ذکر ...... ایک ہی بات ......''

اور پھر تم چلے گئے۔ بہر حال تمہیں جانا تو تھا نا۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے تم ہمیشہ کے لئے جا رہے ہو اور آج کے بعد ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ کبھی ایک دوسرے سے بات نہ کر سکیں گے ...... کبھی ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں گے۔

میرا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا ...... ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا ...... لیکن میں مسکرا رہی تھی ......

''میں آپ کی شادی پر آؤں گی۔''

''نہیں ...... مت آنا۔''

تم پتہ نہیں کس پر خفا تھے۔ مجھ پر یا اپنے آپ پر۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا تھا شہریار ...... یہ سب تو پہلے سے طے تھا۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اٹریکٹ نہیں کیا تھا، اپنا اسیر نہیں بنایا تھا۔ یہ سب خود بخود ہوا تھا۔ جانتے بوجھتے ہم نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں ...... اور تین سال کتنی جلدی گزر گئے تھے ...... بس اتنا مختصر ساتھ تھا ہمارا۔

کیا تمہیں مجھے صرف اتنے ہی عرصے کے لئے ملنا تھا شہریار؟

کاش یہ تین سال اتنے طویل ہو جاتے کہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتے۔ مگر وقت

کب ہماری خواہشوں کا پابند ہوا ہے۔

وہ تو گزر رہا تھا۔

تم پریشان تھے اور میں کہاں خوش تھی۔ صبح شام تمہاری خوشی، تمہارے سکون اور تمہاری زندگی کے لئے دعائیں مانگتے میری زبان خشک ہو جاتی تھی۔ پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے میری دعائیں عرش سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ رہی ہوں۔

تم لکھتے۔

''جانو ...... یوں لگتا ہے جیسے یہ سب ہانکا لگانے والے ہیں اور مجھے گھیر گھار کر شکاری کی طرف لے جا رہے ہیں اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے آگے بھاگا جا رہا ہوں اور وہ وقت قریب آنے والا ہے جب میں اچانک شکاری کے سامنے کھڑا ہوں گا اور واپس لوٹنے اور بچنے کا کوئی راستہ نہیں رہے گا ...... پارو! مجھے بچالو۔''

مگر میں کیا کرتی شہریار! میں تو تم سے زیادہ بے بس تھی۔ اپنے اوپر جبر کر کے، اپنے آنسوؤں کو منجمد کر کے میں ہنستی، تمہیں مشورہ دیتی کہ اب تمہیں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

''کیسی لڑکی ہو تم؟ اپنی آرزوؤں کا قتل اتنا ہی آسان ہوتا ہے جتنی آسانی سے تم کر رہی ہو؟''

اور تمہیں کیا خبر تھی شہریار کہ اپنی آرزوؤں کو قتل کرنا اتنا آسان ہرگز نہیں ہوتا ...... پہلے خود اپنے آپ کو قتل کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر ......

''مجھے ایک دفعہ آواز تو دو ...... پکارو تو سہی ...... مجھے ایک دفعہ کہو تو سہی میں سب کچھ چھوڑ کر چلا آؤں گا۔''

لیکن میں جو جانتی تھی وہ تم نہیں جانتے تھے شہریار! اپنوں کو چھوڑنا جن سے خون کے رشتے جڑے ہوتے ہیں اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تم سب کو چھوڑ بھی دیتے پھر بھی تمہارا دل وہیں اٹکا رہتا۔ ایک محبت کو چھوڑ کر بہت ساری محبتوں کو پالینا اچھا تھا یا ایک محبت چھوڑ کر ساری محبتوں کو چھوڑنا؟

یہ سودا مہنگا تو نہیں تھا شہریار! مگر تم ابھی سمجھ نہیں رہے تھے۔

''دیکھو شہریار! اگر کہیں کوئی روزن، کوئی درز ہوتی نا تو میں تم سے کہتی، بھلے تم ساری زندگی انتظار کرتے رہو لیکن جب کہیں کوئی روزن، کوئی درز نہیں تو پھر لا حاصل انتظار سے فائدہ ...... تمہیں آج بھی سرنڈر کرنا ہے اور دس سال بعد بھی۔ تو پھر وقت

کیوں گنوا رہے ہو؟ کوئی معمولی سا بھی روزن اگر ہو تو راستہ بننے کا امکان ہوتا ہے شہریار! مگر یہاں تو ننھی سی درز بھی نہیں ہے۔ میں کس امید پر تمہیں روکتی شہریار؟ سو میں تمہیں وقتاً فوقتاً ٹوکتی رہی...... حوصلہ دیتی رہی۔"

اور پھر ایک دن تمہاری شادی کا کارڈ آ گیا اور ساتھ ہی تم نے ایک نظم بھیجی تھی۔

'صبا اُس سے کہنا
کھلے پانیوں کے سفر کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی
میری کشتی کے پتوار ساحل پہ رکھ کے
تمہی نے کہا تھا
بادبان کھول کر تم ہواؤں کے رُخ پہ سفر کرتے رہنا
کھلے پانیوں کے سفر کی مجھے کوئی عادت نہیں تھی
میں ماہ و سال کی گردش کے بھنور سے
نکلنے کے گُر سے نہیں آشنا تھا'

اور اُس روز میں کتنا روئی تھی شہریار! صبح سے شام تک میں نے کتنی بار تمہاری یہ نظم پڑھی تھی اور کتنی بار تمہاری شادی کا کارڈ دیکھا تھا۔ لفظ میری نظروں کے سامنے دھندلا گئے تھے مگر پھر بھی بار بار پڑھتی رہی۔

'صبا اُس سے کہنا
اگر ہو سکے تو کسی شام تم بھی
ہواؤں کے رُخ پر میری سمت آنا
مجھے کھوجنا تم
اور کہیں جو ہواؤں کے رُخ پہ
کسی راستے پہ بھنور کوئی پاؤ
تو پورے یقین سے
اپنے ہاتھوں سے کچھ پھول ڈال دینا بھنور میں
کہ میں اُس بھنور کی تہوں میں
خوشبوؤں کا تیری
آج بھی منتظر ہوں

رات کو جب میں جلتی آنکھوں کے ساتھ بستر پر لیٹی تو مجھے خیال آیا کہ میں کتنی بے

حوصلہ ہوں اور کتنی کم ہمت۔

تمہیں آج یا کل مجھ سے دور تو ہونا تھا۔

اور اس وقت تو تمہیں میری ضرورت تھی...... اور میں......

تب میں نے تمہیں خط لکھا تھا...... فون کیا تھا اور تم سے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ تم حیران ہو رہے تھے۔

"ڈری! تم بہت عجیب لڑکی ہو۔ تمہیں دُکھ نہیں ہو رہا؟"

"نہیں تو......" میں نے ہنسنے کی کوشش کی تھی۔ "آپ کی شادی ہو گی...... گھر بنے گا...... پیارے پیارے بچے ہوں گے۔ یاد ہے نا آپ کو...... بھول نہیں جانا...... علی اور زریاب...... اُن کے گدگدے ہاتھوں کا لمس...... اُن کی دلکش ہنسی...... اُن کی پیاری پیاری باتیں...... اُن کی محبتیں...... یہ سب بہت جلد سب کچھ بھلا دیں گی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا نایاب! یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہیں میری محبت کی شدتوں کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ تم تو سوتے جاگتے ہر لمحہ میرے تصور میں ہوتی ہو۔ پتہ نہیں تم سے بچھڑ کر، تم سے الگ ہو کر میں جی بھی سکوں گا یا نہیں۔ مجھے چھوڑ کر مت جانا پارو۔"

اور میرے آنسو میرے اندر گرتے...... قطرہ قطرہ کر کے...... اور میں تمہیں ہنسانے کی کوشش کرتی۔ تم تو جیسے ہنسنا ہی بھول گئے تھے شہریار!

"ڈری! اگر میں آ جاؤں سب کو چھوڑ کر تو میرا ساتھ دو گی؟"

تم آج بھی...... اب بھی کسی معجزے کے منتظر تھے اور بچوں جیسی باتیں کرتے تھے اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا شہریار!

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں ڈری! ایک بار...... آخری بار...... ملو گی نا؟ جی بھر کر تمہیں دیکھوں گا...... تمہاری صورت نگاہوں میں بسا لوں گا۔"

اور میرے آنسو میرے رخساروں پر بہتے رہے۔

"بولو نا...... کیا ابھی سے قطع تعلق کر لیا ہے؟ کیوں مجھے مارنے کا سامان کر رہی ہو ڈری؟"

تم جانتے تھے شہریار! بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ میں تمہاری شادی کے بعد تمہاری دنیا سے نکل جاؤں گی اور میں نے ایک بار تمہیں بتایا بھی تھا کہ میں نہیں چاہتی کہ میری ذات سے تمہاری زندگی ڈسٹرب ہو۔

"آ جاؤں پارو......؟"

''ہاں......''

میں خود بھی تمہیں، دیکھنا چاہ رہی تھی۔ آخری بار ...... جی بھر کے۔ میں نے سوچا تھا کہ تم آؤ گے تو جی بھر کے باتیں کریں گے ...... صبح سے شام تک اکٹھے رہیں گے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا شہریار! تم آئے تو ہمارے درمیان ایک کربناک خاموشی حائل ہو گئی تھی۔ تم بہت تھکے تھکے اور کمزور لگ رہے تھے۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے دُری؟'' بڑی دیر بعد تم نے پوچھا تھا۔ ''اپنا خیال کیوں نہیں رکھتی ہو؟ میرے لئے، میری خاطر۔''

تمہاری آواز میں نمی تھی۔ میں نے بہ مشکل اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا تھا۔ ''نہیں تو ...... اچھی ہوں۔''

''مجھے اچھی نہیں لگ رہی ہو۔ اور تم جانتی ہو تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی جی نہ پاؤں گا۔ ایسا کچھ مت کرنا پارو۔''

''کچھ بھی تو نہیں ہے مجھے۔ اچھی ہوں۔ آپ بہت کمزور لگ رہے ہیں۔ اپنا خیال رکھا کریں۔ میرے لئے شہریار! آپ کو کچھ ہو گیا نا تو میں بھی جی نہ پاؤں گی ...... بھلے ہم کبھی نہیں ملیں، کبھی ایک دوسرے سے بات نہیں کریں لیکن آپ ہوں اس دنیا میں کہیں پر بھی تو میں خوش ہوں۔''

ہم دونوں نے انجانے میں کیسے ایک دوسرے کو ان دیکھی زنجیروں میں پابند کر دیا تھا۔ کبھی کبھی جب بہت تھکنے لگتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ بس آنکھیں موند کر سو رہوں لیکن ڈر جاتی ہوں، مجھے کچھ ہو گیا تو کہیں تم بھی......

''پارو ...... مجھے معاف کر دینا۔'' یکا یک تمہاری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ ''میں تمہیں کوئی خوشی نہیں دے سکا۔''

''نہیں ...... آپ نے مجھے بہت خوشی دی ہے۔ اتنی محبتیں جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔''

ہمارے درمیان پھر خاموشی حائل ہو گئی۔ تم اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتے رہے اور مجھے ایسی ہی ایک آخری ملاقات یاد آ گئی جب تم مہرین سے آخری بار ملے تھے اور اس کے آنسو اُس کے رخساروں پر بہتے رہے تھے اور میرے آنسو میرے اندر گر رہے تھے۔ قطرہ قطرہ کر کے۔ میں تمہارے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

مجھے معلوم تھا شہریار! میرے آنسو تمہیں بھی کمزور کر دیں گے۔ تمہارے دل میں اتنی

سکت نہیں ہے۔ پتہ نہیں اس وقت مہرین نے کیا محسوس کیا ہو گا۔ پتہ نہیں اس کے دل پہ کیا گزری ہو گی۔ اس نے تو اپنی آنکھوں میں تمہاری رفاقت کے خواب بھی سجا رکھے تھے۔ یقیناً خوابوں کی کرچیاں اُسے لہولہان کر رہی ہوں گی۔

میری آنکھوں کو تو تم نے کوئی خواب نہیں دیا تھا شہریار! پھر بھی میری آنکھوں میں لہو بھرا تھا اور دل کو جیسے کوئی چیر رہا تھا۔

میں نے اکثر سوچا ہے شہریار! پتہ نہیں وہ تم سے زیادہ محبت کرتی تھی یا میری محبت زیادہ ہے۔ اور پتہ نہیں تم مجھ سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہو یا اس سے کم۔ لیکن تمہاری محبت کم ہے یا زیادہ، مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس محبت کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ اتنی شدید محبت ...... اور پھر وہ محبت کیسی ہو گی شہریار جو تم نے مہرین سے کی۔

شاید تمہیں بھی مہرین سے اپنی آخری ملاقات یاد آ گئی تھی کہ تم یک دم بہت مضطرب نظر آنے لگے تھے۔ بے چینی سے بار بار اپنی انگلیوں کو مروڑتے۔

''دُری! یہ تمہاری تصویریں اور خط ہیں۔'' تم نے ایک لفافہ ٹیبل پر رکھا تھا۔ ''جانو! میں نہیں چاہتا کہ مجھے کچھ ہو جائے تو میرے بعد میرے سامان سے تمہاری تصویریں نکلیں اور تم لوگوں کی نظروں کی زد میں آ جاؤ۔''

میں نے اس وقت ایسی ہی تکلیف محسوس کی تھی شہریار! جیسے کوئی تعلق کا آخری دھاگہ بھی توڑ رہا ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے نا شہریار! میرا اور تمہارا تعلق تو روحوں کا تعلق ہے جو مر کر بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

''میرا دل نہیں چاہتا تھا، نہیں مانتا تھا۔ تمہیں پتہ ہے دُری! میں دن میں کتنی بار انہیں دیکھتا ہوں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہارے خط پڑھتا ہوں ...... لیکن تمہارے لئے دُری ...... تمہاری خاطر ......'' تمہاری آواز بھرا گئی تھی۔

میں نے تمہیں سنایا ......''یاد ہے نا، ایک بار تم نے ہی مجھے یہ نظم سنائی تھی۔

ساون کے کچھ بھیگے بھیگے دن رکھے ہیں
اور میرے اِک خط میں لپٹی رات پڑی ہے
وہ رات بجھا دو
اور ابھی کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے
وہ بھجوا دو
ایک سو سولہ چاند کی راتیں''

"پلیز ڈری، بس کرو......"
تم ایک دم کھڑے ہو گئے تھے اور بہت ساری دیر میری طرف پیٹھ کیے کارنس پر رکھی تصویروں کو دیکھتے رہے تھے۔
"ڈری! کبھی کبھی تم ایک شعر سنایا کرتی تھیں۔ وہ سنا دو۔"
"کون سا؟"
"وہی......

ہم تو فلک کے لوگ تھے ساکنانِ قریۂ مہتاب تھے
تیرے ہاتھ کیسے آ گئے ہم تو دُرِ نایاب تھے"

تم نے خود ہی شعر سنا دیا تھا اور پھر بہت آہستگی سے بولے تھے۔
"تم تو سچ مچ دُرِ نایاب تھیں پارو...... میرے ہاتھ کیسے آ گئیں؟" تمہاری آواز میں اتنے آنسو تھے شہریار! کہ میرا دل چاہا کہ میں تم سے لپٹ جاؤں اور خوب چیخ چیخ کر روؤں۔
پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آ گئے تھے اور نیچے قالین پر بیٹھتے ہوئے، میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہی ...... وہی جو اکثر تم سنایا کرتے تھے، وہ شعر تم نے دہرائے تھے۔
'میں دل دی دنیا وچ تیرے باجوں......'
میں نے سوچا تھا شہریار! میں تمہیں کہوں گی کہ مجھے بھول جانا...... بھولنے کی کوشش کرنا۔ حالانکہ مجھے پتا تھا، ایسا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے یہی سوچ رکھا تھا۔ لیکن تم میرے قریب بیٹھے تھے اور میرے اندر سیلاب آیا ہوا تھا جس پر بند باندھتے باندھتے میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور میں نے اس کے برعکس کیا۔
"شہریار!" میں نے یکایک تمہارے ہاتھ تھام لیے تھے۔ "مجھے یاد رکھنا شہریار! مجھے بھول مت جانا...... مجھے اس طرح یاد رکھنا شہریار! جیسے کوئی ماں اُس بچے کو یاد رکھتی ہے جو وقتِ ولادت اس کی آغوش میں آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتا ہے...... میری خواہش ہے میرے محبوب کہ تم مجھے اس طرح یاد رکھو جس طرح کوئی بادشاہ اس قیدی کو یاد رکھتا ہے جو اس کی معافی کے حکم سے پہلے ہی دار پر لٹکایا جا چکا ہو۔
اور شہریار
ایک بار ایک بار روبی کے ساتھ ...... علی ...... اور زریاب کو لے کر میرے گھر

ضرور آنا ...... میں دیکھوں گی ...... میں دیکھوں گی شہریار، اپنی آنکھوں کا خواب دوسروں کی جھولی میں کیسا لگتا ہے......"
"میں یہاں سے جاؤں گا تو آؤں گا نا ...... میں یہاں سے جاؤں گا ہی نہیں۔"
تمہارے اندر کا ضدی بچہ پھر مچل اٹھا تھا۔ "بابا سے کہو مجھے قبول کر لیں ...... میں شام کی چند دوستوں کو......"
"اوہ میرے خدا...... میں نے جذباتی ہو کر تمہیں بھی جذباتی کر دیا تھا۔
"پاگل مت بنو......"
میں نے ایک کمزور دل، کم حوصلہ محبت کرنے والی لڑکی سے پھر ایک مخلص اور ناصح دوست کا روپ دھار لیا تھا۔ تم چپ چاپ یونہی سر جھکائے میری باتیں سنتے رہے تھے۔
"دیکھو، روبی کو کبھی اپنی محبت اور اُس کی شدتوں سے آگاہ مت کرنا ...... لڑکیوں کے دل تو کانچ سے بنے ہوتے ہیں شہریار! اس پر کوئی لکیر پڑ گئی تو تم ڈسٹرب ہو گے۔"
تم نے بہت عجیب نظروں سے مجھے دیکھا تھا اور پھر یکایک تم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
"ڈری تم ...... تم بہت عجیب لڑکی ہو۔ بہت عجیب ...... کتنی آسانی سے تم یہ سب کچھ کر رہی ہو ...... کوئی یوں اس طرح ...... اس طرح بھی کرتا ہے۔ اپنی چیز اس طرح بھی کوئی دوسروں کے حوالے کرتا ہے......؟"
"تم میرے تھے ہی کب شہریار! تم تو کسی اور کی امانت تھے۔ اور میں صرف امانت دار تھی۔ اور امانتیں تو لوٹانی ہی ہوتی ہیں نا شہریار! کتنی عجیب بات ہے، تم نے ہزار بار کہا ہو گا کہ تم میرے ہو، صرف میرے ہو۔ مگر پھر بھی میرے نہیں ہو شہریار۔
برسوں پہلے مانی، ٹیپو، سارہ اور نومی کو اپنے بازوؤں میں چھپا کر میں نے سوچا تھا کہ یہ سب میرے ہیں اور میں ان کی ہوں ...... اور ہمیں صرف ایک دوسرے کے لیے ہی جینا ہے۔ لیکن نو برس کی ریاضتوں کے بعد جب منزہ بھابھی حق دار بن کر آئیں تو میں ان پر اپنا کوئی حق نہیں جتا سکی۔ یہ بھی نہیں کہہ سکی کہ راتوں کو تو میں ان کے لیے جاگی ہوں۔
یہ بیمار ہوئے ہیں تو پریشان میں ہوئی ہوں۔

ان کے امتحان ہوئے ہیں تو تھکی میں ہوں۔
انہیں میں نے اپنی محبت دی ہے۔
جب یہ ماں اور باپ کے لئے تڑپے ہیں تو میں ان کے ساتھ تڑپی ہوں ...... ان کے ساتھ مل کر آنسو بہائے ہیں اور پھر انہیں وہ ساری محبتیں اور شفقتیں دینے کے لئے تڑپی ہوں جو ان سے چھن گئی تھیں۔
''ہم نہیں جائیں گے ...... کبھی نہیں۔'' وہ جانے کے لئے تیار نہیں تھے اور میں چاہتی تھی کہ امانت اس کے مالک، اس کے آقا کے سپرد کر دی جائے۔
''آپ چاہیں آپی، تو ہم کبھی نہ جائیں۔ میں دیکھ لوں گا، ہمیں کون زبردستی لے کر جاتا ہے۔ کیا حق ہے کسی کا ہم پر۔''
مانی کی وہ معصومانہ دلیری ...... سارہ اور ٹیپو کی آنکھوں کی التجا۔
میں نے سب سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔
مانی کی آنکھوں کی التجا ...... مُڑ مُڑ کر اس کا دیکھنا ...... جیسے آنکھوں ہی آنکھوں سے کہہ رہا ہو۔
''آپی! ایک بار روک کر تو دیکھو ...... منع تو کرو جانے سے ...... پھر میں دیکھ لوں گا، کون کیسے ہمیں لے کر جاتا ہے۔''
میں نے جن سے محبت کی، جنہیں چاہا شہریار! ان پر کبھی میرا حق نہیں رہا۔ شدید محبتوں کے باوجود بھی منزہ بھابھی حق دار بن کر آ گئیں۔ کبھی ......
میرا تو تم پر کوئی ایسا حق نہیں تھا نا شہریار! کہ میں تمہیں بازو سے پکڑ کر روک لیتی ...... نہ جانے دیتی۔ تمہیں جانا تو تھا ہی نا شہریار ...... پھر ......
مانی کی آنکھوں کی معصومانہ دلیری تمہاری آنکھوں میں اُتر آئی تھی۔ تم ایک ٹک مجھے دیکھ رہے تھے ...... جیسے کہہ رہے ہو۔
''نایاب! ایک بار کہہ دو ...... روک تو لو ...... کبھی نہیں جاؤں گا۔''
لیکن میں نے اُس روز کی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں اور نگاہیں جھکا لی تھیں۔ تاکہ ان آنکھوں میں اُٹھتے طوفان کو نہ دیکھ سکو۔
تم پتہ نہیں کتنی دیر یونہی کھڑے مجھے دیکھتے رہے پھر جھکے، میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ لمحہ بھر یونہی دیکھتے رہے اور اپنے ہونٹ میرے ہاتھوں پر رکھ دیئے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے اردگرد دنیا مر گئی ہو۔ اپنی ساری خوبصورتی کے ساتھ میرے لئے دنیا اُس دن ختم ہو گئی تھی شہریار ......
پھول، رنگ، خوشبو، تتلیاں، جگنو، نیلا آسمان، خوبصورت پرندے ...... ساری خوبصورتیاں اپنے رنگ گم کر بیٹھی تھیں۔
دنیا یک دم بے رنگ اور پھیکی ہو گئی تھی۔
اگر زرینہ بی مجھے اچانک آ کر نہ اٹھاتیں تو شاید صبح تک میں یونہی بیٹھی رہتی۔
تم چلے گئے شہریار ...... آخری بار مل کر۔
کتنی بار میرا دل چاہا تم سے بات کروں ...... حوصلہ دوں ...... تسلی دوں ...... شاید تم ڈسٹرب ہو ...... شاید تمہیں میری ضرورت ہو۔
تمہارے گھر میں کتنی رونق ہو گی ...... تمہاری بہنیں ڈھولک پر تمہارے بیاہ کے گیت گا رہی ہوں گی۔ لیکن کیا تمہارا دل بھی ان گیتوں کے ساتھ دھڑکتا ہو گا؟ کیا تمہارے دل میں بھی رونق ہو گی؟ ویسا ہی چراغاں ہو گا جیسا تمہارے گھر میں ہے؟
مگر میں نے اپنے آپ کو روکے رکھا شہریار!
نہیں ...... مجھے اب تمہیں کبھی ڈسٹرب نہیں کرنا۔
پتہ نہیں کتنی مشکل سے تم نے اپنے آپ کو سنبھالا ہو گا۔ کہیں میری آواز تمہیں پھر سے نہ بکھیر دے۔
بابا تمہاری شادی میں شریک ہونے چلے گئے تھے اور میں نے اندر کی بے چینی سے گھبرا کر تمہیں رنگ کر ڈالا تھا۔
''ہیلو ......''
یہ تھکی تھکی بوجھل آواز تمہاری ہی تھی شہریار ...... میری شریانوں میں دوڑتے لہو میں جیسے زندگی آ گئی تھی۔
''ہیلو ......''
تم نے پھر کہا تھا اور میں نے ریسیور رکھ دیا تھا ...... اور پھر ریسیور رکھنے کے تین منٹ بعد بیل ہوئی تھی۔
پہلے ایک بیل ...... اور پھر وقفے وقفے سے تین مسلسل بیلیں۔
تم نے رنگ کیا تھا نا شہریار!
یہ تمہارا ہی انداز تھا ...... شاید تم نے جان لیا تھا کہ میں نے ہی تمہیں فون کیا ہے۔

لیکن شہریار! میں نے فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ اس روز مجھے پتہ چلا تھا کہ بعض اوقات اپنے آپ پر جبر کرنا موت سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔

بابا چلے گئے تھے اور خواہش کے باوجود میں نہیں گئی تھی۔ تم نے منع کیا تھا نا...... کتنا دل چاہتا تھا، تمہاری دلہن دیکھنے کو...... تمہیں دیکھنے کو...... مگر شاید تم چاہتے تھے کہ ہم دونوں ڈسٹرب نہ ہوں۔

مگر کیا بابا کو دیکھ کر تم ڈسٹرب نہ ہوئے ہو گے؟ ...... کیا تمہیں میرا خیال نہ آیا ہو گا؟

میں نے بابا سے کرید کرید کر تمہارا پوچھا تھا، تمہاری دلہن کیسی تھی؟ ...... تم کیسے تھے؟

''دلہن بھی اچھی تھی اور شہریار بھی اچھا تھا۔''

میں بابا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ تم مطمئن تھے؟ ...... خوش تھے؟...... لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے، کس طرح بابا سے پوچھوں ...... کیا سوال کروں کہ وہ بات جان پاؤں جو جاننا چاہتی تھی۔

''بابا! ولیمے والے دن وہ کیسے لگ رہے تھے؟''

بابا میرے پے در پے سوالوں پر مسکرائے تھے اور پھر سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا او میرے چہرے پر ان کی نظر پڑتے ہی ان کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی تھی اور وہ بہت د تک مجھے گہری نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ میں شپٹا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی...... و میرے بابا تھے شہریار! شاید انہیں کوئی ادراک ہو گیا تھا...... یا پھر میرا وہم تھا۔ لیکن مجھے یوں لگا تھا جیسے بابا جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس میں کسی سچائی کی کمی ہے۔

''بہت اچھے۔'' بابا نے کچھ دیر بعد میرے سوال کا جواب دیا تھا۔ ''بہت خوش او مطمئن ...... میں نے شہریار کو کہا تھا، کسی دن اپنی دلہن کو لے کر آئے۔ اس نے وعدہ ک تھا کہ جب وہ لوگ ہنی مون منانے جائیں گے تو واپسی پر ضرور یہاں رکیں گے۔''

بابا کے اتنے تفصیلی جواب پر تو مجھے مطمئن ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن شہریار! پتہ نہیں کیوں، مجھے یوں لگتا تھا جیسے بابا نے کہیں کوئی ڈنڈی ماری ہے ...... پھر بھی میں ا آپ کو مطمئن کرتی ہوں۔

تم خوش رہو ...... مطمئن رہو ...... یہی تو میں چاہتی تھی شہریار! پھر یہ بے چینی، اضطراب کیوں ہے شہریار؟...... میرا دل کیوں گھبراتا ہے؟...... میں کیوں راتوں کو ا

اٹھ کر بے آواز روتی ہوں؟

میں نے تو اپنے اندر آس کا کوئی دیا جلایا ہی نہیں تھا، پھر میرے اندر اتنا اندھیرا کیوں ہو گیا ہے شہریار؟ میں اُس خواب کی تعبیر نہ پانے پر روتی ہوں جو میری آنکھ میں کبھی سجا ہی نہیں تھا۔

میرا دامن تمہاری محبتوں کے موتیوں سے مالا مال ہے ...... میں نے اس خزانے کو بہت سنبھال کر رکھا ہے شہریار ...... پھر بھی کیوں لگتا ہے جیسے یکا یک تہی داماں ہو گئی ہوں...... خالی ہاتھ...... خالی دل۔ حالانکہ میرا دل تو تمہاری محبتوں سے لبالب بھرا ہے ...... میں گھونٹ گھونٹ ان محبتوں کو پیتی ہوں۔ یہی تو میرے زندہ رہنے کا سامان ہیں۔ میرے لئے آبِ حیات ہیں۔

پھر بھی دل چاہتا ہے چپکے سے آنکھیں موند لوں۔ لیکن میری زندگی کو جو تم نے اپنی زندگی سے مشروط کر رکھا ہے شہریار!...... کیوں تم نے ایسا کیا؟ ...... ورنہ کتنا آسان تھا چپ چاپ آنکھیں موند لینا۔ مگر اب ...... جانتے ہو میں دن میں کتنی بار ریسیور اٹھاتی ہوں اور تمہارا نمبر ملاتے ملاتے رکھ دیتی ہوں۔

کتنی بار تمہاری مخصوص بیل ہوئی ہے اور میں ہاتھ جکڑے بیٹھی رہتی ہوں ...... اور یہ جنگ ...... یہ اپنے آپ سے جنگ مجھے کھوکھلا کر رہی ہے۔ بس ایک چیز ہے جو مجھے سنبھالے ہوئے ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے زندہ رہنا ہے ...... تمہارے لئے ...... تمہاری زندگی کے لئے ...... مگر شہریار! زندگی میں حرارت نہیں رہی ...... سرِ شام ہی دل گھبرانے لگتا ہے۔ یہ شامیں اتنی اُداس کیوں ہوتی ہیں؟ اتنی ویران ...... تم ہر جگہ ...... ہر لمحہ یاد آتے ہو۔ تمہارے قہقہے، تمہاری ہنسی، وہ لطیف کی بہن ...... ممتا ...... ڈاکٹر صاحب ...... میں چونک چونک کر دیکھتی ہوں کہ شاید ابھی کہیں سے ...... کسی کونے سے تم نکل آؤ لیکن میرے خالی گھر میں اب کہیں قہقہے نہیں گونجتے۔

آج میری گلی میں کسی پاؤں کی چاپ بھی تو نہیں ہے۔
شریکِ سفر تھے کبھی جو ہمارے، کہیں کھو گئے ہیں۔
صبا ...... میرے گھر کے دریچوں سے لگ کر یہ کیا سوچتی ہو
یہ کیا دیکھتی ہو......

شہریار ...... تھکن میری رگوں میں اترنے لگی ہے۔ میری جان، مجھے آزاد کر دو اُس وعدے سے جو مجھے مرنے نہیں دیتا ...... میری زندگی ...... تم کہو ایک بار ...... میں زندہ

رہوں گا تمہارے بعد بھی ...... خوش رہوں گا تمہارے بعد بھی ...... تو میں سکون سے یہ آنکھیں موند لوں......

پتہ ہے ...... صبا بڑی دیر سے میرے دروازے پر دستک دے رہی ہے ...... اُسے عادت ہوگئی ہے نا میرا پیغام تم تک لے جانے اور تمہارا مجھ تک لانے کی......

کیا تم بھی میری طرح صبا کا انتظار کرتے ہو شہریار ...... کیا تم بھی اس کے ہاتھوں مجھے اَن کہے پیغام بھیجتے ہو؟ اور پھر اَن کہے جواب سنتے ہو؟...... بے لفظ، بے آواز ...... مگر آج سنو شہریار......

تپتے صحراؤں میں اس کڑی دھوپ میں
کتنے چھالے پڑے ہیں میرے پاؤں میں اور دور تک کوئی شجر بھی نہیں
زندگی کے حوادث سے گھبرا کے اب
جانے کب کس گھڑی
ایک لمبے سفر پہ چلا جاؤں میں
لوٹ کر پھر جہاں سے نہیں آؤں میں
صبا اُس سے کہنا
تم سے ممکن ہو تو
بس گھڑی دو گھڑی
تم چلے آؤ اب
ایک پل ہی سہی، چین تو آئے گا

☆☆☆

خواب، رنگ اور راستے

"اور ایسا ہی ہونا تھا......"

غصے سے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے ارتضٰی عباس نے سب کی طرف دیکھا۔

ایمل وزیر علی خان کو ...... جو دونوں ہاتھوں کی کٹوریوں میں چہرہ دھرے اُسے دیکھ رہی تھی اور اس کی نیلی آنکھوں میں سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

اسریٰ حیات کو جو قلم دانتوں میں دابے، حیرت سے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی جیسے اُسے ارتضٰی کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

مجاز حیدر اور مشاہد رضوی کو جو اپنا اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

وہ ابھی چند لمحے پہلے آیا تھا اور جب سے آیا تھا، غصے سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ پیشانی پر شکنوں کا جال سا بُنا تھا۔

ان چاروں نے ہی باری باری ان سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ یونہی ٹہلتا رہا تھا جیسے اپنے غصے اور غم کو دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اور مجھے پتہ تھا......" اس نے باری باری سب کے چہروں پر نظر ڈالی۔ "ایک دن تم سب کے راستے بند کر دیئے جائیں گے ...... تمہاری آنکھوں سے تمہارے خواب نوچ لئے جائیں گے اور تمہارے جسموں کو مُردار خور گِدھوں کے آگے ڈال دیا جائے گا جو پہلے تمہاری آنکھیں نوچ لیں گے تا کہ تم دیکھ نہ سکو۔ پھر تمہارے دل اور تمہاری روح کو زخمی کریں گے۔ اور جب تمہاری آنکھیں ...... تمہارا دل ...... تمہاری روح کچھ بھی باقی نہیں رہے گا پھر وہ سب تمہارے جسم کو ریزہ ریزہ کر کے نوچ لیں گے۔"

"رُنی!" مشاہد نے کچھ کہنا چاہا، بولنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"کیا کر لیا ہے تم نے ...... اور کیا کر لو گے تم؟...... تم جو دنیا کو، ملک کو سدھارنے کا

عزم لے کر خالی ہاتھ یہاں آ کر بیٹھ گئے ہو تو کیا کر لیا ہے تم نے اب تک؟...... ایک اخبار...... ایک ہفتہ وار اخبار...... جس کی سرکولیشن نہ ہونے کے برابر ہے...... اس میں ظلم کے خلاف چند مضامین چھاپ کر، چند ظالموں کو بے نقاب کر کے تم سمجھتے ہو کہ تم نے دنیا کو سدھار لیا ہے۔ کچھ بھی نہیں کیا تم نے...... کچھ بھی نہیں کر سکتے تم...... اُٹھو...... اپنے اپنے گھروں کو جاؤ...... بند کرو یہ فضول کا کھیل...... کچھ حاصل نہیں اس سے۔'' اس نے نیچے زمین پر رکھی ہوئی فائلوں کو پاؤں سے ٹھوکر ماری۔

''اس فضول اخبار سے تم اتنا بھی نہیں کماتے کہ اس دفتر کا کرایہ ہی ادا کر سکو تو پھر کیوں بیٹھے ہو یہاں؟...... کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟ چلو جاؤ سب۔''

''رنی پلیز، ریلیکس۔'' مجاز نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''بیٹھ جاؤ پلیز! اور ہمیں بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیا اخبار بند ہو گیا ہے...... کیا ڈیکلریشن......'' اُسریٰ نے قلم دانتوں سے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

''پھر تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟ جو کام بھی شروع کیا جائے، اس میں مشکلات تو ہوتی ہیں۔'' ایمل نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اور پھر اخبار کی سرکولیشن ایک دم تو نہیں بڑھ جاتی ہے۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہیں اخبار جاری کئے۔''

''تو اور کیا۔'' اُسریٰ نے اِدھر اُدھر اُڑتے ہوئے کاغذوں کو اکٹھا کر کے پیپر ویٹ کے نیچے رکھا۔ ''جب کچھ لوگ اچھا کام کرنے لگتے ہیں تو ان کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں لیکن بالآخر فتح سچ کی ہوتی ہے۔''

''یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔'' ارتضیٰ عباس تھکا تھکا سا زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی بھنچی ہوئی سی مٹھیاں کھل گئی تھیں اور چہرے پر غصے کی جگہ شکستگی نے لے لی تھی۔

''میں چاہتا ہوں...... پتہ نہیں، میں کیا چاہتا ہوں۔ مجھے خود بھی پتہ نہیں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''ارتضیٰ......'' مجاز اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ ''یار کیا ہوا ہے؟ تم اتنے ٹینس کیوں ہو رہے ہو؟''

''کیا ہوا ہے، کیا بتاؤں تمہیں......'' اس نے ہاتھوں کے حصار سے سر کو آزاد کیا۔

''میں اخبار بند کرنے لگا ہوں۔ میں تم سے معذرت خواہ ہوں دوستو کہ میں نے تمہارا وقت ضائع کیا۔ پچھلے چھ ماہ سے تم میرے ساتھ خوار ہو رہے ہو۔ تم میں سے شاید کچھ کی پڑھائی بھی متاثر ہوئی ہو اور شاید کچھ کو گھر والوں کی مخالفت بھی مول لینا پڑی ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ...... یہ اُسریٰ اعجاز...... اس کے بابا کتنے سخت آدمی ہیں اور اس کو دیر سے گھر جانے پر کیا کیا وضاحتیں کرنی پڑتی ہوں گی، کیسے کیسے انہیں قائل کرنا پڑتا ہو گا۔''

اُسریٰ کا رنگ ایک دم سفید ہوا اور پھر سرخ ہو گیا...... اس نے بے چینی سے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا اور شاکی نظروں سے ارتضیٰ کی طرف دیکھا۔ ''لیکن یہ ہمارا پرسنل معاملہ ہے اور ہم نے تم سے کبھی اس کا رونا نہیں رویا کہ ہم یہاں تک کیسے اور کس طرح آتے ہیں۔''

''ہاں، تم نے کبھی گلہ نہیں کیا۔'' ارتضیٰ کی نظریں لمحہ بھر کے لئے اس کی نظروں سے اُلجھیں۔ اُسریٰ نے نگاہیں جھکا لیں۔

''لیکن مجھے خود سوچ لینا چاہئے تھا کہ میں تمہیں بے راہ کر رہا ہوں۔ تمہارے لئے زندگی کو مشکل بنا رہا ہوں۔''

''اور تمہارے وہ لیکچر......'' مشاہد نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''وہ دنیا کو سدھارنے کے خواب...... وہ شر اور بدی کے خلاف جنگ کی باتیں۔''

''ہاں وہ میرے لیکچر۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور جھکا ہوا سر اٹھایا اور اس کی آواز میں پھر غصہ اور تلخی بھر گئی۔ ''جھوٹ تھا وہ سب۔ غلط کہتا تھا میں۔ بکواس کرتا تھا۔ یہ دنیا ہمیشہ سے ایسی ہی ہے اور ایسی ہی رہے گی...... تم یا تمہارے جیسے سرپھرے کچھ نہیں کر سکتے...... کچھ نہیں کر سکو گے تم بھی...... یہاں ہمیشہ شر کو خیر پر...... بدی کو نیکی پر فوقیت حاصل رہے گی...... سو اس ساری جدوجہد کا کیا فائدہ...... اس لئے میں نے سوچا ہے کہ تم سب اپنے مدار میں واپس چلے جاؤ۔ اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ اپنا کیریئر بناؤ...... اور جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہوتا ہے اسے ہونے دو۔''

''کیسے ہونے دیں؟'' مشاہد کو غصہ آ گیا۔ ''کیسے آنکھیں بند کر لیں۔ تم نے...... تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ہمیں جنگ کرنا ہے شر اور بدی کے خلاف آخری لمحوں تک۔ تم نے ہم سے وعدہ لیا تھا اور ہم نے تم سے عہد کیا تھا کہ ہماری زندگیاں صرف ہماری اپنی نہیں ہیں، ان پر ہمارے اہلِ وطن کا بھی حق ہے۔ ان لوگوں کا بھی حق ہے جو مظلوم ہیں، جو

کمزور ہیں اور جو مجبور ہیں۔"

"ہاں، شاید ایسا ہی کہا تھا میں نے......" ارتضٰی کے لہجے میں پھر تھکن اُتر آئی۔

"شاید وہ میری بھول تھی۔ میں تمہیں اس وعدے کے حصار سے آزاد کرتا ہوں...... تم آج سے کسی وعدے کے پابند نہیں ہو۔ میں تم سے شرمندہ ہوں اور ایک بار تم سے پھر معذرت کرتا ہوں۔ میں نے تمہارا بہت سا قیمتی وقت ضائع کیا۔ بھول جاؤ وہ سب کچھ جو میں تم سے کہا کرتا تھا۔"

"ارتضٰی......" ایمل نے نیلی آنکھیں ارتضٰی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ پتہ نہیں، کیا بات تھی، اس کی آنکھیں ہر دم گیلی گیلی رہتی تھیں جیسے وہاں سمندر سما گئے ہوں...... "تم ہمیں اس راستے سے واپس پلٹ جانے کو کہہ رہے ہو جو راستہ خود تم نے ہمیں دکھایا تھا...... وہ خواب ہماری آنکھوں سے واپس لینا چاہ رہے ہو جو خود تم نے ہماری آنکھوں میں سجایا تھا۔ بڑی محنت سے کئی مہینوں کی بحث کے بعد۔ تمہیں یاد ہے نا، ہمیں قائل کرنے کے لئے تم کتنی بحث کرتے تھے کتنا غصہ آتا تھا تمہیں جب ہم تمہاری باتوں پر دھیان نہ دیتے تھے۔ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے تم کتنے جذباتی ہو جاتے تھے اور پھر جب ہم تمہاری باتوں سے متاثر ہو گئے اور تمہارے خواب ہماری آنکھوں میں سج گئے تو اب یہ خواب تم ہم سے واپس لینا چاہتے ہو اور اس راستے سے واپس لوٹا رہے ہو جس راستے پر ہاتھ پکڑ کر تم خو ہمیں لائے تھے۔"

"غلط کہا تھا میں نے...... جھوٹے خواب دکھائے تھے میں نے تمہیں۔" وہ جھنجلا گیا۔

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ ان خوابوں کی کوئی تعبیر کہیں سے نہیں ملے گی...... یہ راستہ کسی منزل پر تمہیں نہیں لے جائے گا۔ تم ساری عمر تعبیریں ڈھونڈتے پھرو گے۔ یہاں تک کہ تمہاری آنکھیں اندھی ہو جائیں گی اور تم زندگی کی راہوں میں بھٹکتے رہو گے۔ مگر کہیں سے کوئی منزل تمہیں آواز نہیں دے گی...... میں جانتا تھا یہ سب کچھ۔ بہت پہلے سے جانتا تھا۔ اُس وقت سے جانتا تھا جب سے میری آنکھوں نے خواب بُننا شروع کئے تھے...... تب سے ہی۔ لیکن اس آگہی کے باوجود تمہاری آنکھوں میں خواب سجائے۔ میں تمہارا مجرم ہوں...... تم مجھے جو چاہے سزا دے لو...... لیکن خدارا واپس چلے جاؤ، انہی راستوں پر جن سے میں تمہیں لایا تھا۔

تم مجاز حیدر اور مشاہد یوسف رضوی! تم پہلے کی طرح یونیورسٹی سے فارغ ہو کر مال پ

چکر لگاؤ اور وہاں سے گزرتی لڑکیوں کو دیکھ کر آنکھوں کو تراوت پہنچاؤ یا پھر تیز ڈرائیونگ کرو۔ یا پھر گھر میں بیٹھ کر رانگ نمبر پر لڑکیوں کو بے وقوف بناؤ۔

اور تم اُسریٰ اعجاز! تم وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھو اور صبح اپنے ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں کو ان فلموں کی سٹوریاں سناؤ۔ ہیروئن کے لباس اور ہیرو کی آنکھوں پر تبصرہ کرو۔ اور......"

اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔

"تم ایمل وزیر علی خان!" اس کی نگاہیں ایمل کے دلکش چہرے پر ٹھہر سی گئیں۔ "تم بہت بڑے باپ کی بہت بڑی بیٹی...... تم بھی فارغ وقت میں آنکھیں موند کر اس انجانی ہستی کے ساتھ سفر کے خواب دیکھو جس کے خواب ہمیشہ تمہاری آنکھوں کے سمندروں میں تیرتے رہتے ہیں...... اور ان خوابوں کو جو میں نے تمہاری آنکھوں میں سجائے ہیں، نوچ کر پھینک دو۔ اور میری دعا ہے کہ وہ انجانی ہستی تمہیں زندگی کے سفر میں کہیں نہ کہیں مل جائے۔"

ایمل کے ہونٹوں کے کنارے کانپے اور آنکھوں میں ہلکورے لیتا سمندر لمحہ بھر کو جیسے ٹھہر گیا اور اس کے دل سے آمین کی آواز نکلی۔ لیکن ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔

ارتضٰی عباس نے ایمل کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور سب کی طرف دیکھا۔

"جو تمہارا دل چاہے تم کرو...... زندگی سے جو خوشیاں لے سکتے ہو لے لو۔ جسے انجوائے کرنا چاہتے ہو کرو لیکن فار گاڈ سیک میرا ساتھ چھوڑ دو اور واپس پلٹ جاؤ۔"

"کیا تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے......؟" اُسریٰ نے بے وقوفی سے پوچھا۔

"شاید نہیں۔" ارتضٰی نے آہستگی سے کہا۔

"کیوں......؟" مجاز نے پوچھا۔ "جب بقول تمہارے ان خوابوں کی کوئی تعبیر کہیں سے نہیں ملتی اور یہ راستے کسی منزل پر نہیں جاتے تو پھر تم کیوں انہی راستوں پر چلنا چاہتے ہو؟"

"اس لئے کہ مجھے انہی راستوں پر چلنا ہے۔ میں نے ان راستوں پر چلنے کا فیصلہ اس وقت کیا تھا جب مجھے پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ راستہ کہاں سے شروع ہوگا اور کہاں لے جائے گا اور یہ خواب اس وقت میری آنکھوں میں سج گیا تھا جب مجھے خواب اور تعبیر کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔ جب میری آنکھیں صرف ایک طرح کے خواب ہی دیکھا کرتی

تھیں کہ اچانک چھت پھٹ گئی ہے اور اس سے چھنا چھن روپے گرنے لگے ہیں۔ یا پھر الٰہ دین کا چراغ مجھے مل گیا ہے اور میں ایک کے بعد ایک خواہش پوری کرتا جا رہا ہوں۔ اور پھر اچانک ہی ان بچپن کے سارے خوابوں کی جگہ اس ایک خواب نے لے لی تھی۔"

وہ بات کرتے کرتے یکایک چپ ہو گیا جیسے اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ موضوع سے ہٹ گیا ہے۔

"جو راستہ تمہارے لئے صحیح ہے، وہ ہمارے لئے غلط کیسے ہو سکتا ہے؟" مشاہد نے پوچھا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ مروانا نہیں چاہتا۔ اس راستے پر چل کر تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی اور زندگی سے بھی بڑھ کر تمہاری......"

"اور جب تم ہمارا ہاتھ پکڑ کر اس راستے پر لا رہے تھے تو کیا اس وقت تمہیں ان دشواریوں کا احساس نہیں تھا؟" ایمل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"احساس تھا۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔ "اور اس کے لئے میں تم سے معذرت کر چکا ہوں اور ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں کہ میں تمہارا مجرم ہوں۔"

"فار گاڈ سیک ارتضیٰ!" ایمل کو غصہ آ گیا لیکن اس کا لہجہ بدستور دھیما تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سب آسان ہے؟ ہمارا اس طرح پلٹ جانا، ایک مشن کو ادھورا چھوڑ کر...... کیا یہ خلش ساری زندگی ہمیں نہیں ستائے گی کہ ہم نے محض راہ کے کانٹوں اور پتھروں کے خوف سے راستہ بدل لیا ہے۔ وہ جو ایک صحیح اور مثبت راستہ تھا...... کیا ہمارے مُردہ خواب ہمیں نہیں ستائیں گے؟ ہم خود ان خوابوں کے قاتل ہیں...... وہ خواب جنہیں ہم نے خود تخلیق کیا...... پھر ان کی آبیاری کی اور جب یہ تناور درخت بن گئے تو ہم نے انہیں قتل کر دیا...... کیا یہ احساس ہمیں زندگی میں پورے طور پر خوش ہونے دے گا کہ ہم نے ایک دوست کو محض اس لئے اس کے راستے پر اکیلا چھوڑ دیا کہ آگے راہیں زیادہ دشوار تھیں اور موت کا خطرہ تھا۔"

"مگر میں خود ایمل! میں خود تم سب سے جانے کو کہہ رہا ہوں۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"ارتضیٰ عباس! مجھے واپس نہیں جانا ہے...... سمجھے......" ایمل نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ میں جب ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتی ہوں تو اس پر پچھتاتی نہیں ہوں...... ایں در گرفتہ است خوب گرفتہ است۔"

"لیکن ایمی......" ارتضیٰ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا اور اتنی دیر میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں نرماہٹ اتر آئی۔

"نو مور۔" ایمل نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "تم بھی اگر راہ کی صعوبتوں سے خوف زدہ ہو تو اپنا یہ اخبار میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ میں خود...... اکیلے ہی...... یہ مشن آگے بڑھاؤں گی...... بدی، شر اور ظلم کے خلاف یہ جنگ میں اکیلے جاری رکھوں گی۔ اور مجھے یقین ہے، اس ملک میں دیوانوں کی کمی نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی ضرور اس جنگ میں میرے ساتھ شریک ہو جائے گا۔"

"اچھی لڑکی۔" ارتضیٰ بے اختیار ہنس دیا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب یک دم ڈھیلے ہو گئے تھے۔ "یہاں دیوانوں کو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے جاتے ہیں...... اور انہیں سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔"

"بلا سے۔" ایمل نے بے پروائی سے سر جھٹکا۔ "ایمل وزیر علی خاں نے ہمیشہ مشکل راستہ اپنایا ہے۔ ہمیشہ کٹھن راہ کا انتخاب کیا ہے ارتضیٰ عباس!" اس نے نخوت سے کہا اور پیشانی پر آ جانے والے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کیا۔

"ایمل صحیح کہتی ہے رنی۔" مشاہد نے ارتضیٰ کی طرف دیکھا۔ "ہم سب واپس جانے کے لئے نہیں آئے۔ اور ہمیں واپس نہیں جانا۔ راہیں اتنی بھی دشوار نہیں ہوں گی کہ ان پر چلا نہ جا سکے۔"

"مگر راہیں تمہارے تصور سے بھی زیادہ دشوار ہیں مشاہد رضوی۔" ارتضیٰ کے چہرے پر سختی آ گئی۔ "اور اگر یقین نہیں آتا تو جاؤ، جا کر میو ہسپتال کے ایمرجنسی میں بے ہوش پڑے وجاہت علی کو دیکھ لو جا کر...... اس کے پٹیوں میں جکڑے ہوئے جسم کو...... اس کی رک رک کر آتی ہوئی سانسوں کو اور اس کی بیوہ ماں کی فریاد کرتی آنکھوں کو...... اور اس کی بہنوں کی آنکھوں میں منجمد ہو جانے والے آنسوؤں کو۔"

"وجاہت...... وجی...... کیا ہوا اُسے؟" مشاہد، مجاز، ایمل تینوں نے بیک وقت پوچھا۔ "تم نے اب تک بتایا نہیں۔ کل شام تک تو وہ ہمیں ملا تھا۔ بالکل ٹھیک تھا اور کیا کوئی حادثہ......"

وہ تینوں بیک وقت بول رہے تھے، جبکہ اُسریٰ ساکت تھی اور اس کی رنگت یک دم زرد پڑ گئی تھی۔ یوں جیسے کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

"ہاں، کل شام تک تو وہ ٹھیک ہی تھا لیکن کل شام کو ہی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ

لوگ اسے دھمکی دے رہے ہیں۔"

"کون...... کون لوگ......؟" مجاز نے پوچھا۔

"سردار جہانگیر کے آدمی۔"

"کیوں......؟" مشاہد نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وجاہت اپنا آرٹیکل مکمل کر لے۔"

"کون سا آرٹیکل...... وہ عورتوں کی تجارت والا؟"

"ہاں، وہی سروے۔ دوسری قسط کے بعد ہی اسے دھمکیاں ملنی شروع ہو گئی تھیں۔ پھر پیسے کا لالچ بھی دیا گیا کہ وہ مزید اس کے متعلق نہ لکھے۔ لیکن کل کے اخبار میں جو قسط چھپی ہے، اس میں وجاہت نے لکھا تھا کہ ان دلالوں کی پشت پر کون لوگ ہیں۔ اگلے آرٹیکل میں وہ ان کے چہرے بے نقاب کر دے گا۔"

"ہاں...... اُس نے بتایا تو تھا کہ بنگلہ دیش سے آنے والی ان عورتوں کو فروخت کرنے والے دلالوں کے پیچھے سردار جہانگیر کا بھی ہاتھ ہے لیکن اس نے کہا تھا کہ اسے ثبوت نہیں مل سکا اس کا۔"

"اسے پروف مل گیا تھا۔" ارتضیٰ نے آہستگی سے کہا۔ "اور کل شام وہ مجھے یہی بتانے آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگلے ہفتے کی اشاعت میں حیران کن انکشاف کرے گا۔ لیکن مجھے ارسلان نے بتایا کہ اسے میرے گھر سے واپسی پر چند نامعلوم لوگوں نے گھیر لیا اور اپنی دانست میں اسے مار کر سڑک پر پھینک گئے۔ اس کے جسم پر چھریوں کے لاتعداد زخم ہیں۔ وہ تو ارسلان بس اتفاقاً وہاں پہنچ گیا...... وہ اس کی طرف ہی گیا تھا اور وہاں سے یہ جان کر کہ وہ میری طرف آیا ہے، وہ بھی میرے گھر کی طرف آیا اور اسے محض ایک راہ گیر سمجھ کر اس نے گاڑی روکی تھی کہ شاید کوئی گاڑی اسے ٹکر مار گئی ہے لیکن......"

ارتضیٰ کی آواز بھرا گئی۔

"میں اور ارسلان رات بھر اس کے ساتھ ہی رہے ہسپتال میں۔ وہ ساری رات زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا ہے۔"

"اور اب...... اس وقت کیسا ہے وہ......؟" اُسریٰ نے سرگوشی کی۔

"اب......" ارتضیٰ عباس نے اس کی طرف دیکھا۔

شاید یہ لڑکی اس سے محبت کرتی ہے لیکن اس سے پہلے اس نے ایسا تاثر بھی نہ دیا اور شاید میں...... میں اس کا بھی مجرم ہوں۔

اُسریٰ کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔

"اب بھی اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے...... اس لئے میں نے تم سے کہا ہے کہ تم سب چلے جاؤ۔ یہاں سے ہی واپس چلے جاؤ ورنہ کسی دن وہ تمہارے بھی ہاتھ پاؤں توڑ کر سڑک پر پھینک دیں گے اور پھر ضروری نہیں کہ وہاں سے کوئی ارسلان گزرے۔"

"دیکھو ارتضیٰ! اس موضوع پر ہم پھر بات کریں گے۔" ایمل نے نرمی سے کہا۔ "اس وقت تم بہت جذباتی ہو رہے ہو اور ہم...... ہم سب سے پہلے وجاہت کو ہسپتال دیکھنے جا رہے ہیں۔ وجاہت ٹھیک ہو جائے تو پھر ہم بات کریں گے۔"

"ہاں، اس وقت تو ہمیں ہسپتال جانا چاہئے۔" مجاز کھڑا ہو گیا۔

"تم بھی چلو گے ارتضیٰ!" مشاہد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں رات سے وہاں ہی تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے اس کی ماں کی سوال کرتی نگاہوں کا سامنا کرنے کی۔ اس کی بہنوں کے ستے ہوئے خوف زدہ چہروں پر نظر ڈالنے کی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ سب مجھ سے سوال کر رہی ہوں کہ میں نے ان کے اکلوتے بیٹے کو کس موت کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

ان کے لاڈلے بھائی کو......

نہیں مشی! میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ ان دھمکیوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں...... میں......"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ارتضیٰ! ایسا ہوتا رہتا ہے۔ پلیز اپنے آپ کو سنبھالو۔" مجاز نے اسے حوصلہ دیا۔

ارتضیٰ نے اس کی باتوں کا جواب دینے کے بجائے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

"اور تم اُسریٰ! تم چلو گی؟" مجاز نے اس سے پوچھا۔

"میں......" اس کے لب کانپے اور پھر جیسے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اُسریٰ! اُسریٰ کیا ہوا...... بی ایزی پلیز۔" ایمل نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے گرد اپنے بازو لپیٹ لئے۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاء اللہ وجی ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔"

'اُسریٰ اور وجاہت...... وجاہت اور اُسریٰ۔ کس قدر گھنے ہیں دونوں۔' مجاز نے

خوش دلی سے سوچا۔ 'وجاہت کو خدا زندگی دے اور وہ صحت مند ہو جائے تو پھر سمجھوں گا اُس سے۔ دوستی کا دعویٰ اور اتنا بڑا راز چھپائے ہوئے ہے۔'

''مگر یہ سب کیسے ہوا؟'' اس نے روتی ہوئی اُسریٰ کو دیکھا۔ ''اور کب ...... کن دنوں میں اتنی انڈرسٹینڈنگ ہو گئی اور ہم ایسے بے وقوف کہ ہمیں پتہ ہی نہ چلا۔ ہماری عین ناک کے نیچے سب کچھ ہوتا رہا اور ہمیں خبر تک نہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔

لمحہ بھر کے لئے اس کے ذہن سے ارتضیٰ کی تلخ گفتگو اور وجاہت کے زخمی ہونے کا خیال نکل گیا اور اس نے کسی قدر شوخی سے اسے مخاطب کیا۔

''وجاہت کے زخمی ہونے سے آپ کا راز تو کھل گیا جناب! اب اٹھئے، کیا خبر کہ اپ کے جانے سے......''

''پلیز مجاز، یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ اُسریٰ پہلے ہی پریشان ہے ...... اور بہت زیادہ دل گرفتہ ہے اور پھر وجاہت......''

''خدا کے لئے ایمی! کچھ غلط بات زبان سے نہ نکالنا، پلیز۔'' اس نے روتے روتے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خدا بہتر کرے گا اُسریٰ، چلو اب اٹھو۔ چہرہ صاف کرو۔''

''میں ...... وہاں کیسے جا سکتی ہوں ایمی ...... تم ...... کیا تمہیں خبر نہیں کہ اگر ابا جان کو اور بھابیوں کو پتہ چلا کہ میں وجی کو دیکھنے ہسپتال گئی تھی تو وہ کتنی باتیں بنائیں گے ...... کس قدر......'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''مگر وہ تمہارا منگیتر ہے اُسریٰ! اور اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ کیا خبر وہ بھی تمہیں دیکھنا چاہتا ہو۔''

''نہیں ایمی، نہیں۔'' اُسریٰ پھر رونے لگی۔ ''میں نہیں جا سکتی۔ تمہیں پتہ نہیں ہمارے خاندان میں اسے کس قدر معیوب سمجھا جاتا ہے کہ لڑکی شادی سے پہلے ہی منگیتر کے گھر جائے یا اس سے ملے۔''

''مگر وہ تمہارا ماموں زاد بھی تو ہے۔'' ایمل نے کہا۔

''ہاں ...... لیکن میں نہیں جا سکتی ایمی ...... نہیں۔ کیا خبر وہاں بابا جان بھی آئے ہوں اسے دیکھنے۔ اور میں ...... نہیں ایمی! بابا جان تو خدا جانے کیا کر دیں۔ تمہیں تو پتہ ہے نا گھر میں کسی کو خبر تک نہیں کہ میں وجی سے ملتی ہوں، اس سے بات کرتی ہوں۔''

وہ تینوں خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ یہ انکشاف ان سب کے لئے نیا تھا

لیکن فی الحال اس پر تبصرہ کرنے کا موقع نہ تھا۔

''آل رائٹ......'' ایمل کھڑی ہو گئی۔ ''ہم چلتے ہیں۔ تم دعا کرنا۔''

''میں ادھر ہی ہوں دفتر میں۔ تم واپس ادھر ہی آنا پلیز اور مجھے بتانا وہ کیسا ہے۔'' اُسریٰ نے التجا کی۔

''اچھا......'' ایمل نے وعدہ کیا۔ ایک نظر ارتضیٰ کے جھکے ہوئے سر پر ڈالی اور پھر مجاز اور مشاہد کی طرف دیکھا۔

''چلیں میرے ساتھ۔ گاڑی ہے۔''

''وہ کس ہسپتال میں ہے؟'' مجاز نے جاتے جاتے پوچھا۔

''میو ہسپتال کے روم نمبر 18 میں۔'' ارتضیٰ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

وہ تینوں چلے گئے۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ ارتضیٰ یونہی گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا رہا اور اُسریٰ ہولے ہولے روتی رہی۔ بڑی دیر بعد ارتضیٰ نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں یوں سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ بھی اُسریٰ کے ساتھ روتا رہا ہو۔ لیکن وہ رویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

''اُسریٰ!'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''سوری اُسریٰ، میں تم سے شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے......''

''پلیز ارتضیٰ!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''کسی کی وجہ سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور تم نے کیا کیا ہے جو تم بار بار معذرت کر رہے ہو؟''

''میں......'' اس نے شرمندگی سے کہا۔ ''میں ہی تم سب کو اس راستے پر لایا تھا نا۔ تم سب تو کھلنڈرے سے شوخ و شنگ زندگی کی خوشیوں کو انجوائے کر رہے تھے۔ یہ بدصورتیاں تو میں نے تمہیں دکھائی تھیں اور میں نے تمہیں ان بدصورتیوں کے خلاف جہاد کرنے پر اُکسایا تھا۔''

''ٹھیک ہے رتی! ہمیں ان بدصورتیوں کا احساس نہیں تھا اس لئے کہ ابھی ہم نے زندگی کو اتنی گہرائیوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن ہم سب اپنے اندر ایک حساس دل رکھتے تھے۔ تم ہمیں یہ احساس نہ بھی دلاتے تو شاید زندگی کے کسی موڑ پر ہمیں خود ہی ان بدصورتیوں کا احساس ہو جاتا۔ بہت سی باتوں کا ہمیں تب پتہ چلتا ہے جب ہم عملی زندگی میں آتے ہیں۔ ہم تو تمہارے شکر گزار ہیں ارتضیٰ! کہ تم نے ہمیں ایک مقصد کی لگن دی ہے۔ بدصورتیوں کے خلاف جہاد کرنا بھی تو ایک عبادت ہے۔ پھر ہم عبادتوں پر کیوں

شرمندہ ہوں؟ پلیز، اپنے ذہن سے یہ بوجھ اتار دو۔ اتنے ڈپریس کیوں ہو رہے ہو...... ہم کوئی ننھے بچے نہیں ہیں کہ جو کچھ تم نے کہا، ہم نے آنکھیں بند کر کے مان لیا...... ہم سب شعور رکھتے ہیں، عقل رکھتے ہیں اور ہم سب اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔"

ارتضٰی خاموشی سے سر جھکائے اُسریٰ کی تقریر سنتا رہا۔

"چلو اب مجھے بتاؤ کہ وجاہت کو کیا ہوا ہے؟ وہ لوگ کون تھے؟ میں نے تمہاری بات دھیان سے سنی نہیں تھی...... اس کے زخمی ہونے پر میرا ذہن وقتی طور پر مفلوج ہو گیا تھا۔"

ارتضٰی نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور وجاہت کے متعلق وہ ساری تفصیل جو پہلے بتا چکا تھا پھر بتائی۔ اُسریٰ کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"رنی......" وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ارتضٰی کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیئے۔ "پلیز، مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔" اس نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا...... "مجھے سچ بتانا...... وہ بچ تو جائے گا نا...... ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"پتہ نہیں اُسریٰ!" اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو بے دردی سے دانتوں تلے کچلا۔

"پتہ نہیں اُسریٰ! ڈاکٹر کچھ صحیح نہیں بتاتے۔"

اس نے اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر اُسریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا چہرہ اس کے ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑا۔ رات سے جس طوفان کو وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے تھا وہ ایک دم بہہ نکلا تھا...... وہ اور ارسلان رات بھر وجاہت کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ ساری رات وہ اس کی ماں اور بہنوں کو روتے اور دعائیں کرتے دیکھتا رہا تھا۔ ان کے آنسو اس کے دل پر گرتے رہے تھے اور یہ احساس اسے کچوکے دیتا رہا تھا کہ اس نے...... اس نے ہی تو کہا تھا وجاہت سے کہ وہ ہمت نہ ہارے، سرینڈر نہ کرے، پیچھے نہ ہٹے، خوف زدہ نہ ہو۔ وہ اس کے ساتھ ہے۔ لیکن کیا ساتھ دے سکا تھا وہ اس کا؟ انہوں نے اس کے گھر کے سامنے ہی اسے لہولہان کر کے پھینک دیا تھا۔ وہ اتنا بزدل اور کمزور نہیں تھا۔ جب اس نے زندگی کو اس طرح گزارنے کا فیصلہ کیا تھا تب سے اسے پتہ تھا کہ یہ بہت مشکل راہ ہے۔ بہت اوکھی منزل ہے۔

پتہ نہیں، یہ رات بھر جاگنے کا اثر تھا یا وجاہت کی خاموش فریادوں نے اس کے ذہن کو شل کر دیا تھا کہ وہ ہمت ہار بیٹھا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سب کو واپس کر دے

گا۔ دوسروں کی زندگیوں پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیوں وہ انہیں اپنے ساتھ خوار کرے۔ کیوں ان کی زندگیوں کے ساتھ کھیلے۔ یہ سب اس کے ساتھی تھے، دوست تھے اور مزاجوں کے اختلاف کے باوجود ان میں دوستی کا بڑا گہرا رشتہ تھا۔ اگرچہ اس دوستی کی مدت زیادہ طویل نہیں تھی لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں ان کی رفاقتیں بہت مضبوط اور دوستی کے رشتے بہت گہرے ہو گئے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں تو وہ سب ملے تھے۔ سب نے ہی کمپیوٹر کلاسز لی تھیں اور کمپیوٹر سنٹر میں وہ ان کا پہلا دن تھا...... کُل تیرہ اسٹوڈنٹ تھے جن میں پانچ لڑکیاں اور آٹھ لڑکے تھے۔ پہلے دن مختصر سا تعارف ہوا تھا۔

ایمل اور اُسریٰ سوشیالوجی میں ایم۔اے کر رہی تھیں۔ انہیں یونیورسٹی جوائن کئے ایک دو ماہ ہی ہوئے تھے۔

ارسلان لاء کا اسٹوڈنٹ تھا اور پنجاب یونیورسٹی سے ہی لاء کر رہا تھا۔

ارتضٰی ایم ایس سی کے فائنل میں تھا۔ وہ فزکس میں ایم۔ایس۔سی کر رہا تھا۔

مشاہد بی۔ایس۔سی کا اسٹوڈنٹ تھا۔

مجاز اور وجاہت انجینئرنگ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ تھے اور ان کی پہلے ہی سے دوستی تھی۔

زارا ایوب ارسلان کی کزن تھی اور بی۔اے کی طالبہ تھی۔ باقی پانچ میں سے دو ذرا زیادہ عمر کے تھے اور تین اسکول کے اسٹوڈنٹ تھے۔

پروفیسر مجاہد واحدی نے یہ کمپیوٹر سنٹر اپنی کوٹھی ہی میں کھولا تھا اور انہیں وہاں جاتے ہوئے تین چار دن ہی ہوئے تھے کہ ایک روز اچانک پروفیسر مجاہد صاحب کو کسی کام سے جانا پڑا تو وہ سب کوٹھی کے لان میں آ کر بیٹھ گئے۔ ایمل اور اُسریٰ ایک دوسرے کے قریب بیٹھی سرگوشیاں کر رہی تھیں اور ہولے ہولے ہنس رہی تھیں۔

"یہ ضرور ہم پر ریمارکس پاس کر کے ہنس رہی ہیں۔" مجاز نے مشاہد سے کہا۔

"کیوں؟" مشاہد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا ہم کوئی عجوبے لگ رہے ہیں؟"

"نہیں...... لیکن یہ لڑکیاں جو ہوتی ہیں نا یہ......"

"گرلز۔" وجاہت نے جو ان کے پاس ہی بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا ایک دم کھڑے ہو کر انہیں پکارا۔

ایمل اور اُسریٰ اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''ہم سب یہاں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور ہمیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجد نہیں بنانی چاہئے۔ پلیز، آپ لوگ بھی ادھر آ جائیں۔ کچھ ہم آپ کو اپنے متعلق بتاتے ہیں، کچھ آپ ہمیں بتائیں۔''

مجاز اور مشاہد نے تالیاں بجا کر اس کی تائید کی۔

ایمل اور اُسریٰ نے سب کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر ان کے قریب چلی آئیں۔

''یہ زارا ہے میری کزن۔'' ارسلان نے شرارت سے قریب بیٹھی زارا کو دیکھا جو کوئی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔ ''اور جیسا کہ آپ کو پتہ ہے، یہ بی۔اے کی طالبہ ہیں۔ اور ایک بات جو آپ کو نہیں پتہ، وہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ خاتون اچھی خاصی افسانہ نگار ہیں اور خواتین کے کئی پرچوں میں ان کے افسانے شائع ہوتے ہیں بلکہ اس وقت بھی ان محترمہ کے ہاتھ میں جو ڈائجسٹ ہے، یقیناً اس میں بھی ان کا کوئی نہ کوئی شاہکار ضرور ہوگا۔''

''ریئلی......؟'' ایمل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''سچ، تم تو اتنی چھوٹی سی لگ رہی ہو۔ افسانے کیسے لکھ لیتی ہو؟'' اسے بے حد حیرت ہو رہی تھی۔

''بس ایسے ہی۔'' وہ شرما سی گئی۔

''لو، افسانے لکھنا بھی کوئی مشکل کام ہے......'' ارسلان شرارت کے موڈ میں تھا۔ ''اور پھر جیسے افسانے یہ لکھتی ہیں، ویسے دس ہزار افسانے میں لکھ سکتا ہوں۔''

''کیسے افسانے لکھتی ہیں یہ؟'' ایمل کو تجسس ہوا۔

''ہا......'' ارسلان نے ذرا کی ذرا آنکھیں موند کر پھر کھولیں۔ ''ایک خوبصورت ہیروئن، گلابی یا نیلی ساڑھی، آٹھ کلیوں والا کرتہ، گرین شلوار قمیض، لانبی آنکھیں، گھنی پلکیں...... شنگرفی ہونٹ۔ دس بارہ کزنوں کی فوج جن میں ایک کھردرا، سخت مزاج لیکن شاندار شخصیت۔''

''فضول مت بکو۔'' زارا نے اس کی پیٹھ پر مُکا مارا۔

''ارے، ساری آؤٹ لائن تو بتانے دو۔ قسم سے اس آؤٹ لائن سے پچاس افسانے تیار ہو سکتے ہیں...... کیوں ارتضیٰ صاحب!'' وہ ارتضیٰ کی طرف مڑا جو چپ بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

''ہاں......'' ارتضیٰ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

زارا خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''اتنی ہزاروں لڑکیاں میری کہانیوں پسند کرتی ہیں۔ ایک تم ہو ناقدرے۔ جل ککڑے۔''

دونوں کی دلچسپ نوک جھوک نے سب کے درمیان سے تکلف کی دیوار گرا دی تھی۔ وہ نہ صرف ان کی گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے بلکہ ساتھ ساتھ لقمے بھی دے رہے تھے۔ اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کے درمیان دوستی کا رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔ اب تو وہ باقاعدگی سے کلاسز ختم ہونے سے پہلے یا بعد میں اکٹھے بیٹھ کر گپ شپ لگاتے تھے۔ ظلم، بدی اور برائی کے خلاف جدوجہد کرنے کی تجویز ارتضیٰ ہی کی تھی۔ شروع شروع میں تو سب نے اس کا مذاق اُڑایا تھا۔

''چھوڑو یار، تم کس چکر میں پڑ گئے۔ بہت سارے لوگ ہیں جو ظلم و بدی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں لیکن کیا کر لیا ہے انہوں نے اور کیا کر لیں گے ہم...... یہ تہذیب، یہ سسٹم، یہ معاشرہ یوں ہی رہے گا۔''

''لیکن اگر سب ہماری طرح سوچنے لگیں اور کوئی بھی ہتھیار نہ اٹھائے تو پھر ایک دن اس دنیا میں صرف برائیاں ہی رہ جائیں گی۔'' ارتضیٰ بحث کرتا انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا۔

مجاز اُسے مشورہ دیتا۔ ''یار، تم سیاست میں کیوں نہیں چلے جاتے؟ اگلی بار الیکشن ہوں تو تم بھی کھڑے ہو جانا۔ ہم سب تمہیں سپورٹ کریں گے۔''

''میرے بابا اسمبلی کے ممبر ہیں۔'' ایمل نے پہلی بار انکشاف کیا۔ ''تم ان کی پارٹی میں شامل ہو جاؤ، ٹکٹ میں تمہیں دلوا دوں گی۔''

''یار، مجھے سیاست میں نہیں جانا۔'' ارتضیٰ صاف منع کر دیتا۔ ''ملک کی خدمت کے اور بھی تو طریقے ہوتے ہیں۔ ہم جہاں بھی ہوں، جس شعبے میں ہوں، ہم وہاں رہ کر بھی ظلم کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں۔''

''لیکن اس کے لئے کوئی پلیٹ فارم تو چاہئے ہوگا نا۔''

مشاہد اور ارسلان کچھ کچھ اس کی باتوں کے قائل ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ارتضیٰ صحیح کہتا ہے کہ زندگی بے مقصد گزارنے کی بجائے اسے کسی مقصد پر لگا دیا جائے۔

'ہاں کوئی پلیٹ فارم تو ہونا چاہئے۔ کہیں سے آدمی کو اپنی جدوجہد کا آغاز تو کرنا ہی ہے۔ مگر کہاں سے؟' ارتضیٰ اکثر سوچتا تھا۔

یہ تو طے تھا کہ اسے زندگی کو یونہی بے مقصد نہیں گنوانا تھا اور یہ فیصلہ تو اس نے اسی وقت کر لیا تھا جب سروس ہسپتال کے عام وارڈ میں مرتضیٰ عباس نے اس کے بازوؤں میں جان دی تھی اور اس کی خاموش نظروں نے بار ہا اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے مشن کو

آگے بڑھائے گا اور اس نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ وہ اس مقصد کو جس کے لئے
اس کا باپ ساری زندگی لڑتا رہا اور پھر بھائی نے اپنی زندگی ہاری تھی، اپنی زندگی کا نصب
العین بنا لے گا۔

لیکن پھر عروج آپا کے آنسوؤں نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔

"تُو سیاست میں نہیں جائے گا رنی! تجھے مرتضیٰ کی قسم۔ میرے ساتھ وعدہ کر، تُو کبھی
بھی اس خارزار میں قدم نہیں رکھے گا۔ اس سیاست نے ہم سے سب کچھ چھین لیا ہے۔
میرے سر سے میرا سائبان، ماں جی کا آنچل۔ تُو اس گھر کا آخری سرمایہ ہے۔ میں تجھے
ضائع نہیں ہونے دوں گی۔" انہوں نے اپنا سفید دوپٹہ اتار کر اس کے پیروں پر ڈال د
تو اس نے تڑپ کر وہ دوپٹہ اٹھا کر ان کے سر پر ڈال دیا تھا۔

وہ عروج آپا کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ان کی کوئی بات بھی نہیں ٹا
سکتا تھا۔ اس نے مرتے ہوئے بھائی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ عروج آ
کا تا حیات خیال رکھے گا۔ ان کے بچوں کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔

یہ عروج آپا نہ صرف یہ کہ اس کی بیوہ بھابھی تھیں بلکہ اس کی سگی چچا زاد بھی تھیں ا
بچپن سے لے کر اب تک وہ ایک ہی گھر میں سگے بہن بھائیوں کی طرح رہے تھے ا
عروج آپا نے اسے ہمیشہ سگے بھائیوں سے زیادہ چاہا تھا۔

"عروج صحیح کہتی ہے بیٹا!" ماں جی کی آنکھیں بھی نم آلود ہو گئی تھیں۔ "اس سیاس
نے کیا دیا ہے ہمیں ...... تمہارے باپ، چچا اور بھائی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکے۔
اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے، نہ اس وطن کے لئے۔ ہاں اپنی زندگی ہار گئے۔"

"مگر انہوں نے ایک روایت تو قائم کی ہے ...... ظلم کے خلاف جنگ کی روایت۔"

وہ کہنا چاہتا تھا، سمجھانا چاہتا تھا لیکن ان دو عورتوں کے آنسوؤں نے اُس کی زبا
بند کر دی۔ ماں جی سے تو وہ ضد بھی کر سکتا تھا لیکن عروج آپا کو قائل نہیں کر سکتا تھا۔
اُس نے چپ چاپ وہ کاغذات پھاڑ ڈالے جنہیں وہ صبح جمع کروانے جا رہا تھا۔ ابھ
اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس نے ابھی چند دن پہلے ہی تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا لیک
علاقے کے لوگ چاہتے تھے کہ وہ صوبائی اسمبلی کے الیکشن کے لئے کھڑا ہو جائے۔

"ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" انہوں نے دن رات اس کے پاس آ آ کر کہا ت
یقین دلایا تھا۔ "ہم ان وڈیروں کی اجارہ داری سے تنگ آ چکے ہیں۔ اگر مرتضیٰ مر
زندہ رہتے تو تم دیکھتے کہ ہم انہیں قومی اسمبلی تک لے جاتے لیکن......"

اور یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ گلی گلی میں مرتضیٰ عباس کے نام کے سبز بینر لگے ہوتے
تھے۔ ہر جلسے میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ علاقے کے لوگ بلند آواز سے اس
کے نام کے نعرے لگاتے تھے۔ اس کی کامیابی یقینی تھی۔

لیکن پولنگ سے کچھ دن پہلے وہ حادثہ......

اور عروج آپا کہتی تھیں وہ حادثہ اتفاقی نہ تھا۔

اُس گاڑی نے بلاشبہ جان بوجھ کر ٹکر ماری تھی مرتضیٰ کو۔ اس وقت وہ مرتضیٰ کے
ساتھ تھیں۔ وہ بسم اللہ کلینک سے چیک اَپ کروا کے باہر نکلے تھے اور ٹیکسیوں کی طرف
بڑھ رہے تھے کہ وہ سیاہ گاڑی اچانک جھگیوں کی سائیڈ سے آئی تھی اور مرتضیٰ کو ٹکر مارتی
ہوئی آگے نکل گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ٹکر سے اچھل کر جب مرتضیٰ سڑک پر گر پڑے تھے تو
اس نے جان بوجھ کر انہیں کچلنے کی کوشش کی تھی۔

"تم یقین کرو رنی!" عروج آپا نے بار بار رو کر اسے بتایا تھا۔ "یہ حادثہ نہیں قتل تھا۔"
لیکن اس قتل کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ کوئی گواہ نہیں تھا۔ اور مرتضیٰ عباس اس حادثے کے
چار دن بعد مر گیا۔

وہ مرتضیٰ عباس جس کے پاس بہت سے خواب تھے، جس نے لوگوں سے بے شمار
وعدے کئے تھے ...... جس نے علاقے کی بہتری کے لئے کئی منصوبے بنا رکھے تھے......
جو بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن موت کے سامنے ہار گیا۔

اُسے یقین نہیں آتا تھا لیکن اسے یقین کرنا پڑا کہ اچھے لوگوں کو قدم قدم پر روکا جاتا
ہے۔

وہ بہت چھوٹا سا تھا جب اس کے والد کا انتقال ہوا تھا...... اس کے والد سیّد عباس علی
شاہ پروفیسر تھے اور علاقے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ بہت عرصہ پہلے ان کے دادا اپنے
خاندان سے الگ ہو گئے تھے۔ انہوں نے جائیداد، زمینیں سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور محل نما
حویلی سے ایک چھوٹے سے مکان میں اٹھ آئے تھے اور سکول میں پڑھانے لگے تھے۔
معلوم نہیں ان کے اپنے والدین اور بھائیوں سے کیا اختلافات تھے۔ کبھی بھی سیّد عباس
علی شاہ نے ان کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ اپنے دادا کا ذکر بہت احترام سے کیا کرتے
تھے۔ "تمہارے دادا جان مقبول علی شاہ بتاتے ہیں کہ میرے دادا نے ہمیشہ رزقِ حلال
کھایا اور ہمیں بھی رزقِ حلال کی تعلیم دی۔"

سیّد مقبول علی شاہ کے دو بیٹے تھے اور انہوں نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے

ہوئے تعلیم کے شعبے کو ہی اپنایا تھا اور ساری زندگی سکول میں پڑھاتے رہے اور ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

بڑے بیٹے سید عباس علی شاہ نے ایم۔اے کیا تھا۔ ایک کالج میں لیکچرار ہوئے پھر یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔ چھوٹے بیٹے سیّد شبیر علی شاہ نے بھی تعلیم کا شعبہ ہی اپنا تھا۔ علاقے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وہ جب بھی لاہور سے گھر آتے، لوگ ان سے ملنے اور ان سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور انہوں نے اولاد کو بھی یہی تربیت دی تھی۔

سیّد عباس علی شاہ کے دو بیٹے تھے، مرتضٰی عباس اور ارتضٰی عباس۔

شبیر شاہ کی صرف ایک ہی بیٹی تھیں عروج ...... اور ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ ایک گھر میں بہت محبت اور پیار سے رہ رہے تھے کہ اچانک ملک میں الیکشن کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ایک طویل عرصے بعد الیکشن ہو رہے تھے۔ سیّد عباس علی شاہ چھٹیوں میں گھر آئے تو علاقے کے کچھ معزز لوگوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ الیکشن کے لئے کھڑے ہوں۔

''بھئی میں ایک غریب پروفیسر ہوں، میرا سیاست سے کیا کام؟''

''ہمیں آپ جیسے لوگوں کی ہی ضرورت ہے۔ مخلص، ہمدرد اور محب وطن۔''

شبیر شاہ اُس کے حق میں تھے۔

''ہاں بھائی! آپ ضرور الیکشن لڑیں۔ ہمارے ہاں ساری خرابی سیاست میں ہی ہے۔ صرف ہمارا سیاست دان ٹھیک ہو جائے تو سارا نظام بہتر ہو جائے۔''

''لیکن بھائی! ایک میرے اچھا ہونے سے کیا فرق پڑے گا؟''

''فرق پڑے گا بھائی ...... اور لوگوں کو، میرا مطلب ہے اچھے لوگوں کو سیاست میں آنے کا حوصلہ ملے گا۔ پچاس سالہ نظام کچھ تو بدلے گا۔''

اور یوں سیّد عباس علی شاہ مجبور ہو گئے تھے۔

دوسری طرف ان کے دادا کے خاندان کے لوگ تھے سیاست جن کے گھر کی لونڈی تھی ...... جو جب سے پاکستان بنا تھا، اسمبلیوں میں تھے ...... بڑے جاگیردار، مربعوں اور زمینوں کے مالک جو سیاست کے داؤ پیچ سے واقف تھے۔

یہاں صرف جذبہ تھا ...... خلوص تھا ...... اور لوگوں کی حمایت و محبت تھی۔

جلسے ہونے لگے۔ لوگ کھل کر ان کی حمایت کرنے لگے تو مخالف چونکے۔ انہوں نے

دھمکیاں دیں، لالچ دیا مگر سیّد عباس علی شاہ کا عزم زیادہ مستحکم ہو گیا۔

'سیاست کو ایسے لوگوں سے پاک ہونا چاہئے ...... مخلص لوگوں کو آگے بڑھنا چاہئے......' اب ان کی بھی یہی رائے تھی۔

پھر ایک روز جب وہ عروج کو، جو لاہور کالج میں پڑھتی تھی، لینے جا رہے تھے، ان کے ساتھ شبیر شاہ بھی تھے جو سوزوکی ڈرائیو کر رہے تھے جو انہوں نے کچھ عرصہ پہلے ہی سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی کہ سامنے سے آتی ہوئی پجارو سے کسی نے کلاشنکوف سے فائر کیے۔ اسٹیئرنگ شبیر شاہ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ...... گاڑی ڈولتی ہوئی ایک درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ شبیر شاہ کے جسم پر نہ جانے کتنی گولیاں لگی تھیں اور سیّد عباس علی شاہ معجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔ ان کے جسم پر خراش تک نہ آئی تھی۔ اور جب وہ شبیر شاہ کی خون آلود لاش کو گھر لے کر آئے تھے تو گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔

ارتضٰی عباس کی آنکھوں کے سامنے سے وہ منظر نہیں ہٹتا تھا۔ عروج آپا کی چیخیں، چچی جان کا رونا پیٹنا۔

سیّد عباس علی شاہ کئی دن تک گم صم رہے تھے ...... وہ بھائی جو ان کا حوصلہ بڑھاتا تھا ...... جو اندھیروں میں چراغ سے چراغ روشن کرنا چاہتا تھا، جو کہتا تھا کہ بھائی اندھیرا کتنا ہی کیوں نہ ہو، روشنی کی معمولی سی کرن بھی اس اندھیرے کو دور کر سکتی ہے۔ ہمارے علاقے کے لوگوں کو ہماری ضرورت ہے ...... ان سیاست دانوں کی نہیں ...... ہمیں صدیوں سے قائم فرسودہ نظام کو تبدیل کرنا ہے ...... ہمیں سچ مچ ان لوگوں کے لئے کچھ کرنا ہے۔

وہ جب جلسوں میں ان کی ہمراہی میں تقریریں کرتا تھا تو اس کی تقریریں آگ لگا دیتی تھیں۔

اگلی بار انشاء اللہ میں بھی الیکشن میں حصہ لوں گا.... پھر مرتضٰی ہے، ارتضٰی ہے۔ ہم سب مل کر ایک کے بعد ایک چراغ جلاتے جائیں گے.... آپ بارش کا پہلا قطرہ تو بنیں۔

وہ بھائی اُن کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

کئی دن تک تو وہ گھر سے باہر ہی نہ نکلے۔ لوگ ان کے پاس آتے رہے۔ انہیں بتاتے رہے، یہ ان لوگوں کا کام ہے۔ مگر وہ کیا کہتے، انہوں نے کسی مجرم کو نہیں دیکھا تھا۔

پھر انہیں دھمکیاں ملنے لگیں، واضح الفاظ میں۔

اس واقعے سے سبق حاصل کرو۔

ابھی مرتضیٰ اور ارتضیٰ ہیں، عروج ہے۔ خود تم ہو۔

اور تب انہیں یقین آیا کہ یہاں پنجاب کے اس علاقے میں بھی وڈیرا شاہی بہت مضبوط ہے۔ وہی سندھ کے جاگیرداروں والا حال۔

تب انہیں پتہ چلا کہ لوگ کیوں انہیں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی ذات پر کئی انکشاف ہوئے۔

یہاں اب تک سکول کیوں نہیں بنا۔

گلیاں کیوں پختہ نہیں ہیں۔

بجلی کیوں نہیں ہے۔

اور پھر وہ اپنے ارادے میں زیادہ مضبوط اور پختہ ہو گئے۔ شبیر شاہ کہتا تھا، ظلم کے آگے جھک جانا ظلم کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے اور انہیں اپنے اس بھائی کا مان رکھنا ہے جس کے دل میں اچانک ہی خواب اُگ آئے تھے۔ وہ ان خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے بے چین رہنے لگا تھا جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے بارہ گھنٹے ایک ہی موضوع پر بات کرنے لگا تھا۔

''ایک دفعہ آپ الیکشن جیت جائیں، پھر دیکھئے گا ہم کیا کرتے ہیں۔''

اور وہ سارے خواب اپنی بند آنکھوں میں چھپا کر چلا گیا تھا اور اب انہیں ان خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنا تھی۔

سو انہوں نے ظلم کے خلاف ہتھیار نہیں پھینکے...... وہ ایک دم ہی بہت مضبوط اور سخت ہو گئے تھے...... وہ جو بہت نرم خو، بہت نرم مزاج سے تھے، بہت نرم دل سے تھے، ایک دم ہی ان کے اندر چٹانوں جیسی سختی آ گئی تھی۔ اب ان کی تقریریں جلسوں میں آگ لگانے لگی تھیں۔

وہ بولتے تو عطاء اللہ شاہ بخاری کی یاد تازہ ہو جاتی...... شبیر شاہ کی موت نے انہیں سرتاپا تبدیل کر دیا تھا۔

''دیکھو، میری بات یاد رکھنا۔'' وہ مرتضیٰ اور ارتضیٰ کو پاس بٹھا کر گھنٹوں سمجھایا کرتے۔ ''کبھی ظلم کے آگے ہتھیار نہ ڈالنا...... جھک کر کبھی ظلم کے ہاتھ مضبوط نہ کرنا۔ اور اگر میں اس راہ میں مارا جاؤں تو میرا مشن جاری رکھنا......''

اور پھر سب نے دیکھا۔ ہمیشہ جیتنے والے ہار گئے تھے۔

وہ شخص جو کوئی جاگیردار، کوئی وڈیرا نہیں تھا، محض یونیورسٹی کا ایک معمولی پروفیسر تھا

وہ جیت گیا تھا...... وڈیرا شاہی ہار گئی تھی۔

لوگ بہت خوش تھے۔

اس روز مرتضیٰ کے ساتھ شبیر شاہ کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہوئے شاید اس کی موت پر پہلی بار وہ دل کھول کر روئے تھے۔

پھر زندگی مسلسل ایک آزمائش ہی تو بن گئی تھی۔

ان کے ہر اچھے کام میں روڑے اٹکائے گئے تھے۔

وہ گاؤں کے لئے لڑکیوں کا پرائمری سکول منظور کروا چکے تو اس میں کوئی نہ کوئی بات نکل آتی...... گلیاں پختہ ہونے کی منظوری ہو جاتی تو فائلیں گم ہو جاتیں...... کہاں کہاں انہیں روکا گیا...... یہ ایک پارٹ ٹائم کام نہ تھا۔ کئی بار انہوں نے یونیورسٹی سے دو دو ماہ کی چھٹی لی۔ جتنا ان کا راستہ روکا جاتا، اتنا ہی ان کا عزم پختہ ہو جاتا۔ پھر شاید یہ لوگوں کی دعائیں تھیں یا ان کے عزم کی پختگی تھی کہ کچھ عرصے میں ہی وہ سب کچھ ہونے لگا جس کے منصوبے شبیر شاہ بنایا کرتے تھے۔

گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول بن گیا۔

لڑکوں کا مڈل اسکول ہائی ہو گیا۔

گلیاں پختہ ہو گئیں۔

بجلی آ گئی...... ایک دستکاری سکول بھی بن گیا۔

سب کچھ ہو رہا تھا لیکن دن رات کی محنت نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ پڑھانا، دفاتر کے چکر کاٹنا اور پھر ان رکاوٹوں کا مقابلہ کرنا جو ان کے مشن کی راہ میں حائل کی جاتی تھیں۔ جب لڑکیوں کا پرائمری سکول بن رہا تھا تو کئی بار اس کی چار دیواری کو گرایا گیا۔ دن کو تعمیر ہوتی، رات کو گرا دی جاتی۔ جب بنیادیں کھودی جا رہی تھیں تو رات کو ان میں پانی اور کچرا پھینک دیا جاتا۔ تب راتوں کو وہ خود ڈیوٹی دینے لگے اور ان کے ساتھ علاقے کے کچھ جیالے بھی شامل ہو گئے۔ یوں علاقے کی بہتری کے لئے کام ہونے لگے تھے۔ مگر پھر ان کی صحت یکایک گرنے لگی۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگے۔

بظاہر کوئی بیماری نہ تھی۔ بس تھکن، خون کی کمی۔

زوّار علی شاہ نے ایک روز اسمبلی سے باہر آتے ہوئے انہیں روک لیا...... وہ قومی اسمبلی میں تھے۔

''بہت کمزور ہو رہے ہو عباس علی شاہ...... علاج کے لئے انگلینڈ چلے جاؤ۔ میں

انتظام کروائے دیتا ہوں ...... الیکشن جیت گئے ہو، یہ بہت ہے۔ عیش کرو۔ کیوں جا کھپاتے ہو؟ یہ علاقے کی اصلاح کا بھوت جو تمہارے سر پر سوار ہو گیا ہے، اسے سر۔ نکال دو۔'' اس کے لہجے میں واضح دھمکی چھپی تھی۔

یہ شخص ان کے دادا کے خاندان میں سے تھا۔ ان کے بھائی کے قاتلوں میں سے تھ اور ظالموں میں سے تھا۔ اس لئے وہ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ لیکن اس کی تمسخرانہ ہنسی دیر تک ان کے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔

اسمبلی میں پہنچ کر سیاست میں آئے تو انہیں پتہ چلا تھا کہ شبیر شاہ صحیح کہتا تھا۔ خرابیَ جڑ سیاست میں نہیں ہے۔ سیاست دانوں کو راستے پر لے آؤ، پورا ملک خود ہی راہِ راسۃ پر آ جائے گا۔

ملک میں ہونے والے ہنگامے، رشوت، استحصال، دھاندلی سب کچھ یہیں سے ج لیتا ہے۔

ہر محکمہ سیاست دانوں کے ہاتھ میں کھیل رہا تھا...... ابھی ان کے بہت سے منصو۔ تھے لیکن زندگی نے انہیں مہلت نہ دی۔ تین سال بعد صرف چند دن بیمار رہ کر وہ شبیر ش کے پہلو میں جا سوئے تھے لیکن جاتے ہوئے اپنے سارے خواب مرتضیٰ کی جھولی م ڈال گئے تھے۔

لڑکیوں کے اس پرائمری سکول کو تم نے ہائی بنانا ہے۔ سوئی گیس کی سہولت مہیا کر ہے۔ ٹیوب ویل لگوانے ہیں ...... اور سارے وہ خواب جو وہ پورے نہیں کر سکے تھ انہیں مرتضیٰ عباس نے اپنی آنکھوں میں سجا لیا تھا۔

اور جب دوبارہ الیکشن کا اعلان ہوا تو مرتضیٰ عباس قومی اسمبلی کے لئے کھڑا ہو گیا۔

آزاد امیدوار کی حیثیت سے۔

وہ مرتضیٰ عباس جس کی عمر ابھی صرف بتیس سال تھی۔ شادی کو صرف پانچ سال ہوئے تھے۔ جو دو ننھے معصوم بچوں کا باپ تھا اور جس نے اپنے باپ دادا کی طرح تعلی کے شعبے کو ہی چنا تھا...... لیکن جو الیکشن سے چند دن پہلے حادثے کا شکار ہو گیا۔

اور عروج آپا کہتی تھیں، یہ اتفاقی حادثہ نہ تھا، قتل تھا۔ اور عروج آپا نے مرتضیٰ عباسَ قسم دے کر جو عمر میں اس سے زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن عباس شاہ کے مرنے کے بعد ا۔ بیٹوں کی طرح سمجھنے لگا تھا اور مرتے دم جس کے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں ۔ کر اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اس کے مشن کو آگے بڑھائے گا۔ وہ ظلم کے خلاف جنگ

جاری رکھے گا۔ اسی مرتضیٰ عباس کی قسم دے کر عروج آپا نے اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔

وہ اپنے دل میں گھٹن محسوس کرتا تھا...... جیسے اس کے سارے راستے بند کر دیئے گئے ہوں اور اس کے جذبوں کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا ہو۔ وہ لڑنا چاہتا تھا۔

ظلم کے خلاف۔

بدی کے خلاف۔

وہ اس ملک اور اس ملک کے رہنے والوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہاتھ بندھے تھے۔ ایک روز اس نے یونہی لیٹے لیٹے، ننھے شعیب کو سینے پر لٹائے لٹائے سوچا تھا۔

'ضروری تو نہیں کہ آدمی سیاست میں جائے۔ کہیں سے بھی آغاز کیا جا سکتا ہے...... کسی بھی جگہ رہ کر ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھائے جا سکتے ہیں۔'

اور تب وہ کمپیوٹر سنٹر میں اپنے ساتھیوں سے بحث کرتا، انہیں ظلم اور بدی کے خلاف احتجاج کرنے پر اُکساتا...... پھر ہولے ہولے سب قائل ہونے لگے۔ سب کو اپنی زندگی بے مقصد نظر آنے لگی۔

''ہاں یار، صحیح ہے۔ کیا فائدہ اس زندگی کا، کھاؤ پیو اور مر جاؤ۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔ کچھ بہتر کام۔''

تب مجاز نے اخبار نکالنے کی تجویز پیش کی تھی۔

''کیوں نہ ہم ایک اخبار نکالیں۔ ایک ہفتہ وار اخبار۔ جس میں برائیوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔''

''ہوں ...... بے کار۔'' اُسریٰ کی رائے تھی۔ ''لوگ اخبار پڑھ کر پھینک دیتے ہیں، کوئی اثر نہیں ہو گا۔ ہمیں کوئی عملی کام کرنا چاہئے۔''

''مثلاً......؟'' ایمل نے پوچھا۔

''کوئی تنظیم بنائیں۔ کوئی ویلفیئر قسم کی تنظیم۔''

''ایسی بے شمار تنظیمیں ہیں۔'' مشاہد نے کہا۔

''ہوتی رہیں۔ ہماری تنظیم اس سے مختلف ہو گی۔''

یوں روز تجاویز پیش ہوتیں، رد کر دی جاتیں۔ بالآخر وہ سب ایک اخبار نکالنے پر متفق ہو گئے تھے۔

ایک دفتر کرائے پر لیا گیا تھا۔ دو ماہ کی بھاگ دوڑ اور کچھ مشاہد اور مجاز کے پا
دوڑ دھوپ کے بعد وہ ڈیکلریشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اپنے اپنے
اور یونیورسٹی سے آکر وہ دو تین گھنٹے کام کرتے تھے۔

شروع شروع میں اخبار کافی کمزور تھا ...... کتابت کی غلطیاں ...... ناقص کاغذ
بیکار پرنٹنگ۔

پھر انہوں نے اسے حسن پرنٹنگ پریس میں چھپوانا شروع کیا، ہولے ہولے ا
بہتر ہو گیا۔ اس کے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ لوگ دبے لفظوں میں اس کی
باک صحافت کی تعریف کرنے لگے تھے اور ارتضٰی سوچنے لگا تھا کہ اب وہ اس اخبا
اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

یہ تین ماہ قبل کی بات تھی جب وہ لڑکی ستارا گلزار ان کے دفتر میں آئی تھی۔ کسی
اسے ان کے دفتر کا پتہ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو کچھ لوگوں سے چھپ کر یہاں چلی آئی تھ
کچھ لوگ اسکے تعاقب میں تھے۔ اس وقت دفتر میں صرف وجاہت، اُسریٰ اور زارا تھ
باقی لوگ ابھی نہیں آئے تھے۔

اس نے انہیں بتایا تھا کہ وہ بنگلہ دیش سے آئی ہے۔ وہ کچھ پڑھی لکھی تھی۔

"وہ لوگ یہاں اچھی نوکری دلانے کا لالچ دے کر مجھے لائے تھے۔ وہاں بہ
غربت ہے۔ میرا باپ بیمار ہے اور سات بہن بھائی ہیں۔"

پھر اس نے جو داستان سنائی تھی اسے سن کر سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

"دو دلال مجھے وہاں سے لائے تھے۔ میرے ساتھ کئی اور عورتیں اور لڑکیاں
تھیں۔ ہمارے ساتھ بہت بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ ہم نے غیر قانونی طور پر بارڈر کرا
کیا۔ کچھ دن ہمیں وہاں ہی سرحد پر رکھا گیا۔ لاہور آکر کچھ عورتوں کو کراچی بھیج دیا گیا
لیکن مجھے دلال نے اپنے پاس ہی رکھا۔ جب اس کا جی بھر گیا تو اس نے فروخت کر دیا۔

ستارا گلزار کی داستان بہت الم ناک تھی ...... وہ اسے دارالامان میں چھوڑ آئے، ا
وعدے کے ساتھ کہ بہت جلد وہ اس کے سفارت خانے سے رابطہ کر کے اسے بنگلہ دیش
بجھوا دیں گے۔

وجاہت نے اگلے ہفتے کے اخبار میں اس کی داستان چھاپ دی تھی ...... اُس
تصویر اور اس کے بیان کے ساتھ ...... اور پھر دو دن بعد وہ دارالامان سے غائب ہو گئ
وہ کہاں گئی تھی، کچھ پتہ نہ چلا۔ دارالامان والوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

وجاہت کو بہت غصہ تھا ...... وہ اس کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ صرف اُس کے لئے ہی نہیں ان سب کے لئے جو اس کے ساتھ بنگلہ دیش سے آئی تھیں ...... بلکہ سب ہی کچھ کرنا چاہتے تھے۔

یہ انتہائی گھناؤنا کاروبار ہے ...... مملکت اسلام میں، اس ملک میں جسے اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا ...... ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنا ہے ...... ان لوگوں کے خلاف جو یہ سب کر اور کروا رہے ہیں ...... کیا وہی جاہلیت کا دور واپس آگیا ہے جب انسانوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی؟

دفتر میں کئی دن تک ستارا کا تذکرہ رہا۔ یقیناً اسے مار دیا گیا تھا یا پھر غائب کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنی کہانی میں ایک سماجی شخصیت کا نام بھی لے دیا تھا جس کا ذکر مصلحتاً وجاہت نے اپنے مضمون میں نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ایک بار پھر ستارا سے تصدیق کروانا چاہتا تھا۔ اسے ثبوت چاہئے تھا، لیکن اس سے پہلے ہی ستارا غائب ہو گئی تھی۔

وجاہت بہت جذباتی تھا۔ اسے ستارا کے غائب ہو جانے کا بہت دُکھ تھا ......

"لعنت ہے ہم پر ...... ہم ایک لڑکی کی حفاظت نہیں کر سکے اور چلے ہیں برائیوں کے خلاف جہاد کرنے۔" وہ اکثر کہتا۔

"ہم یہاں سے ہی کیوں نہ اپنے کام کی ابتدا کریں؟" ارتضٰی نے تجویز پیش کی۔

اور پھر وہ سب ہی اپنے اپنے طور پر مصروف ہو گئے تھے۔ ارتضٰی، وجاہت، مجاز، مشاہد سب ہی۔

وجاہت تو تین بار کراچی بھی گیا۔ بہت سے لوگوں سے ملا۔ وہ وکلاء کی اس تنظیم سے بھی ملا جو "برائے انسانی حقوق" قائم کی گئی تھی اور اس پر بڑے لرزہ خیز انکشافات ہوئے تھے۔ سب کو بڑی حیرت تھی۔

تو ہمارے ملک میں، یہاں یہ سب ہو رہا ہے ......

عورتوں کی تجارت۔

بچوں کی تجارت۔

اس قدر ظلم۔

اور پسِ پردہ کس کے ہاتھ تھے؟

اُس نے جو کچھ جانا تھا، معلوم کیا تھا، وہ سب قسط وار اخبار میں چھاپنا شروع کر دیا تھا۔

کراچی میں وہ تنظیم وکلاء برائے انسانی حقوق کی مدد سے ان بنگلہ دیشی عورتوں سے بھی ملا تھا جو "حدود آرڈیننس" کے تحت جیل میں تھیں۔

سب کی ایک الگ کہانی تھی۔ لیکن سب کہانیوں کے پیچھے ایک ہی لوگ تھے۔ اس نے ان المناک داستانوں کو چھاپنا شروع کر دیا تھا۔ ایک ایک خاتون کی داستان کو۔

اور پھر دھمکیاں ملنے لگی تھیں۔

اخبار بند کروانے کی ...... قتل کر دینے کی۔

مگر ارتضیٰ اسے حوصلہ دیتا رہا۔

"ظلم کے سامنے جھکنا ظالم کو مضبوط کرنا ہے۔" وہ اپنے والد کی بات دُہرا دیتا۔ او

ابھی پچھلے ہفتے کے اخبار میں ہی تو اس نے لکھا تھا کہ ایک روز اچانک ان کے دفتر میں جانے والی ستارا بیگم نے ایک سماجی شخصیت کا نام لیا تھا کہ اس مذموم کاروبار کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے اور بنگلہ دیشی عورتوں کا کاروبار کرنے والے دلال اس کے کارندے ہیں۔

'وہ سماجی شخصیت کون ہے؟ یہ جاننے کے لئے اگلے ہفتے کا اخبار پڑھنا نہ بھولئے گا۔

اور پھر پیسے سے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی ...... اسے گلشن اقبال میں پلاٹ کی آفر کی گئی۔ اس لئے کہ وہ سماجی شخصیت آئندہ ہونے والے الیکشن میں کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ لیکن جب وہ وجاہت کو نہ خرید سکے تو انہوں نے اپنی دانست میں اسے راستے سے ہٹا دیا۔

رات ہسپتال میں پٹیوں میں جکڑے ہوئے وجاہت کو دیکھ کر ارتضیٰ کی آنکھوں کے سامنے بار بار شبیر شاہ کی خون میں نہائی لاش آتی رہی۔

مرتضیٰ عباس کے وہ آخری لمحے جب وہ سروس ہسپتال کے عام وارڈ میں بے ہوش پڑ تھا۔ اور پچھتاوا اس کی رگوں میں زہر سا گھولتا رہا۔

'یہ میں نے کیا کیا ...... کیوں کیا......؟'

'یہ میں ان سب کو کیوں ایسے راستے پر لے آیا ہوں جہاں کسی کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔'

"ارتضیٰ!"

بڑی دیر بعد اُسریٰ نے اسے آہستہ سے ہلایا ...... بہت سارا رو چکنے کے بعد وہ یونہی گھٹنوں پر سر دھرے چپ بیٹھا تھا۔

"ہوں......" اس نے سر اٹھا کر اُسریٰ کی طرف دیکھا۔

"تم ہی حوصلہ ہار دو گے تو ہم سب کیا کریں گے؟"

"تمہیں پتہ ہے نا اُسریٰ! تم جانتی ہو نا، وہ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ اپنی بیوہ ماں کا واحد سہارا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"

"آؤ ارتضیٰ! ہم ...... ہم نماز پڑھ کر خدا سے دعا مانگیں اس کی زندگی کی۔" اُسریٰ کھڑی ہو گئی۔

ارتضیٰ نے سر اٹھا کر کلاک کی طرف دیکھا، تین بج رہے تھے۔ سب کو گئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا اور ابھی تک کوئی واپس نہیں آیا تھا...... پتہ نہیں کیا ہوا تھا ...... نہ جانے اس کا کیا حال تھا۔

اُسریٰ وضو کرنے جا چکی تھی۔ پھر دونوں نے نماز پڑھی۔

اُس کی زندگی کی دعا مانگتے ہوئے اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"یا اللہ اُسے زندگی دینا۔"

پتہ نہیں، وہ اتنا کمزور کیوں ہو رہا تھا۔ شاید وہ اپنے باپ، چچا اور بھائی کی طرح بہادر نہیں تھا ...... وہ بدی کے خلاف جنگ کرنا بھی چاہتا تھا لیکن اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا۔

شبیر شاہ کی موت نے عباس علی شاہ کے حوصلوں کو زیادہ مضبوط کر دیا تھا لیکن وجاہت کے زخمی ہونے سے وہ سارے حوصلے ہار بیٹھا تھا۔

"چائے پیو گے ارتضیٰ؟" اُسریٰ نے نماز پڑھ کر پوچھا۔

"ہاں، ایک کپ پلیز۔"

"تم نے شاید رات سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔"

اُسریٰ نے اٹھ کر چولہا جلایا۔ یہیں دفتر کے ایک کونے میں انہوں نے گیس کا ایک چولہا لگوا رکھا تھا۔ کیتلی، خشک دودھ، چائے، چینی وغیرہ الماری میں ہر وقت رکھی رہتی تھی۔ جب وہ لوگ کام کر کے تھک جاتے تھے تو پھر چائے بنائی جاتی تھی۔

'چند دن پہلے یہاں کتنی رونق تھی۔' اُسریٰ نے کیتلی چولہے پر رکھتے ہوئے سوچا۔ 'کل ہی تو وجاہت کتنا پُرجوش لگ رہا تھا۔'

'اگر ہم ان لوگوں کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو گئے اور جیل بھجوا سکے تو یہ ہماری پہلی فتح ہو گی۔'

پہلا اچھا عملی کام۔

پھر ارسلان اور زارا کی نوک جھوک۔

سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔
وہ سب ایک گھر کے افراد کی طرح ہو گئے تھے...... اور اب اگر وجاہت...... اوہ نہیں خدایا......

اس نے کانپ کر ارتضٰی کی طرف دیکھا۔ وہ کسی کو فون کر رہا تھا اور اب اس کے چہرے پر قدرے اطمینان تھا۔ بہت دیر تک وہ نمبر ملاتا رہا اور پھر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''ہسپتال کا نمبر بزی ہے۔'' اس نے اُسریٰ کو بتایا اور الماری سے پیالیاں نکالنے لگا تب ہی دروازہ کھلا اور ایمل اور مجاز اندر داخل ہوئے۔ اُسریٰ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔ ایمل نے اس کے کندھے تھپکے۔

''وہ ہوش میں آگیا ہے۔''

''تھینک گاڈ۔''

ارتضٰی جو انہیں آتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا پھر بیٹھ گیا۔

''لیکن ڈاکٹرز نے ابھی پولیس کو اس کا بیان لینے کی اجازت نہیں دی۔''

اُسریٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ڈاکٹر عبدالرب نے اُمید دلائی ہے۔'' مجاز نے ارتضٰی کے پاس بیٹھتے ہوئے بتایا۔

اُسریٰ نے سب کو چائے دی۔

چائے پیتے ہوئے مجاز وجاہت کے متعلق بتاتا رہا کہ اُسے کہاں کہاں زخم لگے ہیں کتنا خون بہا ہے، کون سا زخم گہرا ہے۔

''ارتضٰی نے رات اسے خون دیا تھا۔ اب مشاہد اور اس کی بہن نے دیا ہے۔ خون ہوا ہے لیکن وہ سکون میں ہے اب۔'' اُس نے اُسریٰ کو تسلی دی۔

''اب میں چلتی ہوں۔'' چائے پی کر اُسریٰ کھڑی ہو گئی۔ ''دیر ہو گئی تو بابا جا ناراض ہوں گے۔ میں آج بتا کر بھی نہیں آئی تھی کہ دیر ہو جائے گی۔''

''چلو، میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔'' ایمل نے کہا۔ پھر ارتضٰی کی طرف مڑی۔ ''تم بھی اب گھر جا کر آرام کرو۔ تم نے خون بھی دیا ہے۔''

''نہیں، میں اب ہسپتال جاؤں گا۔'' ارتضٰی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں ارتضٰی! تم اس وقت گھر جاؤ۔ رات سے نکلے ہو۔ مشاہد وہاں موجود ہے ارسلان بھی...... میں اپنے اور مشاہد کے گھر بتا کر واپس ہسپتال جا رہا ہوں۔ ارسلان

بھی گھر بھیج دوں گا۔ آج رات ہم دونوں رہیں گے وہاں۔ تم دونوں ریلیکس ہو جاؤ۔''
مجاز بولا۔

''ایمل!'' وہ ایمل کی طرف مُڑا۔ ''تم ہمیں بھی ڈراپ کر دو گی؟''

''کیوں نہیں۔''

ارتضٰی کا ہاتھ پکڑ کر وہ ایمل اور اُسریٰ کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔

''خان!'' اُس نے اونگھتے ہوئے لڑکے کو دفتر بند کرنے کے لئے کہا۔ اس پٹھان لڑکے کو چند روز قبل ہی رکھا گیا تھا۔ وہ دفتر میں ہی سوتا تھا اور چھوٹے موٹے کام کر لیتا تھا۔ جب وہ لوگ آتے تو وہ برآمدے میں بیٹھا رہتا تھا۔

ایمل نے ارتضٰی کو اس کے گھر کے قریب ڈراپ کیا۔

''آنا تم سب لوگ...... تمہیں اپنی ماں جی اور عروج آپا سے ملواؤں۔'' ارتضٰی نے دعوت دی۔

''پھر کسی دن......'' ایمل نے معذرت کی۔ ''اب تمہارا گھر دیکھ لیا ہے، کسی دن حملہ کریں گے۔''

چند ماہ قبل ہی ارتضٰی نے یہ فلیٹ کرائے پر لیا تھا اور ماں جی، عروج اور بچوں کو لے آیا تھا۔ جب سے اخبار کا سلسلہ شروع ہوا تھا، کئی ویک اینڈ یوں ہی گزر جاتے اور وہ گھر نہ جا پاتا...... ماں جی نے دو تین بار شکایت کی۔

''رنی! تجھے پتہ ہوئے نا شیبی اور صیبی ایک ایک دن گن کر گزارتے ہیں اور جب تُو نہیں آتا تو زرد سے منہ نکل آتے ہیں ان کے۔''

تب اُس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ سب کو ساتھ ہی لاہور لے آئے۔ یوں بھی اب بچوں کی پڑھائی کا مسئلہ بھی ہو گا۔ وہ چاہتا تھا کہ شیبی کو کسی اچھے سکول میں داخل کروائے لیکن وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ یونیورسٹی سے سیدھا وہ دفتر چلا جاتا تھا اور پھر سب کے جانے کے بعد بھی وہ دیر گئے تک کام کرتا رہتا تھا۔

عروج نے اسے دیکھ کر شکر کا سانس لیا۔ شعیب اور صہیب اچھلنے کودنے لگے۔ اس نے دونوں کو لپٹا لیا۔

''چاچو آ گئے...... چاچو آ گئے۔''

''میں تو اب پریشان ہو گئی تھی رنی!'' عروج نے بچوں کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا دوست ٹھیک تو ہے نا...... زیادہ زخمی تو نہیں ہوا نا...... کیا ہوا تھا اُسے......

ایکسیڈنٹ؟"

"ہاں۔" اس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

"اب کیسا ہے؟"

"ابھی حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔"

"تم رات ہسپتال میں ہی تھے؟"

"ہاں...... ماں جی کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں...... تم کھانا کھاؤ گے یا چائے بناؤں؟"

"کچھ بھی نہیں آپا۔ ماں جی کو سلام کر کے سو جاؤں گا کچھ دیر۔"

"چلو، چاچو کو تنگ نہ کرو۔" عروج نے بچوں کو سمجھایا۔ اور وہ بچوں کے رخسار تھپتھپاتا ہوا اندر بڑھ گیا۔

***

"اس شہر کے کچھ لوگوں کا اغوا برائے تاوان ہوا
عادل تھے کہاں، قاضی تھا کہاں
انصاف کا کیسے خون ہوا
یہ کیسے ہوا
جس شہر کے قاضی موٹے ہوں
اس شہر کے اخباروں میں اکثر یونہی چھپتا ہے
اکثر ایسا ہوتا ہے"

ارسلان اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا۔

"ہیئر، ہیئر......" اُسریٰ اور ایمل نے تالیاں بجائیں۔

"کیا ابھی ابھی آمد ہوئی ہے؟" مجاز نے کام کرتے کرتے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ارے نہیں......" ارسلان ہنس دیا۔ "کچھ دن ہوئے ایک میگزین میں دیکھی تھی، ذہن میں رہ گئی۔ اب یہ خبر دیکھ کر خیال آ گیا۔" اس نے خبر پڑھی...... "کراچی کی ایک مشہور شخصیت کا اغوا...... اغوا کنندگان نے پچیس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔"

"بائے دی وے یہ شخصیت ہیں کون؟"

"ایک بزنس مین ہیں بھائی! کچھ دن ہوئے امریکہ سے آ کر یہاں سیٹل ہوئے ہیں۔"

"اب تو پچھتا رہے ہوں گے بے چارے کہ کیوں آئے......" اُسریٰ نے کہا۔

"ان کی بازیابی کی کوشش نہیں کی گئی کیا؟" ایمل نے پوچھا۔

"اتنی ننھی مت بنو گڑیا۔ پولیس مجرموں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ تاوان ادا کر دیا جائے گا تو پولیس بندے کو بھی بازیاب کر لے گی۔" ارسلان نے سمجھایا۔

مشاہد جو بڑی خاموشی سے ایک طرف کونے میں بیٹھا کام کر رہا تھا اس نے ارسلان کو ٹوکا۔ "کام کے دوران مت بولا کرو۔ دیکھو، ساری گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیا کر دیا ہے؟" ارسلان نے آگے ہاتھ بڑھا کر اس کے سامنے پڑے ہوئے کاغذ اٹھا لیے۔

"ہمارے تعلیمی نظام کے قاضی موٹے ہیں۔ نصاب کو تبدیل کرنے کے لئے عادل تھے کہاں؟"

"ہاہاہا......" ارسلان زور زور سے ہنسنے لگا۔

مشاہد نے جھینپ کر کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لئے۔ "ایک تو تم اتنا اونچا بولتے ہو نا۔"

"مرد بچہ ہوں۔ تمہاری طرح مِن مِن تو نہیں کرتا۔"

"اچھا مرد کے بچے صاحب! کام کرنے ہیں ابھی۔ ارتضیٰ آئے گا تو خواہ مخواہ شرمندگی ہو گی۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے آنے تک سب کے آرٹیکل مکمل ہوں۔"

"جناب۔" ارسلان نے پیپر ویٹ کے نیچے دبے ہوئے کاغذوں کا پلندہ اٹھایا۔

"ہمارا کام مکمل ہے۔ پورے ہفتے کی خبروں کا نچوڑ یہ رہا۔"

"ارسلان! وہ نظم جو ابھی تم پڑھ رہے تھے، کیا خیال ہے، اسے بھی نہ لگا دیں؟"

ایمل نے پوچھا۔

"لیکن مجھے شاعر کا نام یاد نہیں۔" ارسلان پھر نظم پڑھنے لگا۔

"جس شہر کے قاضی موٹے ہوں
اُس شہر کے اخباروں میں
اکثر یونہی چھپتا ہے
اکثر ایسا ہوتا ہے

یار! یہ قاضی اتنے موٹے کیوں ہوتے ہیں؟" اس نے مجاز سے پوچھا۔

"پلیز ارسلان! تمہارا کام مکمل ہو گیا ہے اور ہمارا ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ میرا

ارادہ ہے کہ کام جلدی ختم ہو جائے تو ذرا وجاہت کی طرف چلیں گے۔''

''وجاہت اب بالکل ٹھیک ہے ...... یونیورسٹی بھی جا رہا ہے لیکن دفتر کیوں نہیں آتا؟''

''شاید وہ ابھی کمزوری محسوس کرتا ہو۔''

''لیجئے وہ آ گئے ...... وہ کیا کہتے ہیں، ادھر شیطان کا نام لو، ادھر شیطان موجود ...... آیئے آیئے جناب وجاہت علی صاحب! دفتر میں دو ماہ بعد دوبارہ آمد مبارک ہو۔''

''بہارو پھول برساؤ، مرا محبوب آیا ہے۔'' ارسلان اُسریٰ کی طرف دیکھ دیکھ کر گانے لگا۔

''بھانڈ لگ رہے ہو بالکل۔''

''بھانڈ تو خیر یہ پیدائشی ہے۔'' مجاز نے قلم ایک طرف رکھتے ہوئے وجاہت سے کہا۔

''آؤ جی، ادھر آؤ۔ میں آج تمہاری طرف آنے کا سوچ رہا تھا۔'' اس نے اپنے قریب پڑے اخباروں کے پلندے کو ایک طرف کر کے اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔ زمین پر دری بچھی تھی اور وہ سب دری پر بیٹھ کر ہی کام کرتے تھے۔ ''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''اب تو بہتر ہوں۔'' وجاہت اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

سب اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ہم سب نے تمہیں بہت مس کیا۔'' ایمل نے کہا۔

''اور خاص کر اُسریٰ نے۔'' ارسلان نے لقمہ دیا۔ وجاہت نے چونک کر اس طرف دیکھا۔

''اسے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ اس نے ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ بلکہ ہمیں خود ہی چل گیا ہے کہ دال میں کچھ کچھ کالا ہے۔''

ارسلان ان میں سب سے زیادہ شوخ تھا اور کام کرتے ہوئے بھی اس کی زبان مسلسل چلتی رہتی تھی۔

''ویسے یار! تم ہو بڑے گھنے۔'' مجاز نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ''اتنے دنوں سے لوگ ساتھ ہیں اور تم نے ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ تم دونوں نہ صرف کزن ہو بلکہ منگیتر ہو۔ بائی دا وے تم نے ہم سے اتنی بڑی بات چھپائی کیوں؟''

''یونہی، اُسریٰ نے ذکر نہیں کیا تو میں نے بھی نہیں بتایا۔'' وجاہت نے آہستگی سے کہا۔

''تو پھر تمہاری سزا یہ ہے کہ تم دونوں مل کر ہمیں ٹریٹ دو اور ہم یہاں اس دفتر میں تمہاری منگنی کا فنکشن سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم نے تمہاری منگنی میں شرکت نہیں کی تھی اس لئے۔''

''ہماری کوئی باقاعدہ منگنی تو نہیں، بس بچپن میں ہی بات ہو گئی تھی۔'' وجاہت نے وضاحت کی۔

''پہلے تو تم دو نا ٹریٹ وجاہت کے آنے کی خوشی میں۔'' ایمل نے کہا۔

''مگر میں تو غریب آدمی ہوں۔'' ارسلان نے چہرے پر مسکینی طاری کر لی۔ ''تم بڑے باپ کی بیٹی ہو، تم دو نا ٹریٹ۔''

''اور یہ غریب آدمی جو کل بیس ہزار کا ڈرافٹ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا رہا تھا، وہ چوری کا مال تھا؟''

''ارے نہیں ...... میرے باپ کی حق حلال کی کمائی تھی۔'' ارسلان نے تیزی سے کہا۔ ''تمہیں پتہ ہے ایمل! یہ جو ہم متوسط طبقے کے لوگ ہوتے ہیں نا جب ہمارے باپ یا بھائی عرب ریاستوں میں کمانے کے لئے چلے جاتے ہیں تو ہم پیچھے رہ جانے والے ان کی بھیجی ہوئی رقم کو اس طرح بے دردی سے خرچ کرتے ہیں جیسے وہاں روپے درختوں پر لگے ہوں اور انہیں بغیر محنت کئے مل جاتے ہوں۔ لیکن میری ماں ایسی نہیں ہے ایمی! جب ابو باہر گئے تھے تو انہوں نے ہم سے کہہ دیا تھا کہ انہیں زیادہ عرصہ باہر نہیں رہنا۔ بس اس حد تک کہ اتنا سرمایہ جمع ہو جائے کہ وہ یہاں اپنا بزنس کر سکیں۔ کوئی چھوٹا موٹا سا کاروبار۔ سو میری ماں ابو کے بھیجے ہوئے پیسوں کو بے کار میں ضائع نہیں کرتی۔''

''اوہو ارسلان! تم سنجیدہ ہو گئے۔ چلو میں ہی ٹریٹ دے رہی ہوں۔'' ایمل نے اسے ٹوک دیا۔

''آج بات چلی ہی ہے تو چلو تمہیں بتا ہی دوں۔'' ارسلان ابھی بھی سنجیدہ تھا۔

''میرے والد گریڈ سترہ کے ایک ایماندار آفیسر تھے۔ وہ خود رشوت لیتے تھے نہ کسی کو دیتے تھے۔ سو زندگی کو ان کے لئے مشکل بنا دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیئے گئے ...... تب ہی مایوس ہو کر وہ باہر چلے گئے۔ اور پتہ ہے جب ارتضیٰ ہمیں

برائیوں کے خلاف جہاد کرنے پر اُکسا رہا تھا تو میں نے سب سے پہلے جو اس کا سا دینے کا اعلان کیا تھا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کبھی میں اس موضوع پر آرٹیکل لکھوں گا۔“

”ضرور لکھنا یار! مگر اس وقت ٹریٹ کی بات ہو رہی تھی، وجاہت کے آنے کی خو میں۔“ مجاز نے موضوع بدلا۔

”اوہ ہاں ...... کیا کھائیں گے سب؟“ ایمل نے پوچھا۔ ”کوک اور سموسے منگوا لو گی۔“

”نہیں۔“ مشاہد نے صاف انکار کر دیا۔ ”بھوک لگی ہے۔ کالج سے سیدھے اد جاتے ہیں۔ کھانا منگوایا جائے اور ٹریٹ سب کی طرف سے ہو گی۔ سب شیئر کر لی گے۔“

”خان!“ بات ختم کر کے مشاہد نے آواز دی۔

”جی صاحب!“ ملازم لڑکا فوراً ہی دروازے پر نمودار ہوا۔

”جا بھاگ کر سامنے حاجی سے کہہ آ، ایک کڑاہی گوشت اور ایک درجن سیخ کبا اور دس بارہ نان بھجوا دے۔“

”جی صاحب!“ لڑکا واپس چلا گیا۔

”ہاں یار، وہ تمہارے زخمی ہونے کی وجہ سے تمہارے مضامین کا سلسلہ تو رک گیا۔ بڑے خطوط آئے یار۔ بہت سے لوگ تو اس سماجی شخصیت کا نام جاننا چاہ ر تھے۔ کچھ لوگوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اس سلسلے کو ختم نہ کیا جائے۔ یہ کہانیاں بدستور جاری رہنی چاہئیں۔“ مجاز اٹھ کر کونے میں پڑی میز کی دراز سے خطوط نکالنے لگا۔ ”دیکھو، یہ رہے اتنے ڈھیر سارے خطوط ......“ اس نے خطوط کا ایک بنڈل وجاہت کے سامنے ڈال دیا۔ ”یار! ایک خاتون نے کسی دور دراز دیہات سے بڑا دردناک خط لکھا ہے، اس پر میں نے ریڈ مارکر سے نشان لگا دیا تھا۔ دیکھو نا۔“

وجاہت نے خطوط کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ صرف سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”بھئی اس خاتون نے اپنی درد بھری داستان سنا کر خواہش ظاہر کی ہے کہ اس کے متعلق بھی کچھ لکھا جائے۔ کوئی صاحب اس بیوہ خاتون کے اکلوتے بیٹے کو لاہور میں ملازمت دلوانے کا لالچ دے کر لے گئے اور پھر وہاں سے دبئی اسمگل کر دیا جہاں اونٹوں کی دوڑ میں اسے استعمال کیا گیا اور دوڑ کے دوران خوف سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

”بہت لوگ لکھ رہے ہیں اس موضوع پر۔“ وجاہت نے جواب دیا۔ ”بے شمار مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ اگر ہمارے اخبار میں خاتون کا خط چھپ بھی گیا تو کیا فرق پڑے گا؟“

مجاز نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ”یار! تم کچھ بدل نہیں گئے ہو؟“

”نہیں تو ...... تمہارا وہم ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

”میں نے یہاں دفتر میں تمہارے مضامین بہت تلاش کئے لیکن کچھ نہیں ملا۔“ ”شاید تم سب مواد گھر لے گئے تھے۔“

”ہاں۔“

”ایک بات تو بتاؤ وجی! وہ جو ستارا گلزار نے سردار جہانگیر کا نام لیا تھا، کیا حقیقت تھی؟ کیا اس کاروبار کی پشت پر وہ بھی ہے؟ یار یقین نہیں آتا۔ وہ تو جدی پشتی رئیس ہے۔ بھلا دس ہزار روپے اس کے لئے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ یہ ستارا ہی نے بتایا تھا نا کہ اسے دس ہزار روپے میں فروخت کیا گیا ہے۔“

”پتہ نہیں یار!“

”کیوں ...... رنی کہہ رہا تھا کہ تمہیں پروف مل گئے تھے۔“ مجاز نے پوچھا تو وجاہت نے نظریں چرا لیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے وجی، کیا تم پھر سے وہ سلسلہ شروع کر رہے ہو؟“ مشاہد نے پوچھا تو وجاہت نے نظریں چرا لیں۔

”فی الحال تو مشکل ہی ہے ...... تمہیں پتہ ہے، کتنی ٹف پڑھائی ہے۔“

”ایسا کرو، تم نے اب تک جو مواد اکٹھا کیا ہے، وہ مجھے دے دو، میں اس پر کام کروں گا۔“ ارسلان نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر آج تمہارے ساتھ چلوں ...... تم مجھے وہ سارا مواد دے دینا یار! میرا دل چاہتا ہے کوئی دھماکہ خیز کام کروں۔ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دوں۔“

”اچھا حضرات، اب خوابوں کی دنیا سے باہر آ جائیں۔ اس لئے کہ کھانا آ گیا ہے۔“ اُسریٰ نے کھلے دروازے سے حاجی بابا کے چھوٹے کو ٹرے اٹھائے آتے دیکھ کر کہا۔

”ایک تو تم اُسریٰ! ہمیشہ میرے خوابوں میں ٹانگ اڑا دیتی ہو۔ کبھی تم نے مجھے بات پوری کرنے نہیں دی۔“

”حالانکہ ہمارے ان سیون اسٹارز میں سب سے زیادہ بک بک تم کرتے ہو۔“

''خدا کا غضب اُسریٰ! تم میری بے چاری غریب کزن کو ہمیشہ بھول جاتی ہو۔ اس کا دل پہلے ہی بہت نازک ہے۔ تمہیں ایٹ اسٹارز کہنا چاہئے لیکن تم......''

''مگر وہ باقاعدگی سے تو ادھر نہیں آتی نا۔''

''بھلے نہ آئے (آخر اسے دو دو صفحے کے ناولٹ بھی تو لکھنے ہوتے ہیں) مگر ہے تو ہماری کولیگ نا۔''

''اچھا بابا...... اب بحث ختم کرو اور ہاتھ دھو کر آ جاؤ کہ پھر کام بھی ختم کرنا ہے۔''

اُسریٰ نے بات ختم کر دی۔

اور جب وہ زور و شور سے کھانا کھانے میں مصروف تھے تو ارتضیٰ آ گیا۔

''ہیں......'' دروازے کی دہلیز پر ہاتھ رکھے رکھے ارتضیٰ نے ان کی طرف دیکھا۔ ''یہ سیخ کباب اُڑائے جا رہے ہیں۔ یہ کام ہو رہا ہے۔''

''دراصل وہ وجاہت کے آنے کی خوشی میں ٹریٹ دی جا رہی ہے۔''

''یہ کس نے حاتم کی قبر پر لات ماری ہے؟'' ارتضیٰ اندر آ گیا۔

''ظاہر ہے، ایمل ہی یہ کارنامہ سرانجام دے سکتی ہے......'' ارسلان نے ایک پورا کباب منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ ارتضیٰ کی نگاہیں لمحہ بھر کے لئے ایمل کے چہرے پر ٹھہر سی گئیں۔ ''اور اس طرح ایمل بی بی! کیا ہماری عادتیں خراب نہ ہو جائیں گی؟ بھئی، ہم تو چنے کھا کر کام کرنے والے لوگ ہیں۔''

ایمل کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

''ہم سب شیئر کر رہے ہیں۔'' اُسریٰ نے جواب دیا۔ ''تم بھی آ جاؤ۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''بھئی وہ شیبی کو سکول میں داخل کروانے کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ میں جس سکول میں اسے داخل کروانا چاہ رہا ہوں وہاں داخلہ نہیں مل رہا۔''

''وجہ؟...... کیا شیبی ٹیسٹ میں رہ گیا ہے؟'' اُسریٰ نے پوچھا۔

''نہیں...... ٹیسٹ میں اس نے 85 فیصد مارکس لئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے، سیٹ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اصل مسئلہ ڈونیشن ہے۔ میں اگر ان کے سکول کو دس بیس ہزار ڈونیشن دے دوں تو ایک منٹ میں داخلہ مل جائے۔ بہرحال دنیا میں اس قسم کے مسائل تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ بتاؤ کیا کچھ کیا؟ اور وجی! تم کیسا محسوس کر رہے ہو اب؟''

''اچھا ہوں۔'' وجاہت بہت سنجیدہ اور خاموش سا تھا۔

کھانا کھا کر وہ سب اپنے اپنے کام میں جُت گئے تھے۔ وہ ایک طرف خاموش بیٹھا انہیں کام کرتے دیکھتا رہا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' بہت دیر بعد ارتضیٰ نے کام کرتے کرتے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''تم پریشان ہو کچھ؟''

''نہیں تو۔''

''ایسا کرو وجی! وہ سارا مواد جو تم نے اکٹھا کیا تھا، مجھے دے دو۔''

''تم سے پہلے میں اسے آفر کر چکا ہوں۔'' ارسلان نے جو میز پر آلتی پالتی مارے بیٹھا سب کو کام کرتے دیکھ رہا تھا، کہا۔ ''دراصل مجھے شہید ہونے کا بڑا شوق ہے۔ میرا دل چاہتا ہے سردار جہانگیر کے بندے مجھے شہید کر دیں۔ یار! تم لوگ وعدہ کرو مجھ سے، میرے مرنے کے بعد زبردست نمبر نکالو گے میرے اوپر......''

''تم ہمیشہ اُلٹی ہی بات کرنا۔'' مجاز نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''اب ایسا بھی ظلم نہیں ہے کہ یوں چند آرٹیکل لکھنے پر آدمی کو مار دیا جائے۔''

''وہ سارا مواد جانے کہاں گیا؟ جن دنوں میں ہسپتال میں تھا، بس اِدھر اُدھر کہیں ضائع ہو گیا۔'' وجاہت نے پیپر ویٹ سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

ارتضیٰ لمحہ بھر اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''پانچ بجنے والے ہیں اور میں نے پانچ بجے واپسی کا بتایا تھا۔'' اُسریٰ نے قلم بند کر کے رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے، تم جاؤ اور اگلے ہفتے کے لئے میں نے سروے کا ٹاپک تمہیں دے دیا ہے نا؟'' ارتضیٰ نے پوچھا۔

''ہوں۔'' اُسریٰ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تب ہی دروازہ کھلا اور زارا ہانپتی کانپتی اندر داخل ہوئی۔

''اوہ خدایا...... شکر ہے، تم لوگ ابھی یہاں ہو۔''

''کیوں خیریت؟'' ارتضیٰ نے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے۔ بس وہ میں نے ایک مختصر سا افسانہ لکھا تھا۔ سوچا تمہارے اخبار کے لئے دے دوں۔ سچی، مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

وہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی۔

"لیکن خاتونِ محترم! آپ کو شاید علم نہیں ہے کہ ہمارے اس اخبار میں افسانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" ارسلان نے میز پر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"تو آپ بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ آپ وہاں کیوں ٹنگے ہوئے ہیں؟"

"اس لئے کہ میں سب سے بلند ہوں اور بلند لوگ ہمیشہ بلند مقامات پر پائے جاتے ہیں۔"

"تو مسٹر بلند صاحب!" زارا نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہفتہ وار اخبار میں سب کچھ ہونا چاہئے۔ یعنی ہفتے بھر کی خبروں کا تجزیہ، سیاسی و معاشی صورتِ حال پر تبصرے، سیاسی و سماجی شخصیات کے انٹرویوز، سروے، شوبزنس سے متعلق گرما گرم خبریں، افسانے، نظمیں، غزلیں۔"

"مگر بی بی! ہمارا اخبار ذرا منفرد قسم کا ہے۔"

"اسی لئے تو اس منفرد اخبار کی سرکولیشن صفر کے برابر ہے۔" زارا طنز سے ہنسی۔

"آج کی دنیا گلیمر کی ہے بھائی! اخبار کو چلانا ہے تو اس میں یہ سب شامل کرنا پڑے گا۔ منفرد تو یہ اپنے تبصروں، اپنے سروے اور انٹرویوز کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔"

"زارا صحیح کہتی ہے ارسلان!" ارتضٰی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "دکھانا زرا اپنا افسانہ۔"

زارا نے بیگ کھول کر افسانہ نکالا جسے ارسلان نے اُچک لیا۔ "پہلے میں تو اوکے کر دوں۔ آہا، بی بی، یہ مختصر افسانہ ہے؟ ہمارے بے چارے اخبار کے سارے صفحات بھی ناکافی ہیں۔" اس نے ہاتھوں پر اسے تولتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا پتہ مختصر افسانہ لکھنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اور میں تو یوں بھی طویل افسانے لکھتی ہوں اور یہ تو خاص کر میں نے اپنے اخبار کے لئے مختصر کر کے لکھا ہے۔" زارا نے وضاحت کی۔

"سنئے ارتضٰی بھائی! بی بی کیا لکھ رہی ہیں۔" ارسلان افسانے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ "وہی ظالم انداز...... وہی چھ کنال پر پھیلا ہوا گھر...... ماربل کے ستون...... امپورٹڈ ڈیکوریشن پیس...... اور بے چاری شہرین بی بی اس وسیع گھر میں گھٹن کا شکار۔ ڈائمنڈ اور وائٹ گولڈ۔"

"ارسلان! دے دو میرا افسانہ۔" زارا نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے افسانہ چھین لیا۔

"لے لو...... یوں بھی یہ ہمارے اخبار کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔"

"یہ تمہارا اخبار نہیں ہے۔" زارا روہانسی ہو رہی تھی۔

"ہم سب کا ہے۔" ارسلان نے جواب دیا۔ ویسے جس ملک میں اتنی غربت ہو، اس قدر کرپشن، رشوت، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی جیسی لعنتیں عام ہوں اور نوکر شاہی وسیع پیمانے پر کردار کے قحط میں مبتلا ہو، وہاں محلات کی باتیں کرنا کیا فریب نہیں ہے؟ کیا یہ خیالی اور تصوراتی محبت کی کہانیاں دھوکا نہیں ہیں اپنے آپ سے اور معاشرے سے؟"

"ہیئر، ہیئر۔" مجاز نے تالیاں بجائیں۔ "ہمیں یقین آ گیا ہے کہ تم اچھے ڈیبیٹر ہو۔"

"وہ تو خیر میں ہوں۔" ارسلان نے اپنے کالر جھاڑے۔

"تم جان بوجھ کر مجھے ہمیشہ مایوس کرتے ہو۔" زارا نے بیگ کی زپ کھول کر افسانے کے کاغذ اندر ٹھونستے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "دراصل تم جلتے ہو مجھ سے...... تم نہیں چاہتے کہ میں لکھوں اور میرا نام ہو۔ یہ جس طرح میں لکھتی ہوں نا اس طرح لکھنا بھی کوئی آسان نہیں ہے۔"

"ہاں ظاہر ہے...... ایسے جناتی نام تلاش کرنے میں بہت وقت لگتا ہوگا۔"

"ارسلان پلیز، کیوں تنگ کر رہے ہو اسے؟" ارتضٰی نے اسے ٹوکا۔

"یہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔" زارا نے ارتضٰی سے شکایت کی۔ "میں نے اتنے شوق سے لکھا تھا۔"

"تم ایسا کرو زارا، ایک مختصر سا افسانہ لکھو۔ کسی ہلکے پھلکے موضوع پر ہی سہی، لیکن مختصر ہو۔ تمہیں پتہ تو ہے نا اخبار میں طویل کہانیاں نہیں چھپ سکتیں۔"

"جی......" زارا نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو انگلیوں سے پونچھا۔ "میں کوشش کروں گی۔ لیکن ارتضٰی بھائی، محبت کے موضوع پر لکھنے میں کیا حرج ہے؟ آخر یہ بھی تو زندگی کا حصہ ہے۔"

"دیکھو ارتضٰی! تم نے......" ارسلان نے میز سے چھلانگ لگائی۔ "اس کے سر پر سے گزر گیا ہے وہ سب کچھ جو تم نے ابھی اس کے گوش گزار کیا تھا۔ بی بی! یہ محبت وغیرہ سب کتابی باتیں ہیں۔ تمہیں لکھنا ہے تو سردار جیسے آدمیوں پر لکھو جو سچ لکھنے والوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔"

وجاہت کا رنگ ایک دم پیلا پڑ گیا، لیکن ارسلان کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔

"یا پھر ان مظلوم عورتوں پر لکھو جو اغوا ہو جاتی ہیں...... ان بچوں پر لکھو جو پڑھ نہیں سکتے اور جنہیں اونٹوں کی دوڑ میں استعمال کیا جاتا ہے...... ان بے روزگاروں پر لکھو جن

کے پاس سفارش کی پرچی نہیں ہے...... اُن......"

"نہیں لکھنا مجھے کسی پر۔" زارا ایک دم کھڑی ہوگئی۔ "خود لکھتے رہو ان سب پر۔"

"ارے، ارے...... زارا، گڑیا! بیٹھو۔" ارتضٰی نے اسے روکا۔ "یہ تو یونہی بک رہا ہے...... اور خبردار......" وہ ارسلان کی طرف مڑا۔ "جو آئندہ تم نے اسے تنگ کیا۔"

"نہیں، میں جا رہی ہوں۔"

"ناراض نہیں ہوتے۔ یہ یونہی تمہیں تنگ کرتا ہے۔ تم اچھا لکھتی ہو۔ اور مجھے یقین ہے تم اس سے بھی اچھا لکھو گی۔ اور ایک دن تمہارا بڑا نام ہوگا۔"

"مگر یہ تب بھی مجھے تسلیم نہیں کرے گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں تسلیم کروں یا نہ کروں، تمہارے ہونے والے "وہ" تو مانتے ہیں نا تمہیں۔"

"ارسلان!" وہ اسے مارنے کے لئے اس کی طرف لپکی اور خود ہی دھپ سے ز پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"رُلا دیا نا تم نے اسے۔" ارتضٰی نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس کا اسٹیمنا ہی اتنا ہے۔" ارسلان نے لاپرواہی سے کہا۔ "حالانکہ میں نے ا صرف حقیقت کا چہرہ دکھایا تھا کہ اس خیالی وتصوراتی محبت کے جال سے باہر آ جائے۔"

زارا بدستور اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ ایمل اسے چپ کرانے لگی۔ بڑی دیر اس کے آنسو تھمے تو ایمل نے آہستگی سے کہا۔

"ارسلان! تم نے کبھی سنجیدگی سے زارا کی کوئی کہانی پڑھی ہے؟"

"نہیں۔" ارسلان نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے پڑھی ہیں۔ زارا بہت خوبصورت لکھتی ہے۔ اس کا اپنا ایک اسٹائل ہے اور محبت بھی زندگی کا ایک حصہ ہے۔"

"ہرگز نہیں...... یہ محبت صرف خواتین کی کہانیوں میں ہی ملتی ہے اور کہیں نہیں۔ آپ بتائیں، آپ جو اتنی خطرناک حد تک خوبصورت ہیں اور یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں تو لڑکے اب تک آپ کی محبت میں مبتلا ہو چکے ہیں؟"

ایمل کا رنگ ایک دم سرخ ہوگیا۔

"ارسلان، تم بہت فضول بولتے ہو۔" ارتضٰی نے اسے ڈانٹا۔

"چلو، یہ محبت زندگی میں نہ ہی ملے۔"

کچھ دیر بعد ایمل نے کہا۔ "لیکن لکھنے میں کیا حرج ہے...... تھوڑی دیر کے لئے

آدمی تھوڑی دیر کو زندگی کی تلخیاں بھلا کر ایک خوبصورت دنیا میں چلا جاتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں صرف محبت کے رنگ ہیں، نفرت کے نہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی کہانیاں ایک طرح کا ٹرینکولائزر ہیں۔"

"فار گاڈ سیک ارسلان!" مشاہد نے ہاتھ جوڑے۔ "تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہونٹوں پر ٹیپ لگا لو۔"

"جو حکم سرکار!" ارسلان نے بحث ختم کر دی۔ "اس موضوع پر پھر بات کریں گے ورنہ یہ مجاز اور مشاہد جس طرح وقفے وقفے سے مجھے گھور رہے ہیں، مجھے ڈر ہے کہ یہ مجھے کچا چبا جائیں گے۔"

"میں اب چلوں گا...... اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔" وجاہت نے ارتضٰی سے کہا۔

"دو منٹ رک جاؤ۔ اکٹھے چلتے ہیں۔ میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے۔" مجاز نے کہا۔

"اچھا......" وجاہت اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔ ارسلان ایمل کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگا۔

"سنو ایمی، کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟ وہ اس روز ارتضٰی کہہ رہا تھا نا کہ تمہاری آنکھیں کسی کے خواب دیکھتی ہیں تو کیا سچ ہے یہ؟"

ایمل کی آنکھیں ایک دم لَو دے اٹھیں۔ اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر ارتضٰی کی طرف دیکھا اور پھر ارسلان کی طرف دیکھنے لگی۔

"اگر گنجائش ہو تو اپنی آنکھوں میں مجھے بٹھا لو۔"

"بکومت۔" زارا نے اسے ڈانٹا۔ "دوسروں کو نصیحت کرتے ہو اور خود اتنے بھی ایٹی کیٹس نہیں کہ ایمی کو کبھی آپ کہہ کر بلاتے ہو کبھی تم۔" زارا کے کانوں میں ارسلان کی پوری بات نہیں پڑی تھی۔

"جس وقت آپ کہہ کر بلاتا ہوں اس وقت وزیر علی خان بلوچ کی بیٹی سمجھ کر بات کر رہا ہوتا ہوں اور جب تم کہہ کر بلاتا ہوں تو اپنی کولیگ سمجھ کر۔" ارسلان نے آہستگی سے کہا اور پھر ہاتھ ہلا دیئے۔ "سوری...... اب غصہ تھوک دو۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ تم بہت اچھا لکھتی ہو۔"

"سچ کہہ رہے ہو یا ویسے ہی میرا دل رکھنے کو؟" زارا ایک دم خوش ہوگئی۔

"بالکل سچ۔" ارسلان نے اسے یقین دلایا۔

"چلو جی، ہمارا کام ختم ہوا۔" مجاز نے کاغذوں کو پن اَپ کر کے دراز میں رکھا۔

"ارتضیٰ! یہ میرا سارا میٹریل نچلی دراز میں ہے۔"

"ٹھیک ہے ...... تم لوگ جاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔" ارتضیٰ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

مجاز اور وجاہت کے ساتھ ارسلان اور زارا بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم چلو گی ایمل؟" زارا نے پوچھا۔

"نہیں، بس یہ ذرا سا لکھنا رہتا ہے۔"

کچھ دیر بعد مشاہد بھی اپنے کاغذات سمیٹ کر دراز میں رکھ کر چلا گیا۔

"خان! ذرا ایک کپ چائے تو بنا دو۔" ارتضیٰ نے بہت دیر بعد کاغذوں سے سر اٹھا کر خان کو آواز دی تو اس کی نظر ایک کونے میں سر جھکائے تیزی سے لکھتی ہوئی ایمل پر پڑی۔

"ارے ایمل! تم گئیں نہیں سب کے ساتھ؟" ارتضیٰ کو حیرت ہوئی۔

"نہیں، بس میرا کچھ کام رہ گیا تھا۔ دو تین سطریں رہتی ہیں۔"

"مگر تمہیں چلے جانا چاہئے تھا ...... بہت دیر ہو گئی ہے۔ جو تھوڑا بہت کام رہ گیا تھا، کل ہو جاتا۔" ارتضیٰ پریشان ہو گیا تھا۔ "تمہارے گھر میں سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"اوہ ہاں......" وہ قلم رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔"

"تم نے گاڑی کہاں پارک کی ہے؟ چلو میں تمہیں گاڑی تک چھوڑ آتا ہوں۔"

"وہ، آج میں گاڑی نہیں لائی تھی۔ کیونکہ گھر سے چاچا آئے ہوئے تھے، انہیں چاہئے تھی۔"

"اوہ ...... پھر تو تمہیں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہئے تھا ایمل ......" ارتضیٰ کھڑا ہو گیا۔

"آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ میرے پاس سوزوکی ہے۔"

"کیا تمہاری سوزوکی ورکشاپ سے آ گئی ہے؟"

"ہاں ...... میرا دل تو چاہتا تھا کہ اسے بیچ دوں لیکن آپا نہیں بیچنے دیتیں۔ دراصل مرتضیٰ بھائی نے ہی اسے خریدا تھا۔"

"لیکن ابھی اچھی حالت میں ہے۔" ایمل نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"ہاں ...... لیکن مہینے میں ایک بار ورکشاپ میں بھیجنا پڑتا ہے۔"

"صاحب، چائے نہیں بناؤں؟" خان نے اسے باہر جاتے دیکھ کر پوچھا۔

"آ کر پیوں گا۔"

"میں چلی جاتی ارتضیٰ! تم یونہی ......"

"نہیں، اس وقت تمہارا اکیلے جانا مناسب نہیں ہے۔" ارتضیٰ نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "کس طرف؟"

"ڈیفنس۔" ایمل نے بتایا اور پھر دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔

"ایمل!" ڈیفنس والی سڑک پر چڑھتے ہوئے ارتضیٰ نے پوچھا۔ "گھر میں تمہارے اتنی دیر رکنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟"

"ہوں، شاید نہیں ...... دراصل میں یہاں اپنے بھائی اور بھابھی کے پاس رہتی ہوں۔ بابا جان تو کوئٹہ میں ہیں۔ اور بھائی اور بھابھی بھی اس وقت جم خانے میں ہوں گے۔ اور اگر گھر میں بھی ہوئے تو احتیاطاً میں نے صبح بھابھی کو بتا دیا تھا کہ شاید دیر ہو جائے۔ ویسے بھائی کو پتہ ہے کہ میں اخبار کے لئے رکتی ہوں۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہم سب دوستوں نے مل کر اخبار نکالا ہے۔"

"اچھا ...... یہ اچھی بات ہے۔" ارتضیٰ کا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا۔

ایمل کا گھر باہر سے بھی بہت خوبصورت تھا۔ بڑے چھوٹے بے شمار ستونوں والا گھر۔

"ہم اچھے خاصے لبرل ہیں۔" ایمل نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس وقت میں تمہیں گھر آنے کی دعوت نہیں دے سکتی۔ دراصل ایک تو چاچا آئے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے وہ گھر پر ہی ہوں۔ وہ ذرا اور مزاج کے بندے ہیں۔ دوسرے......"

"نیور مائنڈ ایمل!" ارتضیٰ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے خود جلدی ہے۔"

"تم سب لوگ کسی روز دن کے وقت آؤ۔ میں تمہیں بھائی سے ملواؤں گی۔"

"ضرور......" ارتضیٰ نے خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی ریورس کی۔

'اور یہ ایمل بلوچ ...... اس کے مزاج میں کتنی نرماہٹ ہے ...... بولتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے دھیمے سُروں میں کسی نے کوئی گیت چھیڑ دیا ہو ...... نیلی آنکھوں والی اور بقول ارسلان، خطرناک حد تک خوبصورت لڑکی۔ کیا واقعی یونیورسٹی میں کسی لڑکے کے دل میں اس کا خیال پیدا نہیں ہوا ہوگا؟ اور خود اس کی آنکھیں جیسے......'

"اوہ، نان سینس ...... میں یہ کیا فضول باتیں سوچنے لگا ہوں......" اس نے اپنے آپ کو ڈانٹا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

***

"ترا قلب پارۂ سنگ ہے
اسے ضربِ عشق سے کر فنا
اسے ضربِ عشق سے کر فنا"

ارسلان میز بجا بجا کر گا رہا تھا اور مسلسل ایمل کو دیکھ رہا تھا۔

"ارسلان! تم کبھی چپ نہیں رہ سکتے؟" ایمل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"نہیں ...... اگر تھوڑی دیر چپ بیٹھوں تو میری زبان کو زنگ لگنے لگتا ہے بلکہ اختلا ہونے لگتا ہے۔ اب دیکھو نا، پچھلے چار دن سے میں دفتر نہیں آیا تو میرے سینے میں د ہونے لگا تھا۔ پتہ چلا انجائنا کا اٹیک ہونے والا ہے، سو بھاگم بھاگ ادھر آیا تا بروقت علاج ہو سکے۔ پوچھ لو خان سے، جب سے آیا ہوں اس سے باتیں کر رہا ہوں خدا کا شکر ہے کہ اب تمہاری شکل نظر آئی ہے۔ سوچا، چار دنوں کی روداد تم سے پوچھو لیکن محترمہ بات کرنے کے موڈ میں دکھائی ہی نہیں دے رہیں۔ آتے ہی قلم کاغذ پکڑ بیٹھ گئیں تو مجبوراً مجھے......"

"توبہ ہے ارسلان! تم اتنا کیسے بول لیتے ہو؟"

"اور تم اتنی چپ کیسے رہ لیتی ہو؟ بائی دا وے، وہ تمہاری ہمزاد بیگم اُسریٰ وجاہ کہاں ہیں؟"

"اُسریٰ آج یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔" ایمل نے آہستگی سے کہا اور اپنے سامنے پڑ کاغذوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"ترا قلب پارۂ سنگ ہے
ترا قلب پارۂ سنگ ہے"

ارسلان اُسے خاموش دیکھ کر پھر گانے لگا......

"اسے ضربِ عشق سے کر فنا"

"ایمی!" وہ میز سے اتر کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ (میز پر چڑھنا اس کی مخصوص تھی)

"تم نے اس شعر پر غور کیا؟"

"نہیں ...... میں بزی ہوں۔" ایمل نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں جواب دیا۔

"لیکن میں تو تمہیں اکثر یہ شعر سنایا کرتا ہوں۔ جانتی ہو کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہیں اور کوئی شعر نہیں آتا۔"

"اتنا بھی بدذوق نہیں ہوں، جس کی پیاری کزن ڈھیروں ڈھیر افسانے لکھتی ہو، اس کا یہ نالائق کزن اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہے کہ اسے چند اشعار بھی نہ آتے ہوں۔"

"تم ہر بات کے جواب میں اتنی لمبی تقریر کیوں کرتے ہو؟"

"اور تم میری تقریر کے جواب میں اتنی مختصر بات کیوں کرتی ہو؟ بائی دی وے آج مزاج کچھ ناساز لگ رہا ہے۔"

"نہیں تو ...... وہم ہے تمہارا۔"

"چلو وہم ہی سہی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ یہ جو عشق ہوتا ہے، کیا واقعی سنگ کو فنا کرنے کا اثر رکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" ایمل بدستور کاغذوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

"میرا بڑا دل چاہتا ہے ایمل کہ میں بھی کبھی عشق کروں، ایسا عشق جو مجھے توڑ ڈالے، فنا کر ڈالے، خاک ہو جاؤں، اس عشق میں مٹ جاؤں۔ وہ جو زارا ہے نا، وہ پتہ نہیں کیا کچھ لکھتی رہتی ہے، عشق یہ ہوتا ہے، عشق وہ ہوتا ہے ...... کیا ایسا ممکن ہے ایمی! کہ آدمی کسی کے عشق میں فنا ہو جائے؟"

"ناممکن تو کچھ بھی نہیں بھائی۔"

"مگر یہ سب تو افسانوں کی، خوابوں کی باتیں لگتی ہیں۔"

"افسانے اور خواب بھی تو کبھی کبھی حقیقتیں بن جاتے ہیں۔"

"ہاں اسی لئے تو میں آج کل ایک لڑکی سے عشق کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لڑکی بس ایویں سی ہے۔ لیکن وہ زارا کا پچھلے ماہ ایک افسانہ چھپا تھا نا اس میں لڑکی بس ایویں سی ہوتی ہے اور لڑکا اس کے عشق میں ڈوب جاتا ہے۔ میں ذرا تجربہ کر رہا ہوں۔"

"آج کل تم زارا کے افسانے پڑھنے لگے ہو؟"

"ہاں، چسکا پڑ گیا ہے۔ جس دن زارا کا افسانہ نہ پڑھوں، اس رات نیند ہی نہیں آتی۔"

ایمل ہنس دی۔

"ویسے تمہاری ہنسی خوبصورت ہے۔ ہنسی سے یاد آیا کہ اس کی ہنسی بھی خوبصورت ہے اور اس وقت وہ بے چاری فون کے پاس بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

ارسلان فون کے پاس جا بیٹھا اور فون گود میں رکھ کر نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف شاید کسی نے ہولڈ کرنے کے لئے کہا تھا۔ اس نے مڑ کر ایمل کو دیکھا اور مسکرایا۔

"ترا قلبِ پارۂ سنگ ہے
اسے ضربِ عشق سے کر فنا"

اور پھر فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

'تمہیں کیا پتہ ارسلان حیدر! میرا دل کب کا فنا کے راستے پر چل پڑا' اس نے سر اٹھا کر ارسلان کی طرف دیکھا جو زور و شور سے دوسری طرف موجود لڑکی کی آنکھوں کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔

آج ابھی تک کوئی دفتر میں نہیں آیا تھا سوائے ارسلان کے اور اس کے۔ حالانکہ وہ سب آگے پیچھے پہنچ جاتے تھے اور اب تو اسے آئے آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ ہو چکا تھا اور ارسلان اس سے بھی پہلے کا موجود تھا۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ ارتضٰی نے اپنا ایم۔ایس۔سی مکمل کر لیا تھا اور اپنے بھائی اور والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ٹیچنگ لائن ہی اختیار کی تھی۔ ابھی اسے کسی کالج میں جاب نہیں ملی تھی اس لئے وہ ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھا رہا تھا۔

وجاہت اور مجاز انجینئر بن گئے تھے۔ مجاز کو ابھی جاب نہیں ملی تھی، وہ زیادہ تر وقت اخبار کو دے رہا تھا۔ اس ایک سال کے دوران اخبار کی سرکولیشن کافی بڑھ گئی تھی۔ پڑھا لکھا سنجیدہ طبقہ اسے بہت پسند کر رہا تھا۔ ارتضٰی کے سیاسی تبصرے بہت مقبول ہو گئے تھے۔ وجاہت ملک سے باہر چلا گیا تھا لیکن اس نے انہیں بہت پہلے چھوڑ دیا تھا، بڑی خاموشی سے...... صحت مند ہو جانے کے بعد وہ دفتر آتا تھا لیکن بہت خاموش ہو گیا تھا اور اس نے ارتضٰی کے اصرار کے باوجود بنگلہ دیش سے آنے والی عورتوں کے سلسلے میں تحقیقات کا مواد اس کے حوالے نہیں کیا تھا بلکہ اس نے دو تین بار اخبار بند کرنے کے لئے بھی کہا تھا۔

"یہاں اتنے اچھے اور بہترین اخبار موجود ہیں، اس بے کار اخبار کو بھلا کون خریدے گا اور پڑھے گا سوائے ان چند لوگوں کے جو ہر چھپنے والا اخبار خرید لیتے ہیں اور پڑھے بغیر ردی میں پھینک دیتے ہیں۔"

"ایسا بھی نہیں ہے وجی! بہت کم عرصے میں ہمارے اخبار نے ہمارا ایک حلقہ بنا لیا ہے۔" مجاز نے اسے ٹوکا تھا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے وجی! کیا تم خوف زدہ ہو؟ کیا کسی نے تمہیں کوئی دھمکی دی ہے؟ کیا تمہیں یقین ہے اس رات تمہیں زخمی کرنے والے سر جہانگیر کے آدمی تھے؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس آج کل ذرا پڑھائی کی طرف توجہ دے رہا ہوں۔"

کوئی بات تھی جو اسے پریشان کئے ہوئے تھی لیکن وہ بتاتا نہیں تھا، ظاہر نہیں کرتا تھا۔ مگر اس روز اس کے اندر کا خوف ظاہر ہو گیا تھا۔

اُس روز زارا کا برتھ ڈے تھا اور اس نے اسے دفتر ہی میں سیلیبریٹ کیا تھا۔

ارسلان نے دفتر کو غباروں اور جھنڈیوں سے سجایا تھا جس پر زارا اور ارسلان کے درمیان خوب جنگ ہوئی تھی۔

"میں کوئی ننھی بچی ہوں؟"

خوب رونق تھی۔

اس روز وجاہت بھی ہنس رہا تھا اور سب سے گپ شپ لگا رہا تھا حالانکہ اس حادثے کے بعد تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہنسنا بھول ہی گیا ہو۔

وہ سب لوگ کھا پی کر دری پر بیٹھے اپنے اپنے چائے کے کپ اٹھائے ارسلان اور زارا کی نوک جھوک سے محفوظ ہو رہے تھے کہ خان اس لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ دیکھنے میں وہ کوئی تیئس چوبیس سال کی لگتی تھی۔ (لیکن اس نے بعد میں بتایا تھا کہ وہ تیس سال کی ہے)

"مجھے ارتضٰی عباس سے ملنا ہے۔"

"جی، میں ارتضٰی ہوں۔" ارتضٰی نے اٹھ کر تعظیم دی اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ دری پر ہی بیٹھ گئی۔

"میرا نام الماس ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور میں آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کا اخبار حقائق چھاپتا ہے اور یہ کہ آپ کسی سے ڈرتے نہیں ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے آپ نے بنگلہ دیش سے آنے والی عورتوں کے اغوا پر لکھا تھا۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں، کیا اپنے وطن کی عورتوں کا کوئی حق نہیں ہے......؟ میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ یہاں صرف بنگلہ دیش سے ہی آنے والی عورتوں کو فروخت نہیں کیا جاتا بلکہ میں...... میں آپ کی ہم وطن ہوں۔ آپ کے اسی شہر کی رہنے والی ہوں اور آج سے دس سال قبل کالج سے آتے ہوئے مجھے اغوا کر لیا گیا تھا اور پھر مجھے دبئی اسمگل کر دیا گیا اور وہاں مجھے فروخت کر دیا گیا...... میری کہانی بہت طویل ہے...... دس سالوں کے زخم میری جھولی میں ہیں۔ میں آپ کو اپنی داستان سنانے آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں میرے

زخموں کی کہانی آپ چھاپیں۔ میرے پاس ان لوگوں کے نام اور پتے بھی موجود ہیں جو اس گھناؤنے کاروبار میں شامل ہیں۔''

''تو بی بی! آپ یہاں کیا لینے آئی ہیں؟ جائیں، پولیس میں جائیں۔ وہاں جا کر ان کے نام پتے درج کروائیں۔ یہ تو ایک چھوٹا سا ہفتہ وار اخبار ہے۔'' وجاہت ایک دم بول پڑا تھا۔

اس لڑکی کے ساتھ ساتھ سب ہی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر وہ بول رہا تھا۔ نہ جانے کب کا دبا ہوا غبار بہہ نکلا تھا اور پھر اس روز کے بعد وجاہت دفتر نہیں آیا تھا۔ کیونکہ ارتضٰی نے اس لڑکی کی کہانی لفظ بہ لفظ چھاپ دی تھی جس کے نتیجے میں اخبار کا ڈیکلریشن ضبط ہو گیا تھا اور جن لوگوں کے نام ارتضٰی نے لکھے تھے انہوں نے اس پر ہتک عزت کا دعویٰ کر دیا تھا اور ارتضٰی ابھی تک پیشیاں بھگت رہا تھا اور وہ لڑکی اپنی داستان سنا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی اور ارتضٰی کے پاس کوئی پروف نہ تھا کہ یہ داستان سچی تھی یا جھوٹی۔

''یہ آگ کا کھیل ہے جو تم لوگ کھیل رہے ہو۔'' وجاہت نے اسے سمجھایا تھا اور پھر خود الگ ہو گیا تھا اور پھر دو ماہ بعد وہ مسقط چلا گیا تھا۔ اسے وہاں جاب مل گئی تھی۔

اخبار کا ڈیکلریشن نئے نام سے دوبارہ حاصل کر لیا گیا تھا اور وہ سب پہلے سے زیادہ جذبے کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ سب کی تحریر میں پختگی آتی جا رہی تھی۔ ایمل اور اُسریٰ کے سروے اب پہلے کی نسبت زیادہ بہتر ہو گئے تھے۔

ارتضٰی عباس کے تبصرے اور سیاسی شخصیتوں کے انٹرویوز اخبار کی سرکولیشن میں اضافے کا باعث بنے تھے۔ ملک میں ایک بار پھر انتخابات کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ یا تو انتخابات دوبارہ ہوں گے یا مارشل لاء نافذ ہو جائے گا۔ ارتضٰی اسی سلسلے میں ایک سیاسی شخصیت سے انٹرویو لینے گیا ہوا تھا۔ مشاہد اس کے ساتھ تھا۔ اخبار کے لئے فوٹو گرافی کا کام بھی وہی کرتا تھا اور مجاز نہ جانے کہاں تھا لیکن ارسلان اور ایمل کو اس بات کی خبر نہ تھی۔

فون سے فارغ ہو کر ارسلان پھر ایمل کے پاس آ بیٹھا۔

''تمہیں کچھ پتہ ہے یہ تینوں کہاں غائب ہیں؟''

''نہیں تو۔'' ایمل خود پریشان سی تھی کیونکہ ان دنوں تو مجاز اور ارتضٰی اکثر دفتر میں پائے جاتے تھے۔ ارتضٰی کا سکول ایک بجے بند ہو جاتا تھا اور مجاز فارغ تھا۔

''اور مجھے ڈر ہی لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ ارتضٰی عباس صاحب کسی دن غائب ہی نہ ہو جائیں۔ کچھ زیادہ ہی بے باک ہو گیا ہے ان کا قلم۔''

''خدا نہ کرے ارسلان! جو کچھ تمہارے منہ میں آتا ہے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتے ہو۔'' ایمل نے بے اختیار کہا تو ارسلان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

''میں کچھ دال میں کالا کالا سا دیکھ رہا ہوں۔''

''تمہاری نظر خراب ہے۔''

''اچھا......'' ارسلان کچھ مایوس سا نظر آنے لگا۔ ''میں سمجھ رہا تھا کہ شاید میرے شعر کا کچھ اثر ہو گیا ہے اور تمہارا سنگ پگھل رہا ہے۔''

''تمہیں کام نہیں کرنا؟''

''بندہ وقت سے پہلے ہی سارا کام کر لیتا ہے۔ تمہاری طرح عین وقت پر قلم لے کر نہیں بیٹھتا۔''

''اچھا تھوڑی دیر خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ، میں اپنا کام نمٹا لوں۔ مجھے آج جلدی جانا ہے۔ کوئٹہ سے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

''یہ آج کل تمہارے مہمان کچھ زیادہ نہیں آنے لگے کیا...... بائی دا وے کون مہمان ہیں؟''

''بابا اور اماں ہیں۔'' ایمل نے سنجیدگی سے کہا اور تیزی سے قلم چلانے لگی۔ ارسلان کچھ دیر تو خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا لیکن پھر اس کی زبان میں کھجلی ہونے لگی۔

''سنو......''

''ہوں......'' ایمل نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

''یہ ارتضٰی عباس تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

''کیوں؟'' ایمل نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''یونہی معلومات کے لئے۔''

''تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

''اپنا تو یار ہے، اچھا ہی لگتا ہے۔''

''اور میں بھی دشمن نہیں ہوں اس کی۔'' ایمل پھر کاغذات پر جھک گئی۔

''بندہ خطرناک ہے۔'' ارسلان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ''اور صنفِ نازک کے لئے سینے میں دل کے بجائے پتھر رکھا ہوا ہے۔''

"پھر؟"
"پھر...... پھر یہ۔" ارسلان بالوں میں بے مقصد انگلیاں پھیرنے لگا۔ "کہ اسے سامنے بٹھا کر مسلسل گاتا رہوں۔

ترا قلب پارۂ سنگ ہے

یہاں تک کہ اس کا قلب ضربِ عشق سے فنا ہو جائے اور وہ مجنوں کی طرح خاک میں ڈالے جنگلوں میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا پھرے۔"
"ارسلان! تم کبھی ڈھنگ کی بات نہیں کر سکتے؟"
"ڈھنگ کی...... ارے بی بی! اس سے زیادہ ڈھنگ کی بات کیا ہوگی؟ دسویں جماعت میں ہماری اُردو کی ٹیچر نے ہمیں جگر مراد آبادی کی غزل پڑھائی تھی۔

عشق لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

اور غزل کی تشریح کرواتے ہوئے انہوں نے نصیحت کی تھی کہ زندگی کے ہر مرحلے میں عشق کو اپنا راہبر بنالو۔ اور تب سے اب تک اپنی مِس کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس کے نتیجے میں تین بار جوتے، دو بار گالیاں، چار دفعہ کامیاب فرار اور......"
"فار گاڈ سیک ارسلان!" ایمل نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "میں پہلے ہی پریشان ہوں۔"
"Why؟" ارسلان نے غور سے اسے دیکھا۔ "ارتضیٰ کی وجہ سے؟...... بابا، وہ آجائے گا ابھی۔ کسی کام سے چلا گیا ہوگا۔"
"نہیں...... اس کی وجہ سے نہیں۔ مجھے ذرا جلدی جانا تھا۔" اس نے بات بنائی۔
"اور تم ہو کہ یکسوئی سے کام کرنے ہی نہیں دے رہے ہو۔"
"اب یہ سراسر الزام ہے بی بی، مجھ غریب پر۔ میں جب بول نہیں رہا ہوتا ہوں تب بھی آپ یکسوئی سے کام نہیں کر رہی ہوتی ہیں اور میں تو آپ کو صرف یہ بتا رہا تھا کہ میں بے چارہ کمزور دل، ناتواں آدمی اپنی ٹیچر کے مشورے پر عمل نہیں کر سکا ہوں...... اس لئے چاہتا ہوں کہ ارتضیٰ کو اس راہ پر لگا دوں۔ مضبوط دل کا ہے۔ لیکن اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ آپ میری مدد کریں گی خاتون؟" وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔
"تم مسخرے پن سے باز نہ آنا۔" ایمل ہنس دی۔

"اور تم کبھی بھی اعتراف نہ کرنا کہ تمہاری آنکھیں جس کے خواب دیکھتی ہیں، وہ ارتضیٰ عباس ہے۔"
ارسلان ایک دم ہی مڑ کر میز کی دراز کھول کر چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔
'یہ...... یہ ارسلان نے کیا کہا ہے؟'
'اور کیا اوروں نے بھی؟'
'ارتضیٰ نے بھی محسوس کر لیا ہے؟'
'نہیں...... اس نے تو اس راز کو اپنے تک سے چھپا رکھا تھا۔
'نہیں...... ارسلان نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ اس کی تو عادت ہے یونہی الٹی سیدھی بکنے کی۔'
"ارسلان......" اس نے آہستہ سے آواز دی۔
"ہوں......"
"یہ تم نے ابھی کیا کہا تھا؟"
"پتہ نہیں...... میری یادداشت کچھ کمزور ہے۔ کیا تم وضاحت کر سکتی ہو کہ تمہارا اشارہ کس بات کی طرف ہے؟"
ایمل کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔
"لگتا ہے، آ گئے حضرت۔" ارسلان نے اطلاع دی اور چند لمحوں بعد ارتضیٰ اور مشاہد اندر داخل ہوئے۔
"تم کہاں رہ گئے تھے؟ ایمل بی بی پریشان تھیں۔" ارسلان نے ارتضیٰ سے پوچھا۔
ارتضیٰ نے ایمل کی طرف دیکھا جس کی نظریں جھک گئی تھیں اور چہرے پر گلابی پن تھا۔
"آج ذرا عارف صاحب سے انٹرویو طے تھا۔"
"اوہ...... تو تم عارف زبیری سے انٹرویو لینے میں کامیاب ہو گئے؟"
"ہاں، کچھ کچھ۔" ارتضیٰ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سامان ٹیبل پر رکھا۔
"ویسے یار، بڑا ٹیڑھا بندہ ہے۔" مشاہد نے تبصرہ کیا۔ "لیکن ارتضیٰ نے بھی اسے خوب گھیرا۔ ایسے تاک تاک کر سوال کئے کہ بے چارے کو جواب دیتے ہی بن پڑی۔ بعد میں وضاحتیں کرتے رہے کہ فلاں بات آف دی ریکارڈ ہے اور فلاں بات نہ چھاپیں۔"
"ایمی! چائے تو پلا دو۔"

ایمل اٹھ کھڑی ہوئی۔ ارسلان کیسٹ لے کر عارف زبیری کا انٹرویو سننے لگا اور ساتھ ساتھ اپنی کمنٹری بھی جاری رکھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے ارتضٰی! انتخابات ہوں گے؟''

''ممکن ہے۔'' ارتضٰی نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے، اس سب کے پیچھے غیر ملکی طاقت کا ہاتھ ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' مشاہد نے آہستگی سے کہا۔ ''بڑا دکھ ہوتا ہے یار کہ ہمارے سیاست دان دوسروں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔''

ایمل نے چائے بنا کر انکے سامنے رکھی۔

''مجاز آج نہیں آیا؟''

''ہاں، اسے کچھ کام تھا۔'' مشاہد نے بتایا۔ ''اسے آج بَرَدکھوے کے لئے جانا تھا۔''

ارسلان بھی کیسٹ بند کر کے ان کے پاس آ بیٹھا۔ ''اور تمہیں یہ ابھی ابھی الہام ہوا ہے؟''

ایمل نے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں ...... مجھے صبح سے پتہ تھا۔''

''پہلے تو تم نے نہیں بتایا۔''

''خیال ہی نہیں رہا۔''

''رئیلی ارسلان؟'' مشاہد نے پوچھا۔

''ہوں ...... پوچھ لینا مجاز سے۔ اس کے سسر بڑے بیوروکریٹ ہیں۔''

''سسر کیسے بن گئے اس کے، بات طے ہوگئی؟''

''طے ہو جائے گی۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

ارتضٰی کچھ سوچتے ہوئے چائے پی رہا تھا۔

''کافی کچھ آف دی ریکارڈ ہے۔ کیا تم سب چھاپو گے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''پتہ نہیں، دیکھوں گا۔ جب لکھا ہے تو......''

''تم کچھ پریشان ہو ارتضٰی؟'' ایمل نے غور سے اسے دیکھا۔

''نہیں تو۔''

''آپا کیسی ہیں؟''

''اچھی ہیں۔''

''اور اماں؟''

''وہ بھی بہتر ہیں۔ تمہارا پوچھ رہی تھیں کل۔''

''دو تین روز میں آؤں گی۔ آج کل بابا اور اماں آئے ہوئے ہیں کوئٹہ سے۔''

''انہیں بھی لے آؤ۔''

ایمل نے سر ہلایا۔ وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ ان کا مزاج شاہانہ ہے اور بابا اپنے سے کمتر اسٹیٹس رکھنے والوں سے تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے۔

''ہاں، وہ شیمی آج کل کس سکول میں ہے؟''

''میرے والے سکول میں ہی۔''

''ایڈمیشن ہونے والے ہیں۔ تم اس سال پھر اپلائی کر دو شیمی کے لئے۔ ایڈمیشن ہو جائے گا۔''

''کیسے ...... ڈونیشن مانگتے ہیں وہ۔''

''تمہیں اس سے کیا رنی! اس کا ایڈمیشن ہو جائے گا۔ وہاں کے پرنسپل بھائی کے دوست ہیں۔'' ایمل نے نرمی سے کہا۔

''وہ تمہارے بھائی کے دوست کیسے ہو سکتے ہیں؟'' ارتضٰی نے شک سے اسے دیکھا۔ ''تم ڈونیشن دو گی اپنے پاس سے ...... سوری ایمل! میں اپنی ذات کے لئے کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا۔ اور پھر یوں بھی شیمی اب سیٹ ہو گیا ہے۔''

''رنی! میں نے اس کے ایڈمیشن کی بات کر لی ہے۔'' ایمل نے پھر آہستگی سے کہا۔

''مگر میں اب اس سکول کی فیس افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''رنی تم ......'' ایمل نے کچھ کہنا چاہا لیکن ارتضٰی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''اب اور زیادہ نہیں پلیز ...... مجھ پر پہلے ہی بہت بوجھ ہیں۔ میں اتنے زیادہ احسانات کا متحمل نہیں ہو سکتا ...... تم لوگ اخبار کے لئے جو کچھ کر رہے ہو، وہی بہت ہے۔''

''اخبار ہم سب کا خواب ہے ارتضٰی! اور ہم جو کرتے ہیں یہ تم پر احسان نہیں ہے۔'' مشاہد نے خالی کپ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

ایمل سر جھکائے خالی کپ کو گھور رہی تھی اور اس کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔

ارسلان ے اسے دیکھا۔

''ارتضٰی! تم نے ایمی کا دل دکھایا ہے۔ خلوص اور احسان میں بڑا فرق ہوتا ہے

بھائی، اس فرق کو سمجھو۔"

ارتضٰی نے ایمل کی طرف دیکھا جس کا رنگ لمحوں میں زرد ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ گلابی ہو رہی تھی اور اب......

"سوری ایمی!" ارتضٰی نے آہستگی سے کہا۔ "میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ میں نے تمہیں ایک حقیقت بتائی ہے۔"

ایمل کچھ نہیں بولی اور پیالیاں اکٹھی کرنے لگی۔

"خان!" اس نے دروازے کے پاس جا کر آواز دی۔ "یہ دھو کر رکھ دو۔" اور خود بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ "اچھا، میں اب چلتی ہوں۔"

"کنوینس ہے؟" ارتضٰی نے پوچھا۔

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا اور ہولڈر سے کاغذ نکال کر بیگ میں ٹھونسے۔ "میں یہ سروے گھر لے جا رہی ہوں۔ مکمل کر کے لے آؤں گی۔" اس نے بغیر کسی کو مخاطب کئے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی اور باہر جاتے جاتے اس نے سنا، ارسلان ارتضٰی سے کہہ رہا تھا۔

ترا قلب پارۂ سنگ ہے
اسے ضربِ عشق سے کر فنا

'اور تمہیں کیا خبر ارسلان صفی کہ ارتضٰی عباس کا دل سچ مچ پارۂ سنگ ہی ہے۔' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارتضٰی سے شناسائی کو ڈیڑھ سال تو ہو ہی گیا تھا اور اس ڈیڑھ سال میں ارتضٰی کی کسی بھی بات، کسی بھی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایمل کے لئے کچھ اچھا جذبہ رکھتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ بھی اسی طرح ٹریٹ کرتا جیسا باقی سب کے ساتھ۔ اور خود وہ پہلے دن ہی دل ہار بیٹھی تھی۔ پتہ نہیں، کیا تھا ارتضٰی میں کہ وہ خود بخود دل میں اتر آیا تھا...... مگر وہ نظریں جھکائے رکھتی کہ کوئی اس کی آنکھوں سے اس کا راز نہ پا لے۔

اور یہ کیسی اوکھی منزل تھی...... اس کا علم اس کے سوا کسی کو نہ تھا اور ایمل وزیر علی خان نے اپنے لئے ہمیشہ مشکل راستے چنے تھے۔

وہ وزیر علی خان بلوچ کی بیٹی تھی جو قومی اسمبلی کے ممبر اور اپنے علاقے کے سردار تھے جن کی اپنی روایات اور اپنے رواج تھے۔

اور ارتضٰی عباس، سیّد عباس علی شاہ کا بیٹا تھا...... جو ایک معمولی پروفیسر تھے۔ پنجاب

کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والے پروفیسر کا بیٹا۔

دونوں کے راستے الگ تھے

پھر بھی اس کے خواب اس کی آنکھوں میں سج گئے تھے اسی لئے تو اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں اور ارتضٰی عباس کہتا تھا کہ اس کی آنکھیں کسی کے خواب دیکھتی ہیں۔ کسی اجنبی کے خواب۔

شاید اس کا کوئی آئیڈیل ہے۔

اور اسے کیا پتہ کہ وہ اجنبی وہ خود ہی ہے۔

ارسلان کہتا تھا، وہ خطرناک حد تک خوبصورت ہے اور اس کی اس خطرناک حد تک خوبصورتی نے ارتضٰی کو رتی بھر بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ شاید اس کا مقصد اتنا ارفع تھا کہ اسے اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔

وہ گھر پہنچی تو وزیر علی خان اپنے سامنے اخباروں کا ڈھیر رکھے انہیں دیکھ رہے تھے اور اماں ان کے سامنے بیٹھی چائے بنا رہی تھیں۔ بھابھی بھی وہیں ایک طرف بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

"ایمی بیٹا! تم نے یونیورسٹی میں دیر نہیں کر دی؟"

"وہ بابا، میں یونیورسٹی سے اخبار کے دفتر چلی گئی تھی۔ ہم کچھ دوستوں نے مل کر ایک ہفتہ وار اخبار نکالا ہے۔ تھوڑی دیر اس کے لئے کام کرتی ہوں۔"

"کیوں تھکتی ہو بیٹا! اپنا رنگ دیکھا ہے کیسا ہو رہا ہے؟" اماں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں اماں! تھکن تو نہیں ہوتی۔" وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"چھٹیاں کب ہو رہی ہیں تمہاری؟"

"جلد ہی ہو جائیں گی۔"

"تم تو بس لاہور کی ہی ہو گئی ہو۔" انہوں نے پیار سے اسے دیکھا۔

وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اس لئے گھر بھر کی لاڈلی تھی اور ضد کر کے اس نے پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔ لاہور میں اس کے بڑے بھائی ارباب وزیر علی خان رہتے تھے، وہ بھی ان کے پاس رہنے لگی تھی۔

"وہاں سب ہی تمہیں یاد کرتے ہیں۔"

"میں بھی انہیں مس کرتی ہوں۔"

"خاک بس کرتی ہو۔ پچھلی چھٹیاں بھی یہیں گزار دیں۔"

"وہ تو میں نے کمپیوٹر کلاسز جوائن کر لی تھیں۔"

"خیر اب کے چھٹیاں ہوتے ہی تمہیں بلوا لوں گی۔ بلکہ ارباب سے کہہ دوں تمہیں چھوڑ جائے گا۔ تمہاری چاچی بھی کہہ رہی تھیں کہ اب کی چھٹیوں میں رسم ہو جا۔ تو بہتر ہے۔"

"رسم...... کیسی رسم؟" ایمل نے چونک کر انہیں دیکھا۔

تب ہی وزیر علی خان بلوچ اخبار ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ارباب خا کے پاس آ گئے۔

"ارباب...... ارباب! یہ دیکھو، یہ آرٹیکل دیکھا ہے تم نے؟ پڑھا ہے اسے؟"

"کون سا؟"

ارباب خان نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کیا اور ان کی طرف متوجہ ہو گئے

"یہ...... یہ والا مضمون۔" انہوں نے اخبار اس کے سامنے کیا۔

"نہیں تو...... کیا ہے اس میں؟" ارباب خان نے اخبار ان کے ہاتھ سے لے ل

اماں اور ایمل بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

"پڑھو...... پڑھو اسے ارباب خان! اس شخص کی معلومات بے انتہا ہیں۔ اسمبلی اندر بیٹھ کر ہم اتنا کچھ نہیں جانتے، جتنا کہ یہ شخص جانتا ہے۔ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے، جو لکھ رہا ہے، وہ بہت صحیح ہے۔ اس کا تجزیہ، اس کی پیش گوئیاں سب...... سب صحیح رہی ہیں...... تم پڑھو...... پڑھو اسے۔" اخبار ارباب خان کے ہاتھ میں دے کر وہ ا اُدھر ٹہلنے لگے، کچھ کچھ مضطرب اور بے چین سے۔ ان کی عادت تھی کہ ہفتے بھر کے ا وہ ایک دن ہی پڑھتے تھے۔ ملازم پورے ہفتے کے اخبار اکٹھے کر کے رکھتا رہتا تھا۔ وار اخبار، روزنامے اور یوں ہی شام کو چھپنے والے ضمیمے۔ سب کے سب۔

ایمل گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے انہیں دیکھ رہی تھی...... وہ اخبار جو انہوں نے ارباب کی طرف بڑھایا تھا، وہ اخبار ہفتے وار "پکار" تھا۔ ارتضٰی عباس کا اخبار...... اور یقی ارتضٰی عباس کے کسی مضمون کا ذکر کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے ذہن اماں کی بات بھی نکل گئی تھی۔

"اسمبلیاں ضرور ٹوٹیں گی۔" ٹہلتے ٹہلتے رُک کر وزیر علی خان نے ارباب کی ط دیکھا۔

"ممکن ہے بابا۔" ارباب علی خان نے اخبار سے نظر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"میں نے یہ اخبار اس سے قبل نہیں دیکھا۔ وہاں کوئٹہ میں نظر سے نہیں گزرا۔ شاید لاہور سے ہی نکلتا ہے۔"

"ہاں بابا!" ارباب علی خان نے اب سر اٹھا کے انہیں دیکھا۔

"تم دیکھ رہے ہو اس کا انداز۔ بہت کاٹ ہے اس کے قلم میں۔ پہلے کبھی پڑھے تم نے اس کے مضامین؟"

"نہیں بابا! آپ کو پتہ ہے، مجھے اتنی دلچسپی نہیں ہے اخبار وغیرہ سے۔ صبح ناشتے پر "جنگ" اور "پاکستان ٹائم" ایک نظر دیکھ لیتا ہوں بس۔ مجھے نہیں پتہ کہ یہ اخبار والا دے جاتا ہے۔ شاید ایمی نے کہا ہو گا۔"

ایمل بتانا چاہتی تھی کہ یہ وہی اخبار ہے جو وہ اور اس کے دوست مل کر نکال رہے ہیں لیکن پھر چپ ہو گئی نہ جانے بابا کا کیا ردِ عمل ہو...... پتہ نہیں، وہ ارتضٰی کے مضمون سے متاثر ہوئے تھے یا ناراض ہو رہے تھے۔ ان کے احساسات کو سمجھنا تو بڑا مشکل تھا۔ وہ اور اُسریٰ اس میں قلمی نام سے لکھتے تھے...... اس لئے بابا کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ یہ وہی اخبار ہے۔

"دیکھو ارباب خان! اس شخص کا پتہ کرو۔ کون ہے، کس طرح کا ہے۔ یہ شخص ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔"

"کیسے بابا؟ ایک معمولی اخبار نویس آپ کے کیسے کام آ سکتا ہے؟ اور پھر یہ اخبار بھی کوئی اتنا مشہور نہیں ہے۔"

"آ سکتا ہے ارباب علی خان! آ سکتا ہے۔" وہ ایمل کی طرف مُڑے اور مسکرائے۔

"ہماری بیٹی کیا سوچ رہی ہے؟"

"کچھ نہیں بابا! آپ کی باتیں سن رہی تھی۔"

"اب تو ہماری بیٹی بہت مصروف ہو گئی ہے۔ جب سے آئے ہیں، بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا۔"

"نہیں تو بابا! میں تو کل بھی جلدی آ گئی ہے۔ آپ ہی گھر پر نہیں تھے۔"

"ایمل! تمہارا فون ہے، اُسریٰ کا۔" شاہ نور بھابھی نے آ کر بتایا تو وہ بابا سے معذرت کر کے اٹھ گئی۔

☆☆☆

کتنے بہت دن ہو گئے تھے اسے دفتر گئے اور ارتضیٰ کو دیکھے۔ بابا اور اماں کے خیال سے وہ ایک دو دن سے یونیورسٹی سے سیدھی گھر آ رہی تھی۔ سروے بھی مکمل کر کے اس نے اُسریٰ کے ہاتھ بھجوا دیا تھا۔ پھر ارتضیٰ نے سروے کے لئے اسے نیا موضوع بھیج دیا تھا۔ ''ہسپتالوں میں مریضوں کی حالت زار'' اور اب کئی دن سے وہ دونوں ہسپتالوں میں خوار ہو رہی تھیں۔ ایک ہسپتال کا چکر لگانے کے بعد اتنی ہمت ہی نہیں رہتی تھی کہ دفتر بھی جائے۔ پھر بابا اور اماں کا بھی خیال رہتا تھا کہ زیادہ دیر ہو گئی تو اماں خفا ہوں گی۔

ہسپتالوں کی حالت زار اس کے تصور سے بھی زیادہ خراب تھی۔ اس نے ایک دو مریضوں سے حال پوچھا تو بے شمار مریض اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب کے پاس اپنی کہانیاں تھیں۔

ڈاکٹرز توجہ نہیں دیتے۔

دیکھتے نہیں۔

دوائیں مہنگی ہیں۔

ایمرجنسی میں ڈاکٹر نہیں ملتے۔

سب نے اس کے سامنے شکایات کے ڈھیر لگا دیئے۔

عام وارڈ کے مریضوں کی حالت زار دیکھ کر اسے رونا آ گیا۔

ڈاکٹرز روم میں بیٹھے چند ڈاکٹر گپیں لگا رہے تھے اور عام وارڈ میں ایک مریض درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ اس کی آواز وارڈ سے باہر تک آ رہی تھی۔

''آپ کو ذرا بھی خیال نہیں ہے؟'' وہ اُسریٰ کے منع کرنے کے باوجود ڈاکٹرز روم میں چلی گئی تھی۔ ''ایک مریض درد سے تڑپ رہا ہے اور آپ کو پرواہ تک نہیں۔''

''بی بی! ڈیوٹی ڈاکٹر سے کہیں۔ ہماری ڈیوٹی نہیں ہے۔'' ایک ڈاکٹر نے بڑی رُکھائی سے کہا۔

''اور ڈیوٹی ڈاکٹر بھی کہیں بیٹھا گپیں لگا رہا ہو گا۔'' وہ غصے بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی اور پھر بڑی دیر بعد اسے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر ملا اور اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اسٹاف سے کہا کہ اسے نیند کا انجکشن لگا دیا جائے۔

وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلی تو مریض کی حالت اب سنبھل چکی تھی۔ درد کی شدت کم تھی۔

''آپ کب سے یہاں ایڈمٹ ہیں؟''

''کل رات آیا تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کل رات اچانک پیٹ میں یہ ظالم درد اٹھا تو میرے عزیز مجھے یہاں ایمرجنسی میں لے آئے۔ ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن دے دیا۔ نیند کا انجکشن کوئی علاج نہیں ہے۔ صبح ایک ڈاکٹر صاحب آئے تو مختلف ٹیسٹ لکھ کر دے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاید اپنڈکس ہے۔ اور صبح سے اب تک کوئی ٹیسٹ نہیں ہوا ہے۔ اگر اپنڈکس ہی ہے تو میرا خیال ہے کہ ٹیسٹ ہونے تک پھٹ جائے گا۔''

''آپ کیا کرتے ہیں؟''

''میں پچیس سال سے ناروے میں ہوں۔ کچھ دن ہوئے وطن لوٹا ہوں۔''

''پھر تو آپ افورڈ کر سکتے ہیں۔ کسی پرائیویٹ کلینک میں ایڈمٹ ہو جائیں۔'' اُسریٰ نے اسے مشورہ دیا۔

''افورڈ تو کر سکتا ہوں لیکن پاکستان آ کر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ میں تو سوچ کر آیا تھا کہ اب باقی ماندہ زندگی یہیں گزاروں گا۔ مگر اب یہاں اس ہسپتال میں ایک رات رہنے کے بعد میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ پاکستان نے کیا ترقی کرنی ہے۔ یہاں اتنا کرپشن ہے، اتنی دھاندلی اور دھوکا دہی ہے۔ وہاں ناروے میں......''

''پتہ نہیں، کیا بات ہے جو بھی باہر رہ کر آتا ہے، اپنے وطن میں اسے برائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔''

اُسریٰ کو بہت غصہ آتا تھا، جب کوئی باہر سے آنے والا پاکستانی پاکستان کی برائی کرتا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے بیٹی! میں پاکستان کی برائی اس لئے نہیں کر رہا کہ مجھے پاکستان سے محبت نہیں ہے، ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔ وہاں اگر اس طرح میں بیمار پڑ جاتا تو مجھے صرف ایک فون کرنا پڑتا، اسی وقت ایمبولینس آ جاتی اور ایمبولینس کے ساتھ آنے والے بندے خود ہی سب کچھ کر لیتے۔ ہسپتال میں تمام ٹیسٹ ہو جاتے۔''

ایسے ہی کئی واقعات تھے جنہیں وہ نوٹ کرتی جا رہی تھی۔ ایمل کا دل بہت دُکھتا تھا۔

ارتضیٰ صحیح کہتا تھا۔ یہاں اس ملک میں سہولتیں اور آسائشیں صرف اُمراء کے لئے ہیں......خوشیوں پر صرف اُمراء کا حق ہے۔

غریب طبقے کی حالت بری تھی۔

تعلیمی شعبے میں، ہسپتالوں میں، دفتروں میں ہر جگہ اس طبقے کا استحصال ہو رہا ت کہیں شنوائی نہ تھی۔

ابھی ہسپتالوں والا سروے مکمل نہیں ہوا تھا۔ آج بابا اور اماں نے جانا تھا اس لئے کہیں نہیں گئی تھی۔ بابا اور اماں چلے گئے تو اس نے سوچا، کتنے دن ہو گئے ہیں ارتضٰ سے ملے۔ آج دفتر کیوں نہ چلی جاؤں۔ مگر نہیں، اس وقت تو سب ہی دفتر سے جا ہوں گے۔ پھر کیوں نہ آپا سے ہی مل آؤں۔

وہ شاہ نور بھابھی کو بتا کر گھر سے نکل آئی۔

عروج آپا اور اماں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

"کیسی ہو ایمل! بہت دن بعد آئی ہو۔" عروج کو وہ بہت اچھی لگتی تھی۔ سادہ دل ا محبت کرنے والی۔ بلکہ ارتضٰی کے سبھی دوست انہیں اچھے لگتے تھے۔

مخلص اور ہمدرد سے۔

"بس آپا! کوئٹہ سے بابا اور اماں آئے تھے۔"

"ارے بیٹا! تو لانا تھا انہیں ہم سے ملوانے۔" اماں نے کہا۔ "اور اس ارتضٰی نے ب نہیں کہا کہ تمہاری اماں آئی ہیں۔ ہم ہی مل آتے ان سے۔"

"ارتضٰی کیسے ہیں؟" اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "اور وہ شیبی صبی کہا ہیں؟"

"پڑوس میں گئے ہیں۔"

"آپا! میں نے شیبی کے ایڈمیشن کی بات کر لی ہے۔ اسی سکول میں جس میں ارتضٰ اسے پڑھانا چاہتے تھے لیکن اب ارتضٰی کہتے ہیں کہ انہیں شیبی کو اس سکول میں داخل نہیں کروانا۔ آپ بات کیجئے گا ان سے۔ اچھے سکولوں میں بچوں کو پڑھانا ہماری ضرورت ہے۔ پڑھائی چاہے کیسی بھی ہو، بچوں کی زندگی پر اچھے سکولوں کا اثر پڑتا ہے۔"

"دراصل رتی بہت خود دار ہے...... وہ کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا۔"

"لیکن دوستی میں احسان تو نہیں ہوتا۔ شیبی اور صبی مجھے بھی اتنے ہی عزیز ہیں جت ارتضٰی کو۔ اگر میں ان کے لئے کچھ کروں تو یہ میرا ان پر احسان نہیں ہے۔"

"اچھا، بات کروں گی۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔" عروج نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

وہ جانتی تھیں کہ ایمل ارتضٰی سے محبت کرتی ہے۔ عورت، عورت کی نظر کو بہت اچ طرح پہچانتی ہے۔ پہلی بار جب وہ گھر آئی تھی تو اسی وقت انہوں نے جان لیا تھا کہ ا

لڑکی کے دل میں ارتضٰی کے لئے کوئی جذبہ ہے۔ کوئی بہت ہی پاورفل جذبہ۔ اور وہ انہیں اچھی لگی تھی۔ اُس رات بستر پر لیٹتے ہوئے انہوں نے اماں سے کہا تھا۔

"اماں! یہ لڑکی ایمل اچھی ہے نا؟ اپنے ارتضٰی کے ساتھ اچھی لگے گی۔"

"ہوں......" اماں نے بھی ان کی تائید کی تھی۔ اور تب سے ہی وہ دل ہی دل میں اسے ارتضٰی کے لئے پسند کر چکی تھیں۔

"وہ آپ کی بات نہیں ٹالتا آپا! آپ اس سے ضرور کہیئے گا کہ وہ شیبی کے ایڈمیشن فارم جمع کروا دے۔"

"اچھا......" وہ مسکرا دیں۔ "تم بیٹھو، اماں سے باتیں کرو میں تمہارے لئے چائے بنا لاؤں۔"

وہ اسے اماں کے پاس بٹھا کر کچن میں چلی گئیں تو وہ اماں سے باتیں کرنے لگی۔

اماں اسے مرتضٰی کے متعلق بتانے لگیں......

"وہ بھی بالکل ایسا ہی تھا، ارتضٰی کی طرح اونچا لمبا، اسی کی طرح خواب دیکھتا تھا۔ اس ملک کو سنوارنے کے خواب۔"

اماں نے اسے انتخاب لڑنے سے لے کر موت تک کا سارا واقعہ سنایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کس قدر ظلم ہے یہاں اماں! اور کوئی اس ظلم کو ختم کرنے والا نہیں۔"

"ہاں بیٹا! بس ایک خدا کا آسرا ہے۔ کبھی تو وہ مظلوموں کی بھی دادرسی کرے گا۔"

"بچے کہاں ہیں اماں؟ اور آپا کدھر ہیں؟" باہر سے ارتضٰی کی آواز سنائی دی تو اس نے آنسو پونچھ لئے۔

"ارے، آج ارتضٰی جلدی آ گیا ہے۔" اماں نے کہا۔ "ورنہ تو وہ بہت دیر سے آتا ہے۔ جانے کہاں ٹکریں مارتا پھرتا ہے۔ کوئی ڈھنگ کی نوکری بھی تو نہیں ملتی۔ پرائیویٹ سکول میں تنخواہ ہی کتنی ملتی ہے۔ الٹا سب دشمن بن گئے ہیں۔"

"کون دشمن بن گیا ہے؟...... کبھی ارتضٰی نے ذکر تو نہیں کیا۔" ایمل نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ پرانے ٹیچر ہیں۔ اس کی مقبولیت سے جلنے لگے ہیں۔ اچھا پڑھاتا ہے، بچے پسند کرتے ہیں اسے، تو روز ہی کوئی نہ کوئی جھوٹی شکایت پرنسپل سے لگا دی جاتی ہے۔ کہہ رہا تھا نوکری چھوڑ دوں گا۔" اماں نے تفصیل سے بتایا۔

''میں ارباب بھائی سے کہوں گی کہ کہیں کوئی اچھی جاب مل جائے تو......''

''جی نہیں، بہت شکریہ مس ایمل!'' ارتضیٰ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ ''مجھے آپ کے بھائی صاحب کی دلائی ہوئی جاب نہیں چاہئے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ارتضیٰ کا قلم بک نہیں سکتا اور میں ان کی مرضی کے تبصرے نہیں لکھ سکتا۔ اب شاید انہوں نے تمہیں بھیجا ہے۔''

''ارتضیٰ!'' ایمل کا رنگ ایک دم سرخ پڑ گیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟''

''وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔'' ارتضیٰ اندر آ گیا۔

''رنی بیٹا! گھر آئے مہمان سے پہلے سلام دعا کرتے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ وہ بے چاری تو میرے بتانے پر کہ تم شاید سکول کی جاب چھوڑ دو، کہہ رہی تھی کہ وہ بھائی سے کہہ کر تمہیں جاب دلوا دے گی۔ تمہیں جاب نہیں کرنی تو نہ کرو...... اس پر کیوں برس رہے ہو؟'' وہ اسے تنبیہ کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اماں!'' ارتضیٰ نے انہیں پکارا لیکن وہ باہر چلی گئی تھیں۔

''مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔ مجھے وضو کرنا ہے۔''

اماں کے جانے کے بعد ایمل نے کہا۔ ''تم صاف صاف بتاؤ، کیا بات ہے؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''صاف صاف سنو گی تو سنو! تمہارے بھائی صاحب دو روز قبل دفتر میں آئے تھے اور انہوں نے مجھے آفر کی تھی کہ میں اپنے اخبار میں ان کی پارٹی کو سپورٹ کروں۔ وہ مجھے میرے اخبار کو اپنے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے مجھے بہت بڑی آفر کی ہے۔ لیکن ایمل وزیر علی خان! میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ مجھے کسی گروہ، پارٹی کا ماؤتھ پیس بننا گوارا نہیں ہے۔ میرا قلم آزاد ہے اور مجھے اسے پابند نہیں کرنا۔''

'تو بابا کا مطلب یہ تھا۔' ایمل نے دکھ سے سوچا۔

''تم بتا دینا اپنے بھائی کو ایمل! کہ......''

''ارتضیٰ عباس!'' ایمل ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ''میرے بھائی اگر تمہارے پاس گئے ہیں تو مجھے اس کا علم نہیں ہے اور نہ ہی میں اس وقت ان کے کہنے پر یہاں آئی ہوں...... بھائی کو تو شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم چند دوستوں نے مل کر جو اخبار نکالا ہے، یہ وہی اخبار ہے۔''

''حیرت ہے کہ انہیں اس بات کا علم نہیں۔'' ارتضیٰ نے آہستگی سے کہا۔

''وہ بہت مصروف آدمی ہیں اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا ارتضیٰ عباس! کہ وہ میرے پاس بیٹھ کر میرے مشغلوں یا میری حماقتوں پر ڈسکس کریں۔'' ایمل کا لہجہ ہمیشہ جیسا تھا، نرم اور آہستہ۔ اس میں ہلکی سی تلخی تھی۔ ''مجھے افسوس ہے ارتضیٰ! کہ تم دوستوں سے ہمیشہ بدگمان ہو جاتے ہو۔ حالانکہ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے بھائی کی بات ماننے سے انکار کر دیا...... بائے۔'' بات ختم کر کے اس نے ایک نظر ارتضیٰ پر ڈالی جو قدرے نادم سا کھڑا ہوا تھا اور پاس پڑا ہوا بیگ اٹھا لیا۔

''سوری ایمل!'' ارتضیٰ نے معذرت کی۔ ''میں سمجھا شاید......''

''تم ہمیشہ غلط سمجھتے ہو اور شاید کبھی بھی صحیح سمجھ نہ پاؤ۔'' اس نے قدم اٹھایا۔

''پلیز ایمل! میری معذرت تو قبول کر لو۔ خفا ہو گئی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ جانے کے لئے باہر کی طرف بڑھی۔

''پلیز، کچھ دیر رک جاؤ۔ آپا چائے لا رہی ہیں۔''

ایمل کی نظریں ارتضیٰ کی نظروں سے ملیں۔ ان میں ندامت کے رنگ صاف نظر آ رہے تھے اور جانے کیا تھا ان آنکھوں میں کہ ایمل کی نظریں جھک گئیں اور ارتضیٰ نے نظریں چرا لیں۔

''بیٹھو پلیز۔'' اس نے اشارہ کیا تو وہ بیگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

عروج چائے لے آئی تو چائے پیتے ہوئے وہ بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایمل نے اسے اپنے سروے کے متعلق بتایا کہ ہسپتالوں میں وہ کیا کچھ دیکھ رہی ہے۔

''مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا ارتضیٰ! کہ ہمارے ہسپتالوں کی حالت اتنی قابل رحم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اتنے لالچی کیوں ہیں؟ اور ڈاکٹر تو بہت مقدس پیشہ ہے۔''

''ہوں۔'' ارتضیٰ نے اسے غور سے دیکھا۔ 'یہ لڑکی اپنے بھائی سے کتنی مختلف ہے...... درد مند دل رکھنے والی حساس لڑکی...... اور وہ اس کا بھائی ارباب وزیر علی خان...... کتنی نخوت سے بات کر رہا تھا جیسے میں کوئی اس کا زرخرید غلام ہوں۔'

''ایمل! تم اپنے خاندان سے کس قدر مختلف ہو۔'' ارتضیٰ نے اظہار کیا تو ایمل مسکرا دی۔

ارتضیٰ نے پہلی بار اس روز اپنے بارے میں اس سے باتیں کیں۔ مرتضیٰ اور بابا کے

متعلق بتایا، چچا کا ذکر کیا...... اپنے خواب اور آدرش بتائے۔ آج اس کے لہجے میں بڑ
نرماہٹ تھی۔ ایمل کو کئی بار ایسا لگا جیسے بات کرتے کرتے اس کی نگاہیں لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر ٹھہر سی جاتی ہیں اور پھر فوراً ہی وہ نگاہوں کا رخ بدل لیتا۔

”خدا کرے ارتضٰی! کہ تمہیں تمہارے خوابوں کی تعبیر مل جائے۔“ ایمل نے جا ہوئے کہا۔

”آمین۔“ ارتضٰی نے زیرلب کہا۔

”ایمل اچھی لڑکی ہے نا؟“ اس کے جانے کے بعد عروج نے ارتضٰی سے کہا۔

”ہوں......“ ارتضٰی نہ جانے کس سوچ میں کھویا ہوا تھا، چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

”مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور اماں کو بھی۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہیں کوئی اچھی سی جاب مل جائے تو ہم چلیں گے اس کے گھر۔“

”آپا......“ ارتضٰی کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ ”یہ ناممکن ہے ...... آپ یہ سوچنے لگیں؟ ایمل کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے ...... اس کے والد وزیر علی خان بلوچ صرف یہ کہ قومی اسمبلی کے ممبر ہیں بلکہ بہت بڑے آدمی ہیں اپنے علاقے کے......“

”لیکن ایمل تمہیں پسند کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے ...... کیا اس کی پسند کوئی اہمیت رکھتی ہوگی؟ یہ لوگ خاصے لبرل لگتے ہیں۔“

”آپا پلیز!“ ارتضٰی نے درخواست کی۔ ”آپ اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دیں یہ ممکن نہیں ہے۔ اور پھر میں ...... میں نے اس طرح کبھی نہیں سوچا۔ میرے خواب طرح کے ہیں۔ میرے راستے بالکل مختلف ہیں جہاں کسی نرم اور لطیف جذبے کی گنجائش نہیں ہے۔“

”رنی!“ عروج نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے مجھ سے وعدہ کیا کہ تم ایسے راستوں پر نہیں چلو گے جن پر چل کر مرتضٰی اور ابا جان نے موت کو گلے لگا تھا۔ تم ان راہوں کے مسافر نہیں بنو گے۔ رنی پلیز! ہمارا واحد سہارا اب تم ہی ہو۔ ماں جی کو، شیبی اور صبیی کو ہم سب کو تمہاری ضرورت ہے۔ ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔“

”آپا......“ ارتضٰی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی دی۔ ”مجھے اپنا وعد ہے۔ آپ پریشان نہ ہوا کریں۔“

اور پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں، وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

ملک میں ایک بار پھر انتخابات کی مہم شروع ہو چکی تھی۔ اخبارات لیڈروں کے بیانات سے بھرے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی پارٹی پر کیچڑ اچھالی جا رہی تھی۔ دعوے اور وعدے ہو رہے تھے۔ ارتضٰی ان دنوں بے حد مصروف تھا۔ مختلف لیڈروں کے انٹرویوز ...... بڑے بڑے سیاسی مبصرین سے ملاقاتیں ...... نئے سیاسی حالات کے متعلق پیش گوئیاں......

اس کے اخبار کی سرکولیشن بہت بڑھ گئی تھی ...... کئی بڑے لیڈروں نے خود اس سے انٹرویو کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ارتضٰی نے سکول کی جاب چھوڑ دی تھی اور اب پورا وقت اخبار کو دے رہا تھا۔

اس دوران بہت مشکل وقت بھی آیا۔ کئی بار اس کے اخبار کا ڈیکلریشن ضبط ہوا۔ کئی بار اسے دھمکیاں دی گئیں قتل کرنے کی، مارنے کی۔ بڑی بڑی رقوم کی آفر کی گئی۔ لیکن اب وہ جس راستے پر چل نکلا تھا اس راستے سے پلٹنا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

اب اس کا عزم مضبوط ترین ہو گیا تھا۔

وہ گھبراتا نہیں تھا۔

پریشان نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر بار اس کے ارادے پختہ ہو جاتے تھے۔

ہر بار وہ گر کر اٹھ کر کھڑا ہوتا تھا۔

ایک بڑا طبقہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اس کے قلم کی بے باکی کو سراہتا تھا۔ ہر روز اس کے اخبار کے دفتر میں ڈھیروں خطوط آتے تھے جو اس کے حوصلوں کو بلند کرتے تھے۔ اس کی ہمتوں کو بڑھاتے تھے۔

یہ ان لوگوں کے خطوط ہوتے تھے جو اس وطن سے محبت کرتے تھے۔ جو چاہتے تھے کہ ان کے ملک سے کرپشن ختم ہو جائے ...... جو ان سیاست دانوں کی چالاکیوں سے تھک چکے تھے۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ ہمت ہارنے لگا تھا مگر اس کے ساتھی، اس کے دوست اس کی ہمت بڑھاتے تھے، اسے حوصلہ دیتے تھے۔

ایک بار جب ڈیکلریشن ہو چکا تھا تو وہ انتہائی مایوس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھیوں کے پاس بھی کچھ نہیں تھا کہ وہ ایک بار پھر ڈیکلریشن حاصل کر لے کہ اچانک کسی نامعلوم شخص نے دبئی سے ایک بڑی رقم کا ڈرافٹ بھیج دیا۔ اور پھر اکثر جب وہ کسی مشکل میں گرفتار ہوتا تھا تو اس نامعلوم شخص کی طرف سے رقم آ جاتی تھی۔ پتہ نہیں اسے غیب کا علم

تھا۔ کئی بار اسے گمان گزرا تھا کہ شاید یہ وجاہت ہے جو اس کے لئے اتنی بڑی بڑی رقو
بھجواتا ہے اور اس نے اُسریٰ سے پوچھا بھی تھا لیکن اُسریٰ نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔

ایک بار وہ کوٹ لکھپت جیل میں تھا۔ اس پر حکومت کے خلاف لکھنے کے سلسلے میں مقدمہ چل رہا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اس کے لئے سب سے بڑے وکیل کا انتظا کیا تھا۔ بعد میں جب وہ رہا ہوا تھا تو اسے پتہ چلا کہ وکیل کی فیس کا انتظام دبئی سے آنے والے نامعلوم آدمی کے چیک سے کیا گیا ہے۔

اور ان سارے مشکل مرحلوں سے گزر جانے کے بعد اب اس کے اخبار کا ایک نا تھا۔ ایک مقام تھا۔

اُسریٰ اور ایمل اب بھی اس کے اخبار کے لئے کام کرتی تھیں۔ اگرچہ دونوں نے اپنا ایم۔اے مکمل کر لیا تھا۔ اُسریٰ کو لیکچرر شپ مل گئی تھی اور ایمل فارغ تھی۔ بابا او اماں نے اسے کتنا مجبور کیا تھا کہ وہ کوئٹہ آ جائے لیکن وہ ضد کر کے لاہور ہی میں مقیم تھی مشاہد اور ارسلان تھے جو باقاعدگی سے دفتر آتے تھے۔ مجاز تھا جسے اس کے سسر نے بہت اچھی جاب دلوا دی تھی لیکن وہ بھی وقت نکال کر دفتر آتا تھا۔

زارا تھی ...... وہ معصوم سی سادہ دل لڑکی۔ جو اب باقاعدہ اس کے اخبار کے لئے کا کرنے لگی تھی اور ہر ہفتے باقاعدگی سے طنز و مزاح میں اس کا کالم چھپتا تھا اور ان سب اچھے لوگوں کے ساتھ نے اسے بہت مضبوط، بہت حوصلہ مند بنا دیا تھا۔

آج بھی ارتضٰی کو ایک بڑی شخصیت کا انٹرویو کرنا تھا، اس لئے صبح صبح ہی آفس سے نکل گیا تھا۔ جب اُسریٰ اور ایمل آئیں تو دفتر میں صرف ارسلان تھا جو ایک ڈائجسٹ ہاتھ میں لئے اپنی مخصوص ٹیبل پر چڑھا بیٹھا تھا۔

"آہا ...... آئیے خواتین، بڑے دنوں بعد رُخ روشن پر نظر پڑی ہے۔"

"ہم مصروف تھے۔"

"مثلاً کیا مصروفیات تھیں؟"

"کچھ شاپنگ وغیرہ کرنا تھی اُسریٰ کے لئے۔"

"کیوں ...... کیا مسٹر وجاہت تشریف لا رہے ہیں؟"

"ہاں ......" ایمل نے بتایا۔

"اچھا ...... تو پھر بی بی اُسریٰ بھی گئیں کام سے۔

مکھڑے پہ سہرا ڈالے آ جا او آنے والے

چاند سی بنو میری تیرے حوالے"

وہ تالیاں بجا بجا کر لہک لہک کر گانے لگا۔

"بھانڈ ہو پورے۔" اُسریٰ ہنس دی۔

"بائے داوے رخصتی کب طے پائی ہے؟"

"پندرہ کو۔"

"اتنی جلدی؟"

"ہاں ...... وجاہت صرف ایک ماہ کی چھٹی پر آ رہا ہے۔" ایمل نے بتایا۔

"اُسریٰ ساتھ جائے گی؟"

"شاید۔"

ایمل اور اُسریٰ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔

"تو اب ہمارے ایٹ اسٹارز میں سے باقی رہ جائیں گے پانچ اسٹارز۔"

"پانچ کیوں؟" ایمل نے اپنی فائل اٹھاتے ہوئے کہا۔ "وجاہت اور اُسریٰ کے علاوہ باقی تو سب ہیں۔"

"مجاز بھی اپنے سسر کو پیارے ہو گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اُسریٰ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ابھی پچھلے ہفتے تو وہ یہاں دفتر میں ہی موجود تھا اور سب کے ساتھ اس نے بھی ارتضٰی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا، ہر مشکل اور ہر مصیبت میں۔ پھر کیا ہو گیا اچانک؟"

"اس کے سسر نے منع کر دیا ہے۔ گورنمنٹ کے ملازم ہیں۔ بیوی بھی سسر کی بیٹی ...... ملازمت بھی ان کی دلوائی ہوئی۔ بے چارہ کیا کرے۔"

"لعنت بھیجے نوکری پر اور ......" اُسریٰ نے غصے سے کہا۔

"کہنے اور کرنے میں فرق ہوتا ہے بی بی! کل کو وجاہت تمہیں منع کر دے اخبار کے لئے کام کرنے کو تو تم ...... تمہاری پہلی ترجیح کیا ہو گی؟"

اُسریٰ نے سر جھکا لیا۔

واقعی شاید وہ وجاہت کو ناراض نہ کر سکے۔

لیکن وجاہت۔

اس نے کبھی اسے اخبار کے لئے کام کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ خود اخبار چھوڑ گیا تھا۔

"وجاہت ایسا نہیں ہے۔" اس نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

"میں نے بھی فرض کیا تھا۔" ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں جانتا ہوں وجاہت ایسا نہیں ہے۔ شاید اب بھی وہ ہمیں سوچتا ہو...... لیکن وہ مجبور ہو گیا تھا۔ کون جانے کتنی بڑی مجبوری تھی۔"

ارسلان! ارتضیٰ نے یہ سروے دیکھا تھا؟" ایمل نے پوچھا۔

"ہوں...... دیکھا تھا۔"

"پھر اس کو نیٹ کر دوں؟"

"ابھی نہیں کرو۔ ارتضیٰ کہہ رہا تھا، کہیں کہیں تم نے بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔"

"لیکن یہ حقیقت ہے ارسلان! یہ نام نہاد ادارے جو خود کو رفاہی ادارے کہتے ہیں یہ درحقیقت رفاہی ادارے نہیں ہیں۔ چندہ اکٹھا کر کے اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں...... اور یہ دارالامان کی طرح کے ادارے...... میں تمہیں کیا بتاؤں ارسلان! کل میں اور اُسریٰ ایسے ہی ایک ادارے میں گئے تھے۔ اس کی منیجر شکل سے ہی بڑی عیار اور مکار لگ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ لڑکیوں سے ملانے پر رضامند ہوئی۔ کچھ لڑکیاں سہمی ہوئی تھیں، غالباً نئی آئی تھیں۔

گھروں سے بھاگی ہوئی لڑکیاں۔

شوہروں اور سسرال کے ہاتھوں ستائی ہوئی لڑکیاں۔

یتیم اور بے آسرا لڑکیاں۔

ان میں سے ایک لڑکی سے ہم نے باہر ملاقات کی تھی۔ یقین کرو ارسلان! اس نے جو کچھ بتایا ہے وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ یہ "جائے پناہ" ان خواتین کو پناہ دینے کی بجائے ان کے لئے جہنم کے دروازے کھول دیتا ہے...... اور مجھے یہ سب لکھنا ہے ارسلان...... صاف صاف۔"

"ارے بابا! لکھو جو دل چاہے۔ لیکن اسے نیٹ کرنے سے پہلے ارتضیٰ سے بات کر لو۔ ابھی پچھلے ہفتے تم لوگوں کا جو "یتیم خانوں" پر سروے چھپا ہے اس کے بعد سے پتہ ہے، ارتضیٰ کو مسلسل دھمکی آمیز فون مل رہے ہیں اور وہ مولوی صاحب...... کیا نام تھا ان کا، "شیر خان" وہ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ کبھی اخبار بند کرانے کی دھمکی دیتے ہیں، کبھی سب کو مروا ڈالنے کی۔"

"اچھا...... ارتضیٰ نے تو ذکر نہیں کیا۔" ایمل نے کہا۔

"تم ایک ہفتے سے غائب ہو...... کیسے ذکر کیا جاتا؟"

"اچھا...... پھر ارتضیٰ آ جائے تو اس کے بعد ہی اسے نیٹ کرتی ہوں۔ کہیں اس کے لئے مصیبت ہی نہ بن جائے۔" ایمل نے سوچا اور فائل بند کر دی۔

ہسپتالوں والے سروے کے سلسلے میں بہت مصیبت اٹھانا پڑی تھی۔ انہوں نے اپنے سروے میں اس مریض لڑکی کا ذکر کیا تھا جو ڈاکٹروں کی بے پرواہی کی نذر ہو گئی تھی۔

سولہ سالہ خوبصورت اکلوتی بیٹی۔

اس کے والدین نے زار و قطار روتے ہوئے بتایا تھا، میری بچی کی موت کے ذمے دار سراسر ڈاکٹر رزاق ہیں۔

اس کے والد بعد میں اخبار کے دفتر بھی آئے تھے...... انہوں نے عدالت میں کیس بھی کر دیا تھا لیکن ان کے لئے یہ چھاپنا عذاب بن گیا تھا۔ ڈاکٹر رزاق کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ان کی بیک بہت مضبوط تھی۔ بہت بڑے والدین کے بیٹے تھے۔ انہوں نے ان کے لئے بہت بڑی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ لیکن ارتضیٰ نے سب کچھ اپنے اوپر لے لیا تھا۔ ان پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔

"اُسریٰ تم شاید شادی کے بعد وجاہت کے ساتھ چلی جاؤ۔ پھر ہمارا یہ سلسلہ سروے والا بھی ختم ہو جائے گا۔" ایمل نے اُداسی سے کہا۔

"تم زارا کے ساتھ چلی جایا کرنا۔ زارا کے قلم میں میرے اور تمہارے قلم سے زیادہ زور ہے۔ افسانہ نگار جو ہوئی...... ہماری تحریر تو بس سیدھی سادھی ہوتی ہے۔"

"بی بی! صحافت میں افسانہ نگار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ زارا تو رپورٹ لکھنے کی بجائے افسانہ تیار کر دے گی۔"

"یہ میری عدم موجودگی میں میرا نام کیوں لیا جا رہا ہے؟" زارا ہانپتی کانپتی اندر داخل ہوئی اور اندر داخل ہوتے ہی اپنا بھاری بھرکم بیگ زمین پر پھینکتے ہوئے خود بھی دھپ سے گر گئی۔

"میں ایمل سے کہہ رہا تھا کہ زارا کے افسانے پڑھا کرو۔ فائدہ ہو گا۔"

"مثلاً کیسا فائدہ؟" اُسریٰ نے پوچھا۔

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں...... حالِ دل کہنے کا سلیقہ آئے گا۔ پتھر کو پگھلانے کے گُر سمجھ میں آئیں گے۔ تمہاری دوستی سے تو اس ایمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، کم از کم زارا کے

افسانے پڑھ کر اسے ضرور عقل آ جائے گی۔''

'حالِ دل کہنے کا سلیقہ......' ایمل نے افسردگی سے سوچا۔ 'کیا ضروری ہے کہ حالِ دل زبان سے کہا جائے ...... کیا آدمی کا چہرہ، اس کی آنکھیں، اس کی ایک ایک حرکت، اس کی کیفیات کا اظہار نہیں کرتی؟ کیا ارتضٰی کو کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میں اس کے لئے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتی ہوں؟

اس کا دل پتھر نہیں ہے۔ پھر بھی میری محبت اسے پگھلا نہ سکی۔

اس کے دل میں سب کے لئے درد ہے۔

وطن کے لئے ...... اہلِ وطن کے لئے۔

ہسپتالوں میں دم توڑتے ہوئے لاوارث مریضوں کے لئے ...... یتیم خانوں میں پلنے والے بچوں کے لئے جنہیں بھیک مانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

ان بچوں کے لئے جنہیں اغواء کر لیا جاتا ہے۔

ان عورتوں کے لئے جو فروخت ہو جاتی ہیں۔

وہ جب ملک میں ہونے والی زیادتیوں کا ذکر کرتا تو اس کی آواز بھرا جاتی۔ آنکھیں نم ہو جاتیں۔

وطن میں ہونے والی کرپشن کا ذکر کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو جاتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک گداز دل رکھتا تھا۔

لیکن اس کی محبت سے نا آشنا تھا۔

محبت کی تپش نے اس کے دل کو نہیں پگھلایا تھا اور وہ خود ہی جل کر راکھ ہو رہی تھی۔

''ایمل ...... کیا سوچنے لگی ہو؟'' اُسریٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی۔

''کچھ نہیں۔''

ارسلان کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

''ایمل! ایک بات کہوں؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا؟'' ایمل نے پوچھا۔

''چلو پھر کبھی سہی۔'' وہ زارا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اور تم اس وقت کہاں سے تشریف لا رہی ہو؟''

''اُسریٰ کے لئے گفٹ خریدنے گئی تھی۔ مگر توبہ، اس قدر رش ہوتا ہے بازاروں

میں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو ہر روز کیا خریدنا ہوتا ہے۔''

''بھئی انہیں پتہ نہیں ہوتا نا کہ آج زارا خاتون شاپنگ کرنے آ رہی ہیں ورنہ وہ اس روز گھر بیٹھ جائیں۔ ویسے خریدا کیا ہے؟''

''کچھ نہیں......'' زارا نے منہ بسورا۔ ''دو گھنٹے گھوم گھوم کر کچھ پسند ہی نہیں آیا۔''

''تمہیں کچھ پسند ہی نہیں آئے گا اور پندرہ تاریخ آ جائے گی اور بی بی اُسریٰ اپنے دُولہا میاں کے ساتھ اُڑ جائیں گی دبئی کی طرف۔''

''پندرہ تاریخ ...... اس ماہ کی پندرہ؟'' زارا چیخی۔ ''اتنی جلدی؟''

''ہوں ...... تمہارے صاحب بہادر کب آ رہے ہیں امریکہ سے؟''

''تمہیں کیا؟'' زارا نے تڑخ کر کہا۔

''میں نے سوچا، اُسریٰ کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی بھگتا دیں۔''

''کیوں، تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' زارا اپنے موڈ میں آ چکی تھی۔

''نہیں، بھلا مجھے کیا تکلیف ہے ...... میں تو سوچ رہا ہوں، تم دونوں کو رخصت کر کے طبلہ بجاؤں گا اور گاؤں گا۔

سات چوہے گھر سے نکلے
کرنے چلے شکار

وہ میز بجا بجا کر گانے لگا۔

ایک چوہے کو کھا گئی بلی
باقی رہ گئے چار''

''ہم ...... ہم چوہے ہیں؟'' زارا کو بات ذرا دیر سے سمجھ آتی تھی۔

''نہیں تو ...... تم بھلا ''چوہا'' کیسے ہو سکتی ہو؟'' ارسلان نے معصومیت سے کہا۔ ''چوہا تو مذکر ہوتا ہے۔''

''ارسلان ...... ارسلان! آخر تم مجھے اتنا تنگ کیوں کرتے ہو؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

'میں تمہیں اتنا عزیز رکھتی ہوں اور تم......''

''میں بھی تمہیں عزیز رکھتا ہوں۔ دیکھ لو، تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے افسانوں سے دل بہلاتا ہوں۔'' اس نے میز پر پڑا ہوا ڈائجسٹ اٹھا کر اسے دکھایا جسے وہ ایمل اور اُسریٰ کے آنے سے پہلے پڑھ رہا تھا۔

''اس ماہ کا ہے؟'' زارا سے پوچھا۔ ''تم نے پڑھا میرا افسانہ...... کیسا لگا؟ نیا موضوع

ہے نا بالکل؟" وہ ساری خفگی بھول کر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

ارسلان نے برا سا منہ بنایا۔ "کسی خاتون کے قلم سے "طوائف" کے موضوع پر آ ہوا افسانہ مجھے زہر لگتا ہے۔"

"کیوں؟" زارا نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"پتہ ہے، ایڈیٹر صاحب نے اسے اتنا پسند کیا کہ مجھے خود خط لکھا ہے تعریف کا۔"

"تم نے کبھی کسی "طوائف" کو دیکھا ہے؟...... تم جانتی ہو کہ وہ مظلوم ہوتی ہیں ظالم؟ تم نے اپنی ہیروئن کو بڑا مظلوم ثابت کیا ہے حالانکہ زارا بی بی! سینکڑوں میں کوئی ایک دو ہی مظلوم ہوتی ہیں۔"

"تم نے دیکھا ہے...... ملے ہو کسی طوائف سے؟" زارا نے پوچھا۔

"توبہ، توبہ......" ارسلان نے اپنے رخساروں پر تھپڑ مارا۔ "میں اتنا شریف اور معصوم سا بچہ ہوں۔"

"پھر تمہیں کیا معلوم کہ وہ ظالم ہوتی ہیں یا مظلوم؟"

"ارے بی بی!" ارسلان نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا۔ "اب گھسے پٹے موضوعات پر لکھنا چھوڑ دو۔ نئے موضوعات پر لکھو۔ یہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے جس پر تم نے لکھا۔ بہت سے اس موضوع پر تم سے پہلے لکھ چکے ہیں۔"

"تمہیں میرے افسانے پسند نہیں آتے تو پھر پڑھتے کیوں ہو؟"

"مجبوری ہے...... عزیز جو رکھتا ہوں تمہیں۔" وہ مسکرایا۔

تب ہی دروازہ کھلا اور ارتضٰی تھکا تھکا سا اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ مشاہد بھی تھا۔

"سب لوگ ہیں۔" وہ سب کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ بجھی بجھی سی تھی۔

"ہوگیا انٹرویو؟"

"نہیں......" ارتضٰی نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں......؟" ارسلان نے پوچھا۔

لیکن ارتضٰی خاموش ہی رہا۔

"ارتضٰی! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ مجھے تم سے اس ویلفیئر اداروں والے سروے پر بات کرنا تھی۔ ارسلان کا خیال ہے کہ مجھے اس میں کچھ کاٹ چھانٹ کرنی چاہئے حالانکہ یہ سب سچ ہے۔ اس میں کچھ جھوٹ نہیں ہے۔"

"سچ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے ابی! پھاڑ کے پھینک دو اس سروے کو۔"

"کیوں؟" اُسریٰ نے بے اختیار پوچھا۔ "کیا بات ہے ارتضٰی! آج پھر تم مایوس نظر آرہے ہو۔ تمہارے چہرے پر ویسی ہی تھکن ہے جیسی وجاہت کے زخمی ہونے والے دن تھی۔"

"ڈیکلریشن پھر ضبط ہوگیا ہے اور میرے وارنٹ بھی آ گئے ہیں...... دفتر سے باہر نکلتے ہی ایک کرم فرما نے بتایا۔ تب سے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں اور اب ضمانت قبل از گرفتاری کروا کے آ رہا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟" ارسلان نے پوچھا۔

"پتہ نہیں...... اپنے جرم کا ابھی مجھے خود بھی پتہ نہیں ہے۔ غالباً پچھلے ہفتے کے اخبار میں جو ایک وزیر صاحب کے ظلموں کی داستان چھاپی تھی نا، شاید اسی وجہ سے زیر عتاب آیا ہوں۔"

"اور ان وزیر صاحب کے گریبان کو پکڑنے والا کوئی ہاتھ نہیں ہے جنہوں نے بے چارے غریب لوگوں کی زمینیں زبردستی چھین کر اپنے فارم بنائے...... وہ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا فارم ہم خود دیکھ کر آئے ہیں ارتضٰی جس میں ہزاروں مویشی ہیں۔ اور ان لوگوں سے خود ملے ہیں جن سے زبردستی زمین چھینی گئی ہے۔ جن کے جانور......"

ارسلان غصے سے بولتا رہا۔ ارتضٰی خاموش بیٹھا رہا۔ بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور حسرت سے کہا۔

"آج شاید اس جدوجہد کا اختتام ہو جائے جس کا آغاز آج سے تقریباً ساڑھے تین سال قبل ہوا تھا۔ اب شاید ہم بھی اس اخبار کو جاری نہ کر سکیں۔"

"کیوں؟" زارا نے پوچھا۔

"میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔"

"تم اپنے نامعلوم ہمدرد کو بھول گئے؟"

"شاید اس بار وہ بھی ہماری مدد نہ کر سکے۔" ارتضٰی کی نگاہیں اُسریٰ کی نظروں سے ٹکرائیں۔

اُسریٰ نے نگاہیں جھکا لیں۔

"اخبار بند نہیں ہوگا۔" ارسلان نے یقین سے کہا۔ "ہم سب کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔"

"کب تک؟" ارتضٰی نے ارسلان کی طرف دیکھا۔ "کب تک تم رقم برباد کرتے رہو گے۔ پھر ڈیکلریشن ضبط ہو جائے گا۔ پھر......"

"تم مایوس کیوں ہوتے ہو ارتضٰی!" مشاہد نے آہستگی سے کہا۔ "ہم زندگی اور موت دونوں راستوں میں تمہارے ساتھ ہیں۔" اس نے اپنا ہاتھ ارتضٰی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ارتضٰی مسکرا دیا۔

"پتہ نہیں کیوں، میں مایوس ہو جاتا ہوں ...... حالانکہ تم جیسے ساتھیوں کے ہوتے ہوئے مجھے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ تھینک یو۔"

"یوں بھی مایوسی کفر ہے......" ارسلان نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "اور آج تو ویسے بھی خوشی کا دن ہے۔ ہماری اُسریٰ بی بی پیا سنگ رخصت ہو رہی ہیں۔ آج غالباً ان کا اس دفتر میں آخری دن ہے۔"

ارتضٰی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کل سے یہ مایوں بیٹھ رہی ہیں۔"

"تمہیں الہام ہوتا ہے کیا......؟" اُسریٰ نے پوچھا۔

"کیوں ...... غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"نہیں ...... کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ لیکن میں جب تک ہوں، آتی رہوں گی۔" اُسریٰ مسکرا دی تو وہ تالیاں بجانے لگا۔

"مکھڑے پہ سہرا ڈالے آ جا او آنے والے"

وہ لہک لہک کر پھر سے گانے لگا۔ اسے موڈ بدلنے میں کمال حاصل تھا۔ سب مسکرا رہے تھے۔ اور وہ تھرک رہا تھا۔

"عدالت میں بھی یوں ہی ٹھمکا ڈالتے رہو گے؟" زارا نے جل کر کہا۔ "کیس کو لڑنا ہے۔"

لیکن اس نے زارا کی بات کا جواب نہ دیا اور دھن بدل دی۔

"شاوا جیوے بنڑا"

اور وہ سب بے ساختہ مسکرا رہے تھے۔ لمحہ بھر میں اُداسی اور مایوسی خود بخود ختم ہو گئی۔

⁂

ایمل اُسریٰ کو ڈراپ کر کے گھر آئی تو بابا اسے لاؤنج میں غصے سے ٹہلتے ہوئے نظر آئے۔

"بابا آپ...... آپ کب آئے؟"

انہوں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بس یوں ہی گہری گہری نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر ایک دم مڑے اور سینٹر ٹیبل پر پڑا ہوا اخباروں کا پلندہ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ ...... یہ اس گھٹیا ہفت روزے میں تم لکھتی ہو...... الف۔م کے نام سے۔ یہ...... یہ تمہارے لکھے ہوئے سروے ہیں؟"

"جی بابا ...... میرے اور اُسریٰ کے۔" ایمل نے اخباروں کا پلندہ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہی تو وہ اخبار ہے جسے کچھ دوستوں نے مل کر نکالا ہے۔ میں نے آپ کو بتانا تھا بابا......"

"ہوں......"

وہ غصے سے پھنکارے۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ یہی اخبار ہے۔ اور یہ ارتضٰی عباس، مشاہد رضوی، ارسلان صفی، زارا اور ...... یہ سب گندے لوگ تمہارے دوست ہیں؟"

"بابا......" ایمل نے احتجاج کیا۔ "یہ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ مخلص اور محب وطن لوگ۔"

"ہوں ...... ییلو جرنلزم ...... چھوڑ دو اس اخبار کو اور میرے ساتھ کوئٹہ چلو۔ بلیک میلروں کا اخبار......"

"بابا ......" ایمل کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ "ہم لوگ بلیک میلر نہیں ہیں۔ حقائق بیان کرتے ہیں۔ سچ ہوتا ہے سب کچھ۔ بلیک میلر تو وہ ہیں جو اس اخبار کو بند کرانا چاہتے ہیں کہ ان کے کالے کارناموں سے لوگ واقف نہ ہوں۔ دھوکے باز۔"

اس کی آواز قدرے اونچی ہو گئی۔ "ان وزراء اور سیاست دانوں نے کتنی بڑی بڑی رقوم کی آفرز کی ہیں اور ارتضٰی نے ان آفرز کو ٹھکرا دیا ہے۔ دھمکیاں دی ہیں، کئی بار اخبار بند کروا چکے ہیں۔ لیکن بابا! سچ کو کب تک چھپایا جا سکتا ہے؟"

"میں کچھ نہیں جانتا ایمی ......" وزیر علی خان کی آواز نرم پڑ گئی۔ "لیکن تم اس اخبار کے لئے کام نہیں کرو گی۔ سمجھیں؟ تم جانتی ہو، ڈاکٹر رزاق جس کے خلاف تم نے اتنا کچھ لکھا ہے وہ کون ہے۔ میرے بہت عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ اور یہ ڈاکٹر رزاق ہی نے مجھے بتایا ہے کہ یہ سروے تم لکھ رہی ہو۔"

"بابا ...... بابا! یہ سب کچھ جو میں نے اور اُسریٰ نے لکھا ہے، غلط نہیں ہے۔ ڈاکٹر

رزاق کی کوتاہی سے جھنگ کے اس غریب شخص کی اکلوتی بیٹی کی جان گئی۔"

"دیکھو ایمل! یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"بابا! اپنے ہم وطنوں کے مسائل بھی تو ہمارے ہی مسائل ہیں۔"

"تمہیں ریفارمر بننے کی ضرورت نہیں ہے ایمل!" انہوں نے سختی سے کہا۔ "یہ جو اتنے بڑے بڑے مضامین لکھے ہیں، تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوا ہے، بتاؤ مجھے۔ کیا یتیم خانوں کی حالت سدھر گئی ہے؟ کیا ہسپتالوں میں مریضوں کے ساتھ اچھا سلوک ہونے لگا ہے؟ کیا ایجوکیشن کے مسائل حل ہو گئے ہیں؟"

"بابا......" ایمل نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ "بھلے کچھ بھی ہو لیکن کوشش تو کی ہے نا ہم نے۔"

"ایمل......" ان کا لہجہ بدستور سخت تھا۔ "میں ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ڈاکٹر رزاق کی طرح کوئی اور بھی تمہیں کھوجتا ہوا ہمارے گھر تک پہنچے...... آج سے یہ سلسلہ ختم۔"

وہ اپنی بات ختم کر کے ارباب کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے اور وہ وہیں ساکت بیٹھی رہ گئی۔

ارسلان نے کتنا صحیح کہا تھا...... ہولے ہولے کر کے سب ہی ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

پہلے وجاہت۔

پھر مجاز اور اُسریٰ۔

اور اب میں۔

بابا صحیح کہتے ہیں...... بھلا کیا فائدہ ہوا اس ساری بھاگ دوڑ کا...... سروے کے لئے وہ اور اُسریٰ کہاں کہاں نہیں گئی تھیں...... لیکن ساری ریاضت رائیگاں ہی تھی۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔

ہسپتالوں میں وہی حالت زار تھی۔

یتیم خانوں کا حال بھی بدتر تھا۔

رفاہی ادارے بھی خدمت خلق کے نام پر اپنے ذاتی اکاؤنٹ بڑھا رہے تھے۔

بابا، ارتضیٰ کے خلاف تھے۔ اس کا اندازہ اسے رات کھانے پر ارباب بھائی اور کے درمیان ہونے والی گفتگو سے ہوا تھا اور وہ...... اُس نے جس شخص کو دل و جان گہرائیوں سے چاہا تھا...... وہ یہی شخص تھا۔

اور اگر اس شخص نے ایک بار بھی...... ایک بار بھی اسے امید دلائی ہوتی...... ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہوتا تو وہ اس کے لئے لڑ سکتی تھی۔ اگرچہ یہ بہت مشکل تھا۔ بابا اور ارباب بھائی اس کے اتنے مخالف تھے۔

'خدایا! تُو نے اس شخص کی محبت میرے دل میں کیوں پیدا کی......؟'

بابا اسے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے اُسریٰ کی شادی میں شرکت کے لئے ان سے اجازت لے لی اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اس اخبار سے کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔

بابا کے جانے کے بعد وہ اُسریٰ کی طرف جانے کی بجائے سیدھی دفتر آئی۔ ارتضیٰ اکیلا بیٹھا تھا اور ملازم لڑکا چائے بنا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ایمل کو دیکھا۔

"کیسے ہو ارتضیٰ! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

"ٹھیک ہوں...... تم بیٹھو۔"

"نہیں، میں بس ذرا دیر کے لئے آئی تھی۔ یہ...... یہ......" اس نے بیگ سے چیک نکال کر ارتضیٰ کے سامنے رکھا۔ "یہ میرے ذاتی اکاؤنٹ کا چیک ہے۔"

"ایمل......" ارتضیٰ کی آواز بھرا گئی۔ "پتہ نہیں اس سب کا کچھ فائدہ ہوگا بھی یا نہیں...... ایسا ہی ایک چیک صبح مشاہد بھی دے گیا ہے۔ میں تم سب دوستوں کے خلوص و محبت کا ہمیشہ مقروض رہوں گا۔"

"محبتوں کا قرض محبتوں سے ہی چکایا جاتا ہے ارتضیٰ!" ایمل نے آہستگی سے کہا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں آج پھر سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ ارتضیٰ کی نظریں ذرا دیر اس کے چہرے پر ٹھہری رہیں۔

'تم وہ سب کچھ کیوں نہیں کہہ دیتے ارتضیٰ جو کہنا چاہتے ہو؟' ایمل نے افسردگی سے سوچا اور جانے کے لئے پلٹی۔

ارتضیٰ نے چونک کر نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

"ٹھہرو...... چائے پی کر جانا۔"

خان نے چائے کے دو کپ سامنے لا کر رکھ دیئے تھے۔

ایمل نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹھو پلیز......" ارتضیٰ نے کہا تو وہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی اور کپ اٹھا

لیا۔

چائے پی کر چیک دراز میں رکھتے ہوئے اس نے مایوسی سے کہا۔

''شاید اب بہت دنوں تک یہ اخبار جاری نہ رہ سکے۔ مجھے لگتا ہے جیسے اب اگر ڈیکلریشن ضبط ہوا تو ہم دوبارہ اسے حاصل نہ کر سکیں گے۔''

''مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو ارتضٰی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔'' ایمل نے اسے تسلی دی اور اسے یہ بتائے بغیر واپس آگئی کہ بابا نے اسے اخبار کے لئے کام کرنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اتنا مایوس اور دل گرفتہ سا بیٹھا تھا کہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

'پھر سہی ...... پھر کبھی بتا دوں گی۔' اس نے سوچا۔

'اُسریٰ کی شادی کے بعد۔'

لیکن اُسریٰ کی شادی سے ایک دن پہلے اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس کی ضمانت منسوخ ہو گئی تھی۔

اس کی عدم موجودگی میں ارسلان اور مشاہد نے بھاگ دوڑ کر کے ایک اور نئے نام سے ڈیکلریشن لے لیا تھا۔ مشاہد کے پاپا نے اس سلسلے میں ہمیشہ ان کی مدد کی تھی۔

''آواز'' کے نام سے اخبار چھپا لیکن باوجود کوشش کے وہ اسے ہفت روزہ نہ رکھ سکے۔ اب یہ پندرہ دن بعد چھپتا تھا۔ کبھی کبھی پندرہ دن بعد بھی نہ چھپ پاتا تھا۔

چھ ماہ بعد ارتضٰی آیا تو اخبار پندرہ روزہ ہی ہو گیا تھا۔ اس کی سرکولیشن کم ہو گئی تھی۔

اُسریٰ وجاہت کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وجاہت نے اسے کچھ عرصہ بعد بلانے کے لئے کہا تھا۔ ایمل بھی چند دن کوئٹہ رہ کر واپس آگئی تھی کیونکہ بابا اور اماں علاج کی غرض سے انگلینڈ چلے گئے تھے۔ بابا کو اچانک ہی گُردوں میں تکلیف ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس نے بابا سے وعدہ کیا تھا وہ آئندہ اخبار کے لئے کام نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی تھی۔

ارتضٰی کی عدم موجودگی میں اس نے ارسلان کے کہنے پر اخبار میں ایک کالم ''بھید'' کے نام سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُسریٰ بھی کچھ نہ کچھ لکھ رہی تھی۔ البتہ سروے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔

اخبار ہچکیاں لے لے کر ہی چل رہا تھا۔

پھر ارتضٰی آگیا۔

ایمل اور اُسریٰ کبھی کبھار دفتر جاتی تھیں۔

زارا اور ارسلان باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔ اگرچہ ارسلان نے پریکٹس شروع کر دی تھی اور ایک مشہور وکیل کے ساتھ بیٹھنے لگا تھا لیکن وہ اپنے آفس سے اٹھ کر سیدھا ارتضٰی کے پاس آتا تھا۔ مشاہد کا بھی ٹرانسفر ہو گیا تھا فیصل آباد اور وہ پندرہ روز بعد لاہور آتا تو دفتر کا چکر ضرور لگاتا تھا اور کوئی نہ کوئی آرٹیکل دے جاتا تھا لیکن اس کے باوجود اخبار کی سرکولیشن نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی کہ یکایک پھر اس کی مانگ بڑھ گئی۔ لوگ انتظار کرنے لگے تھے اس کا اور اخبار بازار میں آتے ہی بک جاتا تھا اور اس کی وجہ ارتضٰی عباس کے وہ مضامین تھے جو اس نے ''تیسرا ہاتھ'' کے عنوان سے لکھنا شروع کئے تھے۔

وہ تیسرا ہاتھ جو پسِ پردہ تھا لیکن جو ملک کی بیخ کنی کر رہا تھا، جڑیں کاٹ رہا تھا۔

اور ملک کا برسرِ اقتدار طبقہ اس ''تیسرے ہاتھ'' سے چشم پوشی کئے ہوئے تھا۔

دورانِ جیل اس کی ملاقات مولانا سعد اللہ خان سے ہوئی تھی۔ اسے ان کے ساتھ ہی رکھا گیا تھا۔

چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، گورا رنگ، سیاہ داڑھی جس میں کوئی کوئی سفید بال تھا۔ سجدوں کے نور سے مزین کشادہ پیشانی۔

ارتضٰی ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ان کی گفتگو میں بھی دلکشی تھی۔

''مولانا آپ کس جرم میں......؟'' پہلے ہی دن ارتضٰی نے ان سے پوچھا تھا۔

''جرم بے گناہی تھا، کٹ گئی سزاؤں میں......'' وہ مسکرائے تھے۔

وہ تین سال سے کوٹ لکھپت جیل میں تھے۔ وہ کس جرم میں تھے، یہ ارتضٰی کو معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

''سعد اللہ نام ہے میرا۔'' انہوں نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ ''جیل میں آ کر مولانا بھی ہو گیا ہوں۔ تین سال کاٹ لئے ہیں، دو سال مزید باقی ہیں۔ اگر اس دوران زندگی کی قید سے آزاد نہ ہوا تو اس جیل سے نکل کر تمہارے پاس آؤں گا۔''

جب سے انہیں پتہ چلا تھا کہ وہ سیّد عباس علی شاہ کا بیٹا ہے تو وہ اس سے بہت شفقت سے پیش آنے لگے تھے۔

''وہ میرے استاد تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔'' وہ سیّد عباس علی شاہ کا ذکر بہت احترام سے کرتے تھے ...... مرتضٰی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز تھا مجھے۔ لیکن ظالموں نے اسے مار ڈالا۔''

''عروج آپا بھی یہی کہتی ہیں کہ وہ حادثہ نہیں قتل تھا۔'' ارتضٰی نے انہیں بتایا تھا۔

وہ سیاست دان نہیں تھے لیکن سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہیں ملکی حالات کی جیل کے اندر بھی خبر تھی۔ وہ اکثر سیاست دانوں کے متعلق جانتے تھے کہ کون کس کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے۔ کون ملک کی تقدیر سنوارنے والے ہیں اور کون بگاڑنے والے۔ انہوں نے ایسے ایسے انکشافات کئے تھے کہ ارتضٰی دنگ رہ گیا تھا۔

یہ تو کوئی غیبی ہاتھ تھا جو ہر بار اس ملک کو ٹکڑے ہونے سے بچا لیتا تھا ورنہ جو کچھ مولانا سعد اللہ بتا رہے تھے اب تک تو......

''میں بھی تمہاری طرح ظالموں کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ میرا طریقہ کار کچھ مختلف تھا۔ بہر حال جیتے رہے تو پھر ڈٹ جائیں گے۔''

زندگی اپنی ہے ہی کب کہ اس کو بچا کر، سنبھال کر رکھا جائے۔ اور اب وہ ''تیسرا ہاتھ'' کے عنوان سے جو کچھ لکھ رہا تھا اس میں بہت کچھ مولانا سعد اللہ کے کئے ہوئے انکشافات تھے۔ لیکن وہ کچھ بھی لکھنے سے پہلے اپنے طور پر بھی اس کی تحقیق کر لیتا تھا۔

بہت سی نئی باتیں بھی سامنے آ رہی تھیں اور مولانا کی باتوں کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔

اس کے دورانِ جیل ہی انتخابات ہو گئے تھے۔ جو لوگ اپوزیشن میں تھے، وہ اقتدار میں آ گئے تھے اور جو لوگ اقتدار میں تھے، وہ اپوزیشن میں آ بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف زہر اُگلا جا رہا تھا۔ ایسے میں اس کے مضامین پڑھنے والوں کا حلقہ بڑھتا جا رہا تھا اور اخبار ایک بار پھر اس نئے نام سے مقبول ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''پابلو نرودا کہتا ہے۔

میں جانتا تھا (کیونکہ میں لہولہان تھا) کہ میری جڑیں کاٹ دی گئی ہیں۔''

ارسلان نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا۔ آج وہ اپنی مخصوص جگہ یعنی ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھنے کی بجائے نیچے دری پر کشن رکھے بیٹھا تھا۔ یہ فرشی کشن ایک بار اُسریٰ اور ایمل لائی تھیں۔

''ارسلان!'' اُسریٰ نے اپنے قریب ہی بیٹھی ایمل اور زارا کو ایک نظر دیکھتے ہوئے ارسلان کو مخاطب کیا۔ ''میں نے تم سے پابلو نرودا کے متعلق نہیں پوچھا کہ کیا کہتا ہے۔ میں نے ارتضٰی کا پوچھا تھا۔''

''میں بھی ارتضٰی کا ہی بتا رہا ہوں۔ اس کی جڑیں کاٹ دی گئی ہیں۔''

''ارسلان! فضول باتیں نہیں کرو پلیز۔'' اُسریٰ نے بے چینی سے کہا۔ ''تم بتاؤ تم

سے ملے تھے ارتضٰی؟''

''ہاں، اور وہ جانتا ہے (کیونکہ وہ لہولہان ہے) اُس کی جڑیں کاٹ دی گئی ہیں۔''

''پلیز ارسلان......'' اُسریٰ نے التجا کی۔ ''پہیلیاں مت بجھواؤ۔ صحیح طرح سے بتاؤ کہ ارتضٰی کہاں ہے؟ کیوں نہیں آ رہا ہے...... کیا......؟''

''شیبی کو اغواء کر لیا گیا ہے۔''

''نہیں......'' اُسریٰ اور زارا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کس نے اغواء کیا ہے شیبی کو اور کیوں؟''

''کون اغواء کر سکتا ہے......'' ارسلان نے تلخی سے کہا۔ ''کیا تم نہیں جانتیں؟ کیا تمہیں نہیں معلوم وہ لوگ کون ہیں جو ارتضٰی کے قلم کو خاموش کرنا چاہتے ہیں؟''

اُسریٰ اور زارا نے بے اختیار ایمل کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی نیلی، ہر دم خواب دیکھنے والی آنکھوں میں سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

وہ تو ارتضٰی سے ملنے آئی تھی۔ آخری بار اسے دیکھنے آئی تھی۔ حالانکہ اماں نے اور بھابھی شاہ نور نے کتنا منع کیا تھا۔ ''ایمی! تم اس وقت کہیں نہ جاؤ۔ چاچا، چاچی کیا کہیں گے۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے اور تم گھومتی پھرتی ہو۔ اور پھر مہتاب علی بھی تو آیا ہوا ہے۔ اس نے تمہیں یوں بازار میں دیکھ لیا تو کیا کہے گا؟ ہمارے ہاں تو لڑکیاں رخصتی سے مہینوں پہلے گھر بیٹھ جاتی ہیں۔''

لیکن اُسے ارتضٰی سے ملنا تھا۔

وہ آخری بار اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہتی تھی۔

اُس محبت کے رنگ ان آنکھوں میں دیکھنا چاہتی تھی جس محبت کا اظہار ارتضٰی کے لبوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن آنکھوں نے کبھی کبھی چغلی ضرور کھائی تھی۔ وہ اس بتانا چاہتی تھی کہ اس نے ...... ایمل وزیر علی خان نے ......

حالانکہ روزِ اوّل سے ہی اسے پتہ تھا کہ وہ اس کا نصیب نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں کی روایات و رواج الگ الگ تھے۔ لیکن پھر بھی ...... پھر بھی اگر کبھی ارتضٰی نے اس کی محبت کی پذیرائی کی ہوتی، اس کے جذبے کو سراہا ہوتا تو شاید وہ یوں بغیر لڑے ہتھیار نہ ڈالتی۔ وہ شاہ نور بھابھی کو ...... ارباب بھائی کو ...... اور بابا کو اپنی پسند سے آگاہ تو کر سکتی تھی۔

ضد کر سکتی تھی۔

لڑسکتی تھی۔

ضدی تو وہ ہمیشہ سے تھی۔ بچپن سے ہی اس نے اپنی ہر بات منوائی تھی۔

مشکل راستوں پر چلنا اسے پسند تھا۔

شاید اس لئے ارتضیٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ بہت مشکل راستہ تھا۔

لیکن اُس نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ایک بار بھی تو نہیں کہا تھا کہ اسے مہتاب علی خان کی رفاقت منظور نہیں۔

اور یہ کہ اس کے دل نے ہمیشہ، ہر آن صرف اور صرف ارتضیٰ عباس کی رفاقت کے خواب دیکھے ہیں، اسی کا ساتھ چاہا ہے۔ لیکن...... لیکن ارتضیٰ نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ کبھی اس کی محبت کو پذیرائی نہیں بخشی تھی۔ حالانکہ کئی بار ایسے مواقع آئے تھے جب ارتضیٰ کو اپنے لئے بے چین اور پریشان دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ شاید اب...... اب وہ لمحے آگئے ہیں جب اس کی ریاضتوں کا صلہ ملنے والا ہو۔

لیکن ارتضیٰ نے زبان سے کبھی کچھ نہ کہا تھا۔

اور آج ...... آج وہ شاہ نور بھابھی کی منتیں کر کے اور اماں سے اجازت لے کر ارتضیٰ سے آخری بار ملنے آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس وقت آفس میں ارتضیٰ تنہا ہوگا لیکن ارتضیٰ نہیں تھا...... صرف اُسریٰ اور زارا تھیں۔

اُسریٰ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ''تم کوئٹہ نہیں گئیں؟''

''آج جانا ہے ...... ابھی کچھ دیر بعد۔''

اور پھر اُسریٰ سے ہی اسے پتہ چلا تھا کہ ارتضیٰ پچھلے ایک ہفتے سے آفس نہیں آرہا، فلیٹ میں تالا لگا ہے۔ شاید وہ لوگ گاؤں چلے گئے ہیں۔

''لیکن ارتضیٰ پتہ نہیں کہاں ہے۔ ارسلان کو آج پھر بھیجا ہے اس کا پتہ کرنے۔''

اُسریٰ کی بات سن کر وہ پریشان ہوگئی تھی۔ وہ تو خود دو ہفتے سے جب سے اماں اس کی شادی کی شاپنگ کے لئے یہاں آئی تھیں اپنے دفتر نہیں آرہی تھی۔

اس نے فون کر کے ارتضیٰ کو بتایا تھا کہ وہ کوئٹہ جارہی ہے ہمیشہ کے لئے۔

اور جواب میں ارتضیٰ نے اسے Wish کیا تھا اور بس......

وہ دو ہفتوں سے اس کی منتظر تھی کہ شاید کسی سمے وہ اس سے ملنے آجائے یا پھر اس کا فون ہی آجائے اور وہ کہے۔

''ایمل! میں نے تم سے محبت کی ہے۔''

لیکن وہ نہیں آیا تھا اور آج اس کے جانے کا دن آگیا تھا تو وہ بے اختیار ہو کر چلی آئی تھی۔

عروج آپا تو بہت پریشان ہوں گی...... اور اماں، ارتضیٰ سب ہی پریشان ہوں گے۔

''مجھے عروج آپا کے پاس جانا چاہئے ...... لیکن نہیں، اُسریٰ بتا رہی ہے کہ اُن کے فلیٹ میں تالا لگا ہے۔

''ارسلان! تم خود گئے تھے ارتضیٰ کے گھر؟ وہ مقفل ہے؟''

''ہاں۔''

''تمہیں کس نے بتایا ہے شیبی کے اغواء کا؟''

''مجاز نے۔ میں ارتضیٰ کے گھر سے واپس آرہا تھا تو مجاز مجھے اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ کرتا ہوا مل گیا۔ اس نے مجھ سے شیبی کا پوچھا تھا کہ وہ ملا یا نہیں۔ پھر میری لاعلمی پر اس نے بتایا کہ چھ دن قبل ارتضیٰ آیا تھا اس کے پاس اور اس نے بتایا تھا کہ شیبی کو کسی نے اغواء کر لیا ہے۔ میں نے ابا جان سے بات کی تھی (مجاز کے سسر ڈی۔ آئی۔ جی پولیس تھے) انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوشش کریں گے۔ اس کے بعد پھر ارتضیٰ نے رابطہ ہی نہیں کیا۔ میں نے دو تین بار کوشش کی تھی لیکن نہ تو گھر میں ملا نہ دفتر میں ملا۔'' ارسلان نے تفصیل بتائی۔

''پتہ نہیں شیبی ملا ہے یا نہیں۔'' اُسریٰ نے پریشانی سے کہا۔

''دراصل آج کل وہ منشیات فروشوں کے خلاف لکھ رہا تھا...... اُس نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔'' ارسلان نے افسردگی سے کہا۔

''اب کیا ہوگا؟'' زارا نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' ارسلان خود پریشان تھا۔

بہت سارے لمحے یونہی خاموشی سے گزر گئے۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ پھر ایمل کھڑی ہوگئی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور وہ بھابھی سے تھوڑی دیر کے لئے اجازت لے کر آئی تھی۔

''اچھا ...... میں چلتی ہوں۔'' اس نے تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ ''ارسلان! ارتضیٰ سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ ...... کہ......'' اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں کے سمندر اُبل پڑے۔

''ایمل!'' ارسلان نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ ''میں جانتا ہوں۔''

"ارسلان!" اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔ "میں ارباب بھائی سے کہوں گی کہ وہ شیبی کے لئے کچھ کریں۔ اگر وہ کر سکے تو۔"

"تھینک یو...... میں شاید آج ارتضٰی سے ملنے کے لئے گاؤں جاؤں گا۔ ارتضٰی وہاں بھی نہ ملا تو آپا سے، اماں سے تفصیل معلوم ہوں گی۔"

"شاید اب زندگی میں کبھی ملاقات نہ ہو سکے۔ مہتاب خان اور مزاج کا بندہ ہے" وہ ضبط کی آخری حدوں سے گزر رہی تھی۔ "اور اُسریٰ اور زارا! تم آؤ گی نا کوئٹہ؟ میں تمہیں کارڈ بھیجوں گی۔"

"کوشش کریں گے۔" زارا نے روتے ہوئے کہا اور پھر ایک دم اس سے لپٹ گئی۔

"ہم سب تمہیں بہت مِس کریں گے ایمل! بہت۔"

"اور میں بھی۔"

ایمل نے اس سے الگ ہوتے ہوئے ایک نظر سب پر ڈالی اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

***

خان تیزی سے سامان سمیٹ رہا تھا اور ارتضٰی ایک طرف خاموشی سے بیٹھا اسے سامان سمیٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بیتے ہوئے بہت سارے دن اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ جب پہلے روز یہ دفتر کرائے پر لیا گیا تھا تو کس قدر گندگی تھی یہاں۔ فرش کا رنگ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دیواروں پر جالے لگے تھے۔ اور پھر ایمل اور اُسریٰ نے مل کر اس کی صفائی کی تھی۔ ایمل جس نے گھر میں شاید کبھی اٹھ کر پانی بھی نہ پیا ہو، وہ دونوں دُھول میں اٹی ہوئی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ کتنی زندگی اور کتنی رونق تھی اس روز یہاں۔

جذبوں سے مزین اُن کے دل۔

وہ کتنے پُرجوش ہو رہے تھے۔

پلان بن اور بگڑ رہے تھے۔

اخبار کا نام تجویز ہو رہا تھا۔

کبھی کوئی نام پسند کیا جاتا تھا، کبھی کوئی۔

اور پھر اس دفتر میں سب سے پہلے ایک میز اور کرسی رکھی گئی تھی، پھر دری بچھائی گئی، پھر ہولے ہولے اضافہ ہوتا رہا۔ ایک روز ایمل اور اُسریٰ یہ فرشی کشن لائی تھیں تو وہ

کتنا خفا ہوا تھا۔

اور پھر اسی دفتر میں چار سالہ جدوجہد...... اس نے میز پر سر رکھ لیا۔

کیا ملا تھا اُسے؟

اور کیا کر لیا تھا اُس نے؟

وجاہت کے زخمی ہونے سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ شیبی کے اغواء پر ختم ہوا تھا۔

اب کے انہوں نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ ڈالا تھا۔

وہ عروج آپا کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ شیبی کے لئے اپنی زندگی قربان کر سکتا تھا۔ اپنے خوابوں کو خود اپنی آنکھوں سے نوچ کر پھینک سکتا تھا۔

سو اس نے ایسا کیا تھا۔

اور شیبی واپس آ گیا تھا۔

ایک بار پھر اس نے عروج آپا کے سفید آنچل کو تھام کر قسم کھائی تھی کہ وہ اس طرح کی سرگرمیوں سے دور رہے گا۔ اس نے دفتر خالی کر دیا تھا۔ اخبار نہ نکالنے کا عہد کیا تھا۔

سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

چار سالوں کی لاحاصل ریاضت۔

وہ تیسرا ہاتھ تو اب بھی پاکستان کی بیخ کنی کر رہا تھا اور جانے کب تک کرتا رہے گا۔

خان نے کشن اٹھا کر سامان میں رکھے۔ کمرہ خالی خالی لگنے لگا تھا۔ ایک بار پھر اسے ایمل کا خیال آ گیا۔

وہ نیلی خوبصورت آنکھوں والی مخلص لڑکی جس کی آنکھیں اکثر گیلی رہتی تھیں اور لگتا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔

کسی اجنبی کی رفاقت کے خواب۔

اور یہ خواب ہمیشہ ارتضٰی کو اس کی سمندر آنکھوں میں ہنڈولوں کی طرح تیرتے دکھائی دیتے تھے۔

اور ارسلان کہتا تھا کہ "وہ اجنبی تم ہو ارتضٰی عباس!"

اور کل...... ہاں کل شام بھی تو ارسلان نے ایسی ہی بات کی تھی...... جاتے سے اس نے کہا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی تھی۔

کاش...... اے کاش کبھی وہ بھی اسے بتا سکتا...... کہہ سکتا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے، کرتا رہے گا...... لیکن ان کے راستے کبھی ایک نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ جانتا تھا، اس

لئے...... صرف اس لئے اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو ایمل کو اس کے راستے سے ہٹا دے۔

اور اب...... اب وہ......

بے اختیار اس نے فون اٹھا کر نمبر ملایا۔

دوسری طرف بیل ہوتی رہی۔

ایک بار...... صرف ایک بار وہ اس سے کہہ تو دے...... بتا تو دے کہ وہ اس کی محبت کی قدر کرتا تھا، اس کے جذبوں کو سراہتا تھا۔ اور یہ کہ وہ خود...... وہ خود بھی۔

بے قرار ہو کر اس نے بارہا نمبر ملایا...... لیکن دوسری طرف کسی نے ریسیو نہیں کیا۔

جانے والے جا چکے تھے۔

کوئی ان کی بات کو سراہتا، کوئی وحشتوں سے نبھاتا۔

کہ وہ آہوئے رمیدہ خو۔ یہ ساختن سے چلے گئے۔ وہ رمیدہ خو تو نہ تھی، ہاں......

اس نے میز پر پڑے کسی پرانے اخبار میں سے پڑھا اور ایک بار پھر نمبر ملانے لگا۔

"صاحب! چائے بناؤں؟" خان نے سامان سمیٹ کر پوچھا۔

"ابھی ارسلان آئے گا تو بنا لینا۔"

ارسلان اور زارا اُسریٰ کو سی آف کرنے گئے تھے۔ وہ آج دبئی جا رہی تھی۔ وجاہت نے اسے بلا لیا تھا۔

"صاحب آ گئے ہیں اور ٹیکسی والے سے جھگڑ رہے ہیں۔"

"اچھا......" اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ارسلان اور زارا اندر آ رہے تھے۔

"سی آف کر آئے؟"

"ہاں......" ارسلان دری پر ہی بیٹھ گیا۔

"تو یہ افسانہ بھی ختم ہوا" اس نے فائلوں کے بندھے ہوئے ڈھیر کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں...... کسی انجام کے بغیر۔" ارتضیٰ نے افسردگی سے کہا۔

"اب تم کیا کرو گے؟"

"لیکچرر شپ کے لئے اپلائی کر دیا ہے۔ ساری جدوجہد رائیگاں گئی۔"

"اپنی طرف سے کوشش تو کی ہے نا۔" ارسلان نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ ارتضیٰ کی کیفیات کو محسوس کر رہا تھا۔

خان نے چائے کے کپ نیچے دری پر لا کر رکھے تو ارتضیٰ بھی اٹھ کر نیچے دری پر آ کر

بیٹھ گیا۔

"زارا کے ہونے والے صاحب بھی تشریف لانے والے ہیں۔" ارسلان نے کشیدگی ختم کرنے کے لئے بتایا لیکن زارا نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے نگاہیں جھکائے چائے کی چسکیاں لیتی رہی۔

"میں نے سوچا ہے ارتضیٰ! کہ کراچی چلا جاؤں۔ جن دنوں میں ان بنگلہ دیشی لڑکیوں کے سلسلے میں وجاہت کے ساتھ کراچی گیا تھا نا تو وہاں میری ملاقات ایک وکیل صاحب سے ہوئی تھی، وہی وکیل جنہوں نے انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ وہ لوگ بہت کام کر رہے ہیں۔ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں ان کے تحت رہ کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ ابا جان نے بھی تائید کی ہے میری...... کچھ نہ کچھ جذبے کو تسکین تو ملے گی۔"

"صحیح سوچا ہے تم نے۔" ارتضیٰ نے آہستگی سے کہا۔

"اور تم...... تم بھی بہت کچھ کر سکتے ہو ارتضیٰ! تمہیں یاد ہے نا ایک بار تم نے کہا تھا کہ انسان کسی بھی شعبے میں رہ کر ملک و قوم کے لئے اگر کچھ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔"

"ہوں۔"

"سب...... سب ہولے ہولے چلے گئے۔ ہمارا سرکل ٹوٹ گیا۔" زارا نے خالی کپ نیچے رکھتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔

"آٹھ چوہے گھر سے نکلے
کرنے چلے شکار"

ارسلان نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ہم...... ہم کوئی چوہا ہیں؟" زارا نے روتی آواز میں کہا۔

"تم چوہا ہو بھی نہیں سکتیں۔ چوہا تو مذکر ہوتا ہے نا۔" ارسلان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

زارا نے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھے تو بے اختیار رونے لگی...... اونچی آواز میں۔

زور زور سے......!

☆☆☆

آؤ گرم کمرے میں
گرم چائے کے کپ پر
بوسنیا اور کشمیر کے برف زاروں میں لگی
آگ کی باتیں کریں

وہ اخبار گھٹنوں پر پھیلائے بہت دیر سے ساکت بیٹھی تھی۔

"آؤ گرم کمرے میں
گرم چائے کے کپ پر"

اس نے زیرِ لب کہا اور اخبار کو موڑ کر گھٹنوں کے نیچے دبا لیا۔

"کیا ہو رہا ہے کزن!" بخت خان نہ جانے کب اپنے کمرے سے نکلا تھا اور کب اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"کچھ نہیں ......" وہ کھڑی ہو گئی۔ "یونہی باہر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ سب سو رہے تھے نا۔ وہاں ہمارے ہاں سب جلدی اٹھ جاتے ہیں۔ اس لئے جلدی اٹھنے کی عادت ہے۔ لیکن یہاں کراچی میں سب دیر سے اٹھتے ہیں، جیسے رات کو سوتے ہی نہ ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا بی بی! کہ تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہاں، جہاں زندگی کے ایک لمحے کا بھی بھروسا نہیں۔"

"زندگی کا تو کہیں بھی ایک لمحے کا بھروسا نہیں ہے۔" وہ مسکرائی تو بخت خان چڑ گیا۔

"لیکن میں تمہاری جگہ ہوتا نا تو ہرگز یہاں نہ آتا۔ کہیں اور چلا جاتا۔ لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد ...... کہیں بھی۔"

"ہاں ...... تم کہیں بھی جا سکتے تھے بخت خان! لیکن میں ...... میں کہاں جاتی اگر بو جی

بھی مجھے نہ بلائیں تو۔" اس نے سوچا۔

کیسے بیٹھے بٹھائے زندگی کا پیٹرن بدل جاتا ہے۔ ابھی چند دن پہلے وہ کہاں تھی اور اب......

اسے خاموش دیکھ کر بخت خان نے جھک کر اخبار اٹھایا۔

"اچھا ...... تو اخبار پڑھا جا رہا تھا۔ کیا ہے اس اخبار میں ...... میں پوچھتا ہوں کون منگواتا ہے اخبار؟" ایک دم ہی اس کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے مسکراتا ہوا بخت خان غصے سے دھاڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں انگارہ۔

"یہ اخبار ہے یا لہو کا پیالہ جسے صبح صبح اخبار فروش یہاں پھینک جاتا ہے ...... اور لڑکی! تم یہ پڑھ رہی تھیں، یہ...... 'نامعلوم افراد کی گولیوں سے ناظم آباد میں دو نوجوان ہلاک ہو گئے ...... لانڈھی میں صبح ایک اٹھارہ سالہ لڑکے کی لاش ملی ہے جسے تشدد کر کے مار دیا گیا تھا۔' اُس نے با آوازِ بلند پڑھا۔ یہ پڑھ رہی تھیں تم......" اس نے پھر دہرایا۔

"تمہارے ہاتھوں پر اور تمہارے کپڑوں پر لہو لگ گیا ہے۔ جاؤ جا کر ہاتھ دھو لو۔ کلی کر لو۔ منہ میں بھی خون بھر گیا ہو گا۔"

گھبرا کر اس نے اپنے ہاتھوں اور کپڑوں کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا ہے بخت خان! کیوں چیخ رہے ہو؟" بو جی آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکلیں۔

لیکن وہ ان کی طرف دیکھے بغیر اخبار کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پاؤں زور زور سے زمین پر مارتا واپس اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

"کیا ہوا تھا بیٹا ...... بخت خان کیوں شور مچا رہا تھا؟" بو جی نے کھڑی نویدِ صبح کی طرف دیکھا۔

"بس اخبار دیکھ کر انہیں غصہ آ گیا تھا۔"

"ہاں، اخبار میں آج کل ہوتا ہی کیا ہے سوائے قتل و غارت کے۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "اس نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا؟"

"ہاں ...... نہیں ...... نہیں تو......" اس نے آنکھوں میں بے اختیار اُمڈ آنے والے سیلاب کو ہنگامی بنیادوں پر روکا۔

"وہ دراصل بہت غصیلا ہو گیا ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ لیکن جب سے عمران مرا ہے نا تب سے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ بہت پیارا دوست تھا اس کا۔ اسی سے مل کر جا رہا

تھا کہ راستے میں دہشت گردوں نے گولی مار دی۔ بہت پیارا بچہ تھا، بہت ہی اچھا اور نیک۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔

''جی......'' اس نے آہستگی سے کہا۔

جب وہ فیصل آباد میں تھی تو وہاں بھی کراچی کے حالات کے متعلق اخباروں میں پڑھ پڑھ کر اس کا دل دُکھتا تھا اور پھر جب اماں کی وفات کے بعد ماموں آفتاب اُ[سے] قصور لے گئے تھے تب بھی وہ اور طیب بھائی گھنٹوں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے کراچی کے متعلق بات کیا کرتے تھے۔

''دراصل یہ ایک منظم سازش ہے۔'' وہ اسے بتایا کرتے تھے۔ ''ایک گھناؤنی سازش۔'' اُن کی آنکھیں خون رنگ ہو جاتیں۔ ''ہمارے ملک کو توڑنے کی سازش۔ ظالموں نے ایک بار پہلے بھی ہمیں دولخت کر دیا تھا اور اب پھر۔''

''اب...... اب کیا ہوگا طیب بھائی؟'' وہ ڈر جاتی۔ خوف زدہ ہو جاتی۔

بہت ساری باتوں کا اُسے پہلے علم نہیں تھا۔ بہت سارے درونِ خانہ راز اُسے طیب بھائی نے بتائے تھے۔ اسے تو بس اتنا پتہ تھا کہ کراچی میں دہشت گرد آباد ہیں جو راہ چلتے لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ وہ اکثر سوچا کرتی۔

'بھارتی دہشت گرد کتنے ہوں گے؟ زیادہ سے زیادہ سو، دوسو۔ اب پتہ چل گیا ہے تو قانون نافذ کرنے والے ادارے یقیناً انہیں پکڑ لیں گے۔ نشان دہی ہو جائے تو پھر مجرم پکڑنا مشکل نہیں ہوتا۔'

''اماں، دیکھ لیجئے گا، اب کراچی میں امن ہو جائے گا۔'' وہ دن میں ایک دو بار ضرور اماں کو بتاتی۔

دراصل اُسے یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ وہ پہلے بھی اماں کو بتا چکی ہے۔ گھر میں اخبار تو آتا ہی نہیں تھا اور پھر آتا بھی کہاں سے۔ یہاں تو کھانے کے لالے پڑے تھے۔

کیسے بھاگ دوڑ کر کے اس نے ملازمت حاصل کی تھی۔ وہ بھی ایک پرائیویٹ سکول میں...... ایف۔ایس۔سی پاس لڑکی کو بھلا اور ملازمت مل بھی کیا سکتی تھی۔ آٹھ سو روپے ماہوار کتنے غنیمت لگے تھے اسے...... اور اس روز جب مسز ربانی نے اسے کہا تھا کہ ٹھیک ہے وہ کل سے پڑھانے آ جائے تو اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے تھے۔ لیکن وہاں مسز ربانی کے آفس میں ان آنسوؤں کو بہانا کس قدر غلط ہوتا۔ سو اُس نے بھی انتہائی سختی سے انہیں پیچھے دھکیل دیا تھا اور گھر آ کر اماں کے گلے لگ کر پیچھے

دھکیل دیئے جانے والے آنسوؤں کو اس نے خوب جی بھر کر بہایا تھا...... اور اماں...... اماں کے اندر تو جیسے سمندر اُبل پڑے تھے۔

اور اماں کے آنسو دیکھ کر اس کے آنسو خود بخود خشک ہو گئے تھے۔

''اماں پلیز، مت روئیں۔''

''کیا کچھ نہیں سوچا تھا میں نے...... تمہیں پڑھاؤں گی۔ تمہارے ابا کی کتنی خواہش تھی کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کرو۔''

''تو اعلیٰ تعلیم تو مجھے حاصل کرنی ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا تھا۔

جب سے اماں بیمار ہوئی تھیں اور مایوسی کی باتیں کرنے لگی تھیں اس نے آنسو چھپا کر ہنسنا سیکھ لیا تھا۔ اندر سے بزدل اور باہر سے بہادر بن گئی تھی۔

''پتہ ہے اماں! وہ مسز ربانی ہیں نا، ہمارے سکول کی پرنسپل، انہوں نے میٹرک کے بعد ساری تعلیم پرائیویٹ حاصل کی ہے۔ ڈبل ایم۔اے ہیں وہ اور پتہ ہے میں اپنا وقت تھوڑا ہی ضائع کروں گی۔ بس پہلی تنخواہ ملتے ہی کتابیں لے آؤں گی اور......''

ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، سترہ اٹھارہ سال اور وہ کتنی سمجھ دار ہو گئی تھی۔ ایف۔ایس۔سی کرتے ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے آگے نہیں پڑھنا۔ اماں بیمار تھیں اور دکانوں کے کرائے سے بہ مشکل اس کی پڑھائی کا خرچ اور پیٹ کی آگ بجھتی تھی اور اماں اپنا علاج نہیں کراتی تھیں۔

لیکن کب تک؟ جب وہ بستر سے لگ گئیں تو انہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑ گیا تھا لیکن دوائیں اتنی مہنگی تھیں کہ اکثر خرید نہ پاتیں اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کم از کم چھ ماہ مسلسل علاج کرانا ہوگا...... اور پچھلے چھ ماہ کی دوڑ بھاگ کے بعد اب اسے نوکری ملی تھی۔ اور یہ آٹھ سو روپے صرف اماں کی دوا پر خرچ ہوں گے۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ پرائیویٹ سکول تھا۔ زیادہ ذمے داریاں نہیں تھیں۔ جلد چھٹی ہو جاتی تھی۔ وقفے میں وہ اخبار پڑھتی تھی اور پھر گھر آ کر اماں کو بتاتی تھی۔

''اماں! آج اخبار میں یہ لکھا تھا...... اور آج یہ......''

یا پھر کولیگز کی باتیں...... اور اُن کے پاس موضوع ہی کیا تھا۔

اماں مسلسل علاج سے کچھ سنبھل گئی تھیں۔ اس نے بھی مطمئن ہو کر کتابیں سنبھال لی تھیں۔ شروع شروع میں تو اسے خاصا مشکل لگا تھا، اسلامیات اور ہسٹری پڑھنا لیکن دُرِ شہوار نے اسے بتایا تھا کہ وہ پرائیویٹ سائنس نہیں پڑھ سکتی۔ دُرِ شہوار اس کی بچپن کی

دوست تھی۔ دونوں پہلی جماعت سے ایک ساتھ ہی سکول میں پڑھ رہی تھیں۔ ذرِ شہوار نے اس کی خاصی مدد کی تھی۔ نوٹس اور کتابیں وہ اسے کالج سے لا دیتی تھی۔

بی۔اے کا امتحان دے کر وہ فارغ ہوئی تو اماں بہت خوش تھیں۔

"یہ اچھا کیا تم نے نوید! اب ایم۔اے بھی ضرور کرنا۔"

"جی اماں!" اُس نے اُن سے وعدہ کیا۔

اُن کی خوشی کے لئے تو وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ دو سالوں میں اس کی تنخواہ بھی پندرہ سو ہو گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ مہنگائی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ دکانوں کا کرایہ بھی اسی حساب سے زیادہ ملنے لگا تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔ ابھی وہ تین سال کی تھی جب ابا کا انتقال ہوا تھا۔ زیادہ خوش حالی تو اس نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ سو اسے کبھی کوئی بے چینی نہیں ہوتی تھی۔ اپنے حال میں مگن اور مطمئن رہتی تھی۔ سکول کی جاب نے اسے کافی اعتماد دیا تھا۔ اپنے بارے میں وہ کم ہی سوچتی تھی لیکن دوسروں کے لئے پریشان ہوتی تھی۔

"بے چاری مسز جہان کے سات بچے ہیں۔ خاوند بیمار ہے۔ اتنی مشکل سے گزارا ہوتا ہے اور تنخواہ صرف ایک ہزار ہے۔ میٹرک پاس ہیں...... اور وہ سائرہ، بچی اماں......" سکول سے آ کر وہ اماں کے پاس ہی بیٹھ جاتی تھی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کئے جاتی تھی۔ "اُس کے سسرال والے بہت ظالم ہیں۔ اور پتہ ہے اماں انہوں نے سائرہ سے شادی ہی اس لئے کی ہے کہ وہ جاب کرتی ہے۔ پوری کی پوری تنخواہ اس کا خاوند لے لیتا ہے۔ وہ تو بی۔اے، بی۔ایڈ ہے۔ سکول میں سب سے زیادہ تنخواہ ہے اس کی، تین ہزار روپے...... لیکن اتنی شدید گرمی میں بھی وہ چار سال پہلے کے جہیز والے ریشمی سوٹ پہن کے آتی ہے۔ لون یا وائل کے سوٹ نہیں سلوانے دیتا اس کا خاوند۔ اور اس کی ساس کہتی ہے، اتنے صندوق بھرے ہیں جہیز اور بری کے کپڑوں سے۔ پہلے انہیں ختم کرو۔"

وہ دنیا جہان کی باتیں کرتی تھی۔ لیکن اپنی کم مائیگی یا غربت کا اسے کبھی خیال نہیں آیا تھا اور اماں اسی بات پر خوش ہوتی تھیں کہ وہ اپنے حالات پر قانع ہے۔ اس کے دل میں دوسروں کو دیکھ کر ویسا ہی بننے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی...... اور بچپن سے ہی وہ ایسی تھی۔ نہ ضد نہ جھگڑا۔

جو ملا پہن لیا۔

جو دیا کھا لیا۔

بلکہ کئی دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ رات کو سبز چائے کا قہوہ بنا کر اماں نے اس کے سامنے رکھ دیا اور دونوں ماں بیٹی نے اللہ کا شکر ادا کر کے اس قہوے کے ساتھ روٹی کھا لی۔

بی۔اے کے امتحان کے بعد وہ فارغ ہوئی تو اس نے سکول کی لائبریری سے کتابیں نکلوا کر پڑھنا شروع کیں۔

یوں اسے مطالعے کا شوق ہوا۔

اپنی تاریخ کا پتہ چلا۔

رشید اختر ندوی کے ناول پڑھ پڑھ کر وہ رو دیا کرتی تھی۔

نسیم حجازی کی "خاک و خون" تو اس نے نہ جانے کتنی بار پڑھی اور اماں کو بھی پڑھ کر سنائی تھی۔

اور یہ ملک یوں تو نہیں بنا تھا...... اتنی آسانی سے...... کتنی مشکلوں سے اسے حاصل کیا گیا تھا اور اب یہ سب لوگ، یہ اپنے ہی وطن کے لوگ کیسے اور کس بری طرح اسے لوٹ رہے تھے۔ اس کے دل میں وطن کی محبت کا جذبہ انہی دنوں پیدا ہوا تھا۔

کتابوں سے ذہن میں وسعت پیدا ہوئی تھی۔ اور حب الوطنی کے اس جذبے کو طیب بھائی نے ہوا دی تھی۔ وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں فیصل آباد آئے تھے اور ان کا قیام ان کے گھر تھا۔ طیب بھائی، آفتاب ماموں کے بڑے بیٹے تھے۔ طیب بھائی کو اس نے بہت بچپن میں دیکھا تھا۔ ایک بار جب وہ اماں کے ساتھ قصور گئی تھی۔ اور اتنے سارے سالوں میں اماں ایک بار بھی دوبارہ قصور نہیں گئی تھیں۔ ہاں کبھی کبھی آفتاب ماموں سال دو سال بعد ملنے آ جاتے تھے۔ ایک دو روز ٹھہر کر چلے جاتے تھے۔ مامی یا بچے کبھی نہیں آئے تھے۔

"پتہ ہے پھپھو! پچھلے دنوں میں کراچی گیا تھا۔ قیامت برپا ہے وہاں...... گلیاں سنسان، بازار سُونے، گلی کوچوں سے لہو کی بو...... گھروں سے باہر جانے والے صبح جب گھر سے نکلتے ہیں تو پتہ نہیں ہوتا کہ لوٹ کر آئیں گے بھی یا نہیں۔" وہ سکول سے آئی تو طیب بھائی اماں کو بتا رہے تھے۔

"یہ...... یہ سب کراچی میں ہو رہا ہے؟" اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ہاں...... کراچی میں ہی خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ کیا تمہیں پتہ نہیں ہے؟"

انہیں اس کی لاعلمی پر حیرت ہوئی تھی اور انہوں نے کافی تفصیل سے اسے کراچی کے

متعلق بتایا تھا۔ اور تب ہی اُس نے اخبار دیکھنا شروع کیا تھا۔ وہ کراچی کے متعلق ڈھونڈ ڈھونڈ کر خبریں پڑھتی۔

شاید آج کوئی اچھی خبر ہو...... شاید آج لکھا ہو کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے......

لیکن ہر روز ایک سی خبریں۔

وہ روز اماں کو آ کر بتاتی، آج اتنے لوگ مارے گئے...... آج پولیس مقابلے میں کانسٹیبل، دو دہشت گرد اور چھ نامعلوم افراد ہلاک ہو گئے۔

''اوہ...... کب ختم ہو گی یہ قتل و غارت؟'' اماں دہل جاتیں۔ ''حالات ٹھیک ہوں تو کراچی چلیں گے۔'' اماں کو اچانک ہی کراچی جانے کا ہوکا اٹھا تھا۔ ''بوجی تمہارے ابا کی وفات پر آئی تھیں۔ اب تو انہیں دیکھے مدتیں ہو گئی ہیں۔''

بوجی ان کی چچا زاد بہن تھیں لیکن اماں کو ان سے بہت محبت تھی۔ ایک ہی گھر میں پلے بڑھے، کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ کون کس کی اولاد ہے۔

''سب بہن بھائیوں کی طرح تھے۔ بوجی کے لاڈ اگر اماں اٹھاتی تھیں تو میں چچی کی گود میں گھسی رہتی تھی۔''

ان دنوں ان کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔ انتہائی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

''ایک بار بوجی سے ملاقات ہو جاتی تو...... بیٹی! حالات کب ٹھیک ہوں گے؟''

''حالات کا تو پتہ نہیں اماں! لیکن چھٹیاں ہوں گی تو کراچی چلیں گے۔''

''میں چاہتی ہوں تیرا ہاتھ بوجی کے ہاتھ میں دے دوں۔''

سب کی طرح اماں بھی انہیں بوجی کہتی تھیں۔ حالانکہ رشتے میں وہ ان کی آپا لگتی تھیں۔ ''مجھے ان پر بڑا یقین ہے۔ بہت محبت سے رکھیں گی تجھے۔ اپنی اولاد کی طرح چاہیں گی تجھے۔ دیکھ بٹو! مجھے اگر خدانخواستہ کچھ ہو جائے تو ان کے پاس چلی جانا۔ ان سے زیادہ تیرا کوئی خیر خواہ نہیں ہوگا۔''

''اماں پلیز! ایسی باتیں تو نہ کریں۔'' وہ روہانسی ہو جاتی۔

لیکن وہ بولے چلی جاتیں۔

''یوں تو تیرے قانونی اور شرعی وارث تیرے ماموں ہیں۔ پر مجھے بھاوج کی طبیعت سے ڈر لگتا ہے۔ عجیب مزاج ہے ان کا۔ کبھی آفتاب بھائی کو اپنی مرضی نہیں کرنے دی کبھی یہ نہیں کہا، بہن بیوہ ہو گئی تو چند دن میرے پاس رہ جاؤ۔ نہ کبھی فیصل آباد آئیں۔ ہمیشہ دور دور ہی رہیں۔ اچھا ایسا کر، بوجی کو ایک خط لکھ دے کہ ایک بار مل جائیں۔

ہمارا تو جانے کب جانا ہو۔''

''جی اماں! لکھ دوں گی۔''

مگر ابھی اس نے خط لکھا بھی نہیں تھا کہ اماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر آفتاب ماموں کو فون کر دیا۔ وہ فوراً چلے آئے۔ اور جس روز اس کا رزلٹ آیا، اسی شام اماں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ کتنی دیر تک اُسے سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ تکیے کے سہارے نیم دراز وہ اچھی خاصی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے کچھ دیر پہلے ہی تو اپنا رزلٹ کارڈ وصول کیا تھا۔ اس کی فرسٹ ڈویژن تھی۔ وہ خوشی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ حالانکہ وہ تین دن سے یونہی لیٹی ہوئی تھیں۔ سُوپ وغیرہ پلانے کے لئے وہ سہارا دے کر بٹھاتی۔ لیکن کمزوری اتنی تھی کہ دو منٹ بعد ہی تھک جاتی تھیں۔ لیکن اب وہ خود ہی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس نے جلدی سے پیچھے تکیہ رکھ دیا تھا۔

''بھئی یہ کیا ہے...... اتنی بڑی خبر ایسے سوکھے سوکھے سنا دی...... کچھ میٹھا ویٹھا نہیں؟'' آفتاب ماموں بھی خوش تھے۔

''بیٹا! نیچے دکان سے کسی کو بلوا کر مٹھائی منگوا لے۔''

''جی اماں!'' وہ اٹھنے لگی تو ماموں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔

''تم بیٹھو، میں ابھی جا کر خود مٹھائی لاتا ہوں۔''

''بھائی!'' انہوں نے آفتاب ماموں کی طرف دیکھا جو اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ ''بھائی!'' ان کی آواز بھرا گئی۔ ''میری بٹو کا خیال رکھنا...... تمہارے سوا اس کا اور کوئی نہیں۔''

''میری بیٹی ہے یہ...... تم فکر نہ کرو...... خدا تمہیں صحت دے، زندگی دے تو میں اسے دھوم دھام سے لے کر جاؤں گا۔''

''بھیا!'' ان کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا اور انہوں نے نوید کی طرف دیکھا۔

''مجھے لٹا دو۔''

اس نے انہیں لٹا دیا۔

''بیٹا! مجھے کچھ ہو جائے تو ماموں کے ساتھ چلی جانا۔ یہاں اکیلے مت رہنا۔''

''اماں! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟''

''پانی......'' انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیری تو وہ تیزی سے اٹھ کر باہر گئی اور جب وہ پانی لے کر آئی تو ماموں ان کی آنکھیں بند کر رہے تھے اور ان کے لبوں پر کلمۂ

شہادت تھا۔

''ماموں......'' گلاس اس کے ہاتھوں سے نیچے گر پڑا۔ آفتاب ماموں نے یک دم اُسے گلے لگالیا۔

''میری بلو...... میری بچی!''

اور چالیسویں کے بعد وہ ماموں کے ساتھ قصور آ گئی۔ حالانکہ وہ کسی پر بوجھ نہیں چاہتی تھی۔ ظاہر ہے قصور جانے پر اس کی جاب بھی چھوٹ جاتی اور وہاں قصور میں پتہ نہیں جاب ملتی بھی یا نہیں۔ مامی کے مزاج کا اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیسا ہے۔ اماں نے ہی بتا رکھا تھا کہ وہ مزاج کی تیز ہیں۔ لیکن وہ اماں کا کہا کیسے ٹال دیتی۔ مرتے وقت انہوں نے اس کا ہاتھ ماموں کے ہاتھ میں دیا تھا اور اسے ماموں کے ساتھ جانے کو کہا تھا حالانکہ وہ پہلے خود ہی اسے بوجی کے پاس چلے جانے کو کہا کرتی تھیں۔ ماموں نے اس کا چھوٹا سا مکان کرائے پر دے دیا تھا۔

وہ تو چاہتے تھے کہ مکان اور دکانیں فروخت کر دی جائیں لیکن وہ رضامند نہیں ہوئی۔ اماں بتاتی تھیں، کیسے انہوں نے اپنی محدود آمدنی سے بچت کر کر کے جگہ خریدی تھی اور ابا نے بڑے شوق سے دو بیڈ روم کا یہ گھر بنایا تھا۔ نیچے دو دکانیں تھیں اور رہائشی حصہ تھا۔ ابا نے اپنی زندگی میں دکانیں کرائے پر دے رکھی تھیں۔

''کون ہر ماہ کرایہ لینے آتا رہے گا؟''

''ابو جی! بلو نہیں چاہتی تو نہ فروخت کریں۔ میں کمپنی کے کام سے آتا تو رہتا ہوں۔ کرایہ وصول کرتا رہوں گا۔'' طیب بھائی نے بھی اس کی سفارش کی تھی۔ یوں مکان کرائے پر چڑھا کر وہ ماموں اور طیب بھائی کے ساتھ قصور آ گئی تھی۔ اماں کی وفات کی خبر ملنے پر قصور سے صرف طیب بھائی آئے تھے۔

''تمہاری ماں نہیں آئی؟'' آفتاب ماموں کو حیرت ہوئی تھی۔

''اُن کا بلڈ پریشر ہائی ہے۔'' طیب بھائی نے نظریں جھکا لی تھیں۔

ماموں پورے چالیس دن اس کے ساتھ رہے تھے۔ طیب بھائی البتہ سوئم کے بعد چلے گئے تھے اور پھر دوبارہ آئے تھے۔ ماموں تو چاہتے تھے کہ سوئم کے بعد ہی وہ ان کے ساتھ قصور چلے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''نہیں...... اماں کی روح آئے گی یہاں۔''

اس نے سن رکھا تھا کہ چالیس دن تک روح گھر میں بھٹکتی رہتی ہے۔ ''آپ چلے

جائیں...... پھر چالیسویں کے بعد آ کر لے جایئے گا۔ محلے والے بہت اچھے ہیں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔''

لیکن ماموں آفتاب کا جی نہ چاہا کہ وہ اسے اکیلا چھوڑیں سو وہ اس کے ساتھ ہی چالیس دن بعد آئے تھے۔

''لو، میں نے سمجھا بہن کے ساتھ تم بھی سدھار گئے ہو۔'' گھر میں داخل ہوتے ہی مامی نے سواگت کیا تو وہ سہم کر ماموں کے پیچھے ہو گئی۔

''یہ نوید ہے...... نویدِ صبح...... خالدہ کی بچی۔'' ماموں نے اُن کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس کا تعارف کروایا تھا۔

مامی نے اُچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔

''اچھا...... تو یہ ہے نویدِ صبح...... ساری کی ساری خالدہ پر ہے۔''

''ہاں......'' آفتاب ماموں نے خوش ہو کر کہا۔

''خالدہ سے بہت شکل ملتی ہے۔ بس خالدہ کا رنگ گلابی مائل گورا تھا، اس کا ذرا گندمی ہے، بھائی صاحب جیسا۔ نین نقش تو بالکل خالدہ کے ہیں۔''

''السلام علیکم! اس نے سلام کیا۔''

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے رسمی طور پر اُس کے سر پر نہ ہاتھ پھیرا، نہ گلے لگایا۔

''بیٹے!'' ماموں نے مڑ کر طیب بھائی سے کہا جو سامان ٹیکسی سے اتروا چکے تھے۔

''بلو کو اس کا کمرہ دکھا دو۔ تم نے اس کے لئے کمرہ ٹھیک کروا دیا تھا نا؟''

''جی ابو جی!''

اور وہ اپنا بیگ اٹھائے طیب بھائی کے پیچھے چل پڑی اور ماموں، مامی کی طرف چلے گئے۔

آفتاب ماموں کا گھر بہت بڑا تھا۔ بڑا سا صحن، اونچا سا برآمدہ، صحن میں بڑے بڑے درخت، پھولوں کی کیاریاں۔ اونچی چھتوں والے بڑے بڑے کمرے اور چھتوں پر شیشے کا کام تھا۔ کمروں میں خوش گوار سی ٹھنڈک رہتی تھی۔

اس کا کمرہ باقی کمروں کی نسبت چھوٹا تھا۔ ایک میز، دو کرسیاں، ایک بیڈ۔ اسے اپنا کمرہ پسند آیا تھا۔

ماموں کے صرف تین بیٹے تھے۔ بیٹی کوئی نہیں تھی۔

سب سے بڑے طیب آفتاب تھے۔

ان سے پورے آٹھ سال چھوٹا بلال۔

اور بلال سے دو سال چھوٹا اویس۔

بلال کراچی میں جاب کر رہا تھا۔ دو سال قبل اس نے ایم۔بی۔اے کیا تھا اور ایک بہت اچھی فرم میں بہت اچھی تنخواہ پر جاب کر رہا تھا۔

اویس میڈیکل کالج کے فائنل ائر میں تھا اور لاہور میں ہی رہتا تھا اور صرف ویک اینڈ پر ہی گھر آتا تھا۔

طیب بھائی لاہور میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتے تھے اور ہر روز آ جاتے تھے۔ ان کے مزاج میں بڑی نرمی اور شفقت تھی۔ نوید کو وہ بالکل بڑے بھائیوں کی طرح لگتے تھے۔

'اگر میرا کوئی بڑا بھائی ہوتا تو یقیناً ایسا ہی ہوتا۔ اتنا ہی شفیق اور مہربان۔'

وہ اکثر سوچتی۔

یوں تو اتنے بڑے گھر میں وہ صرف تین فرد تھے۔ مامی اس سے بلاضرورت بات نہیں کرتی تھیں لیکن ان کے رویے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ انہیں اس کی آمد پسند نہیں آئی۔

کاش، اماں نے اس کو آخری لمحے یہاں آنے کے لئے نہ کہا ہوتا ...... کئی بار اس نے سوچا تھا لیکن اس کے سوچنے سے کیا ہوتا۔ اماں تو اس کا ہاتھ ماموں کے ہاتھ میں دے چکی تھیں۔ اور یہی نہیں، ماموں نے اسے بلال کے لئے اماں سے مانگ بھی لیا تھا بلکہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بلال کی دلہن بنائیں گے۔ اماں کی وفات کے چند دن بعد ماموں نے اسے بتایا تھا۔

''بلال بہت پیارا لڑکا ہے۔'' انہوں نے اسے یقین دلایا تھا۔

وہ کیا کہتی، اس کے بعد کہنے کے لئے تھا ہی کیا۔

اماں نے جو بہتر سمجھا کیا اور اسے تو صرف اماں کی خوشی منظور تھی ...... اور مامی... پتہ نہیں مامی نے کبھی اپنے رویے سے یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ ان کی ہونے والی بہو ہے بلکہ اکثر تو ان کا رویہ خاصا کھردرا لگتا تھا۔

وہ پرائیویٹ ایم۔اے کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ماموں سے یا طیب بھائی سے کتابیں لانے کے لئے کہے۔ حالانکہ طیب بھائی اس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ اکثر شام کو زبردستی اسے کمرے سے باہر نکال لاتے۔

''یہ کیا بھئی ...... اس وقت بھی اندر گھسی ہو؟ اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔'' اور پھر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔

''آ جاؤ بنّو!'' وہ اسے آفتاب ماموں کی طرح بنّو ہی کہتے تھے۔

اور وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے طیب بھائی اس سے ملکی حالات پر باتیں کیا کرتے تھے۔ بڑا گداز ہوتا تھا ان کے لہجے میں۔

''پتہ ہے بنّو! یونیورسٹی کے زمانے میں، میں بڑا آئیڈلسٹک ہوا کرتا تھا۔ سوچتا تھا ایسا کروں گا، ویسا کروں گا۔ یونیورسٹی کے برآمدوں میں، کمروں میں اِدھر اُدھر جہاں کچھ طلباء اکٹھے ہو جاتے، کھڑے ہو کر گھنٹوں تقاریر کیا کرتا تھا۔

اس ملک کو سنوارنے کے اور اسے خوشحال بنانے کے خواب دیکھا کرتا تھا ...... اور اسی جذبے کے تحت میں نے ایک پارٹی جوائن کر لی۔ ایک بار جیل کی ہوا بھی کھائی لیکن پتہ ہے، بنّو! بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ یہ جو ہمارے ملک میں سیاسی پارٹیاں ہیں، یہ سب کی سب نوجوانوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ انہیں وطن سے محبت نہیں ہے ...... انہیں صرف اس وطن سے حاصل ہونے والے مفادات عزیز ہیں۔ وقت پڑنے پر یہ وطن کا سودا کرنے سے بھی گریز نہ کریں۔ سو میں نے پارٹی چھوڑ دی۔ پر میرے اندر ایک لاوا پک رہا ہے۔

ایک آتش فشاں دہک رہا ہے۔

یہ جو کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے ...... یہ جو کچھ کراچی میں ہو رہا ہے یہ سب ...... میرا دل چاہتا ہے کسی دن سب کو چھوڑ کر کراچی چلا جاؤں اور کسی دہشت پسند کی گولی کا نشانہ بن جاؤں اور...... اور کیا کر سکتا ہوں میں؟...... کتنے بے بس ہیں ہم ...... اہلِ کراچی کو کیا خبر بنّو! کہ ہم یہاں ان کے لئے کتنا کڑھتے ہیں۔ ہر روز کتنی دعائیں کرتے ہیں اور سوچتے ہیں شاید صبح سب کچھ بدل چکا ہو گا۔ مگر ہر صبح کا اخبار ہمارے آنسوؤں سے بھیگ جاتا ہے۔''

اُن کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو آ جاتے تھے۔ اور وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہی بیٹھے ایک روز اس نے پوچھا تھا۔

''طیب بھائی! آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

اور طیب بھائی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک لڑکی تھی، ان کی کلاس فیلو جس سے وہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس سے محبت کرتے تھے اور یہ محبت یک طرفہ نہ تھی بلکہ ہر لمحہ

اس نے بھی انہیں اپنی محبت کا احساس دلایا تھا۔

ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی تھیں۔

عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔

لیکن پھر یوں ہوا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا اور اپنے ہی طبقے کے ایک دولت مند لڑکے سے شادی کر لی۔

''کیا آپ کو پتہ نہیں تھا کہ وہ بہت دولت مند ہے...... پھر آپ نے اس سے کیوں محبت کی؟''

''پگلی! محبت سوچ سمجھ کر تو نہیں کی جاتی۔ بس وہ مجھے اچھی لگی تھی اور پھر وہ خود ہی میری طرف بڑھی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں ان دنوں یونیورسٹی کی لڑکیوں کا ہیرو ہوا کرتا تھا...... بہت نام تھا میرا۔ بہت مقبولیت ملی تھی مجھے ہر حوالے سے...... پارٹی کے حوالے سے...... غیر نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے۔ اور خاص طور پر اپنی شعلہ بیان تقاریر کے حوالے سے...... یقین کرو بنو! میں جب تقاریر کرتا تو کتنا بھی بڑا مجمع ہوتا، ساکت ہو جاتا تھا۔ وہ شاید ایک وقتی چارم کے تحت میری طرف بڑھی تھی لیکن میں سچ مچ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ کسی اور لڑکی کو میں اس کی جگہ نہیں دے سکتا تھا۔''

اور طیب بھائی کے لئے اُس کا دل بہت دُکھا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر ان کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔

وہ دُکھی ہیں۔

ان کے دل پر چوٹ لگی ہے۔

جدائی کا دُکھ۔

محبت کے بچھڑ جانے کا دُکھ۔

نارسائی کا دُکھ۔

پھر پارٹی سے جدا ہونے کے بعد اپنی محنتوں کے رائیگاں جانے کا دُکھ۔

انہیں تو زیادہ توجہ اور محبت کی ضرورت ہے تاکہ یہ سارے زخم بھر جائیں۔ لیکن امی کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

''یہ کیا چکر ہے بھئی!'' ایک روز انہوں نے آفتاب ماموں سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ''یہ تمہاری بھانجی بیگم میرے بیٹے پر ڈورے ڈال رہی ہیں۔''

''تاج بی بی!'' ماموں بہت زور سے چیخے تھے۔ ''اس سے آگے ایک لفظ مت

کہنا۔''

اور وہ جو ماموں کے لئے چائے لا رہی تھی، وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

''امی ایسا سوچتی ہیں...... اتنی غلیظ سوچ ہے ان کی۔''

اور پھر اس کے بعد جو ایک ماہ اس نے وہاں گزارا تھا، کتنی اذیت اٹھائی تھی اس نے۔ امی کی نظریں اسے اپنے وجود میں گڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور اس ایک ماہ میں کتنی بار اس نے مرنے کی دعائیں کی تھیں۔ کتنی بار سوچا تھا کہ وہ چپکے سے واپس فیصل آباد چلی جائے۔ یا پھر بو جی کو خط لکھ دے۔

اماں کا پہلا فیصلہ کتنا صحیح تھا۔

طیب بھائی اسے بلاتے تو وہ لرز جاتی۔

''کیا ہو گیا ہے بنو تمہیں؟...... ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ چلو باہر نکلو۔ کتنی خوبصورتی پھیلا رکھی ہے چاند نے...... کیا تمہارے فیصل آباد میں بھی چاند اس طرح نکلتا ہے؟ اتنی ہی خوبصورتی کے ساتھ؟'' اس رات کھانے کے بعد طیب بھائی نے اس کے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا تو اس کا رنگ یک دم زرد پڑ گیا۔

''نہیں طیب بھائی! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے...... تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا...... ڈاکٹر کے پاس لے چلتا۔'' وہ اندر آئے تو وہ گھبرا گئی۔

''نہیں...... نہیں...... بس یونہی معمولی سا سر درد ہے۔''

''یہ معمولی سا سر درد کیا بیس دنوں سے ہو رہا ہے؟ اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں؟ نہ بابا، ہمیں اپنی پیاری سی بہن کو نہیں گنوانا۔ صبح ہی تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو گی۔''

جھر جھر اندر چشمے اُبل رہے تھے اور وہ ہونٹ بھینچے ان آنسوؤں کو روک رہی تھی۔

تب ہی امی آ گئیں۔

''طیب! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں امی۔ بنو سے کہہ رہا تھا کہ باہر اتنی اچھی چاندنی ہے۔ باہر چلو، بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں۔ لیکن یہ تو انتہائی قنوطی ہو رہی ہے۔''

پھر امی نے جو کچھ کہا تھا، کاش اس نے نہ سنا ہوتا۔

کاش، وہ آگے بڑھ کر انہیں روک دیتی۔

مگر وہ تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔

طیب بھائی کیا کہہ رہے تھے، اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اندھی، گونگی اور بہری ہو گئی ہو۔

پھر طیب بھائی غصے سے چیختے ہوئے مامی کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر تک یوں ہی ساکت بیٹھی رہی تھی۔ جانے کب صبح ہوئی تھی، کب رات گزری تھی۔

اسے تو یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی مامی باہر گئی ہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے ان کی زبان آگ اُگل رہی تھی اور اُسے یوں لگ رہا تھا اُس کے جسم پر جہاں جہاں یہ آگ گری تھی، وہاں آبلے سے بن گئے ہوں۔

اس نے آہستہ سے چھو کر اپنا جسم دیکھا جو آگ کی طرح دہک رہا تھا۔

ساری رات اسے یوں لگتا رہا جیسے کوئی مٹھیاں بھر بھر کر انگارے اس پر پھینکتا رہا ہو۔

اور پھر کتنے دن بے خبری میں گزر گئے تھے۔ دو، چار، پانچ ...... اُسے دنوں کا کچھ شمار ہی نہیں تھا۔

طیب بھائی کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا...... آفتاب ماموں بہت پریشان تھے ...... مامی ہاسپٹل میں تھیں۔

کراچی سے بلال بھی آ گیا تھا۔ شاید اُن کی حالت بہت خراب تھی۔ طیب بھائی شاید مامی کے الزامات برداشت نہیں کر سکے تھے۔

"حیرت ہے، میں کیسے زندہ ہوں؟" وہ چھو چھو کر خود کو دیکھتی۔ "کیا میں طیب بھائی سے زیادہ سخت جان ہوں؟ اور مرنا تو مجھے چاہئے تھا مگر میں تو زندہ ہوں۔"

پھر طیب بھائی ہاسپٹل سے گھر بھی آ گئے لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ انہیں جا کر دیکھے۔ حالانکہ کتنا دل چاہا تھا اس کا کہ وہ ان کی مزاج پرسی کرے لیکن وہ تو کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ ماسی خیراں کمرے میں ہی اسے کھانا دے جاتی۔ دل چاہتا تو دو چار نوالے لے لیتی ورنہ یوں ہی پڑی رہتی۔ ماسی خیراں اسے تاسف سے دیکھتی۔

"تم بھی اپنی بچی ہو ...... کیا تھا اگر بی بی تمہیں ہی اپنے طیب ......" ماسی خیراں اس کے لئے چائے لائی تو ہمدردی سے بولی۔

"نہیں ......" اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

اب بات گھر کے ملازمین تک بھی پہنچ گئی ہے۔

اس رات اس نے سوچا کہ اسے فیصل آباد چلے جانا چاہئے۔ کوئی مائی رکھ لوں گی،

مسز ربانی سے درخواست کروں گی کہ دوبارہ مجھے جاب دے دیں۔ وہ کل ہی آفتاب ماموں سے بات کر لے گی۔

اس نے سوچا اور بڑے دنوں بعد اس نے اپنے اندر ایک توانائی سی محسوس کی۔

میری کوئی غلطی نہیں ہے۔

پھر میں کیوں چھپ کر بیٹھی ہوں اور یہ تو مامی کی اپنی ذہنیت ہے۔ ان کے اپنے اندر کا گدلا پن ہے اور یہ طے ہے کہ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔

اس نے فیصلہ کر کے اپنا سامان اسی رات پیک کر لیا۔ ایک اٹیچی کیس اور ایک بیگ ہی تو تھا۔ گھر کا سارا سامان تو وہاں ہی اسٹور میں بند کر آئے تھے۔ طیب بھائی نے کہا تھا۔

"تمہیں کون سا کسی الگ گھر میں رہنا ہے ......بس ضروری چیزیں لے لو۔"

چلو، یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔ ورنہ اب مصیبت پڑتی۔

میں سیدھی دُرِشہوار کے ہاں جاؤں گی۔ پھر دُرِشہوار کے ڈیڈی سے کہہ کر گھر خالی کروا لوں گی یا پھر ...... یا پھر ہاسٹل میں رہ لوں گی۔

وہ یہ فیصلہ کر کے بہت مطمئن ہو گئی تھی۔

مگر اسی رات بو جی آ گئیں۔

وہ کسی عزیز کے ہاں شادی میں شرکت کرنے لاہور آئی تھیں اور وہاں انہیں خالدہ کی وفات کا پتہ چلا تو چلی آئیں۔

"آفتاب! میں اتنی غیر تو نہ تھی۔ خالدہ میری چچا زاد ہی نہیں سگی بہنوں جیسی تھی۔ تم نے اطلاع بھی نہ دی۔" انہوں نے ماموں سے گلہ کیا۔ "میں منہ ہی دیکھ لیتی۔ مگر تم تو شادی کے بعد ایسے غیر ہوئے کہ......"

اور جب آفتاب ماموں، بو جی کے ساتھ اس کے کمرے میں آئے تو وہ گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی۔

"پنو! دیکھو، بو جی آئی ہیں۔"

"بو جی!" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

اماں بو جی کی کتنی باتیں کرتی تھیں اور اس کے ذہن میں بو جی کا جو ایک خاکہ سا بنا تھا، وہ بالکل ایسی ہی تھیں۔

بہت باوقار اور شفیق سی۔

انہوں نے اپنے بازو پھیلائے تو وہ بے اختیار ان کے گلے لگ گئی اور پھر جیسے آنکھوں سے سمندر اُبل پڑے۔
کتنے آنسو اس کے اندر منجمد ہو گئے تھے۔
کتنے دنوں سے سینے پر سل سی دھری تھی۔
وہ تو اس وقت بھی نہ روئی تھی جب مامی اس پر الزام لگا رہی تھیں۔
اُس وقت بھی نہیں جب ماسی خیراں نے طیب کی بیماری کا بتایا تھا۔
اُس وقت بھی نہیں جب ماسی خیراں اُس سے ہمدردی کر رہی تھی۔
اتنا تو شاید وہ اماں کے مرنے پر بھی نہیں روئی تھی جتنے آنسو آج اس نے بو جی کے گلے لگ کے بہا دیئے تھے۔
شاید اماں کی موت پر بھی اسے رونے کے لئے کوئی کندھا نہیں ملا تھا۔ وہ ایک دم نڈھال ہو گئی تھی۔
''حوصلہ میری جان! میری بچی ...... اللہ کی رضا یہی تھی۔'' بو جی نے اسے سہارا دیتے ہوئے بٹھایا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ اس کا ہاتھ اب بھی ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس سے اماں کے متعلق، ان کی بیماری کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ انہیں ہولے ہولے بتاتی رہی۔
''اماں کا بہت جی چاہتا تھا آپ سے ملنے کو......'' اس نے انہیں بتایا۔ ''اگر وہ زندہ رہتیں تو ان چھٹیوں میں ہم کراچی آتے۔''
''ہاں ...... قسمت میں زندگی میں ملاقات نہیں تھی۔''
ماموں، بو جی کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔
''بو جی! آپ یہاں رہیں گی کچھ دن؟''
''نہیں بیٹا ...... پرسوں صبح کی فلائٹ ہے۔ خالدہ کا سن کر رہ نہیں سکی۔ لڑکی کی رخصتی ہوتے ہی میں نے مظہر سے کہا بیٹا، مجھے ابھی آفتاب کے گھر لے چلو۔ حالانکہ مظہر نے کہا بھی کہ صبح چلیں گے مگر مجھ سے رہا نہیں جا رہا تھا۔''
''چلو اچھا ہوا کہ آپ آج ہی آ گئیں ورنہ مجھے زندگی بھر آپ سے ملنے کا افسوس رہتا۔''
''کیوں ...... تمہیں کل کہیں جانا تھا؟''
''میں شاید کل فیصل آباد چلی جاتی۔''

''کتنے دنوں کے لئے؟''
''ہمیشہ کے لئے۔''
''وہاں اکیلی رہو گی تم؟'' بو جی کو حیرت ہوئی۔
''جی بو جی!''
''تاج کا رویہ تو تمہارے ساتھ اچھا ہے نا؟''
''جی......'' وہ مسکرائی۔ اپنا آپ چھپانے کی پرانی عادت لوٹ آئی تھی۔ اماں کی خاطر وہ یونہی اپنا آپ چھپاتی رہتی تھی۔ بو جی کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں پھر جیسے خود بخود ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا۔
''بنو! تم میرے ساتھ چلو کراچی۔''
''جی......''
'اماں کی بھی یہی خواہش تھی۔' اس نے سوچا۔
''مگر......''
''اگر مگر کچھ نہیں، میرے ساتھ جانا ہے۔ اکیلی لڑکی تنہا رہے، یہ ہرگز مناسب نہیں۔ خالدہ کوئی غیر نہیں تھی۔ تم میری بھی بیٹی ہو۔ مجھے خالدہ کی جگہ ہی سمجھو۔''
اور ان کی محبت پر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
''بو جی......'' ایک بار پھر آنکھوں سے دریا پھوٹ پڑے تھے۔ انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔
اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن پھر بھی جیسے بو جی نے سب کچھ جان لیا تھا۔
''میں تاج بی بی کو جانتی ہوں ...... دل کی بہت چھوٹی ہے ورنہ تمہارے ابا کے مرنے کے بعد آفتاب نے کتنا چاہا تھا کہ وہ تم دونوں ماں بیٹی کو اپنے پاس ہی لے آئے لیکن تاج بی بی نے واویلا مچا دیا۔ بتایا تھا سب آفتاب نے مجھے۔ تب میں نے خالدہ سے کہا بھی تھا کہ کراچی آ جاؤ مگر وہ فیصل آباد چھوڑنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ ہاں اس نے مجھے کہا تھا کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا اور آفتاب نے میری بنو کے سر پر ہاتھ نہ رکھا تو آپ اسے اپنے پاس لے جانا۔ سو اگر تمہارے دل میں کوئی تردد ہے بھی تو اپنی ماں کی اس بات سے یہ تردد یقیناً نکل جائے گا۔''
''نہیں...... اماں نے خود بھی کئی بار مجھ سے کہا تھا۔''
''تو پھر ٹھیک ہے ...... میں آفتاب سے بات کرتی ہوں۔''

انہوں نے آفتاب ماموں سے بات کی تو انہوں نے شرمندگی سے کہا۔

''ہاں بو جی! بٹو کا آپ کے ساتھ چلے جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن یہ میری امانت ہے۔ میں نے مرتے وقت خالدہ سے وعدہ کیا تھا لیکن شاید کچھ وقت لگ جائے۔ میں خالدہ کی روح سے شرمندہ ہوں کہ اس کی بیٹی کے لئے میرے گھر میں جگہ نہ بن سکی۔ لیکن بو جی! یاد رکھئے گا، یہ میرے بلال کی امانت ہے۔''

''تم بے فکر رہو آفتاب! وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔'' انہوں نے تسلی دی۔

اور اگلی صبح جب وہ جا رہی تھیں تو وہ بھی ساتھ تھی۔

آفتاب ماموں شرمندہ شرمندہ سے تھے۔

مامی مطمئن تھیں۔

اس نے مڑ کر طیب بھائی کے کمرے کی طرف دیکھا تو اس کی نظر ان پر پڑی جو دروازے کا ایک پٹ پکڑے کھڑے تھے۔ کتنے کمزور لگ رہے تھے وہ۔ نہ وہ یہاں آتی، نہ مامی ایسے الزامات لگاتیں اور نہ وہ بیمار پڑتے۔

اندر ہی اندر وہ شرمندہ ہو گئی۔

اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر طیب بھائی اس کے قریب چلے آئے، اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بٹو! اپنا خیال رکھنا۔ اور ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔''

مامی نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

''اور بٹو! کراچی والوں سے کہنا ہم تمہارے دکھ میں تمہارے ساتھ ہیں ...... ہمارے آنسو تمہارے ساتھ بہتے ہیں ...... تمہارا بہتا لہو ہمارے سینوں میں بھی آگ لگاتا ہے...... تمہارے بیٹوں، تمہارے بھائیوں اور تمہارے شوہروں کی لاشوں پر ہم بھی تمہارے ساتھ بین کرتے ہیں...... لیکن ہم شرمندہ ہیں، نادم ہیں کہ ہم تمہاری سڑکوں پر بہتے لہو کو صاف نہیں کر سکتے ...... تمہارے ساتھ تمہاری گلیوں کی ویرانی ہمیں بھی رُلاتی ہے ...... لیکن ہم بھی اتنے ہی بے بس ہیں جتنے تم۔''

ان کی آواز بھرا گئی۔

''لیکن ہمارے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ہیں اور اس وقت تک نہیں گریں گے جب تک تمہارے شہر کی رونقیں لوٹ نہیں آتیں ...... جب تک خوف کے سائے تمہارے اوپر سے ہٹ نہیں جاتے ...... یہ ہاتھ یونہی اٹھے رہیں گے۔ بٹو! ہماری دعائیں اور محبتیں

کراچی کے لئے لے جاؤ۔'' وہ ایک دم ہی واپس مڑ گئے تھے۔

☆

بو جی نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی اور اسے یوں سوچ میں گم صم کھڑے دیکھ کر بو جی گھبرا گئیں۔ کہیں بخت خان نے کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا۔

بچی پہلے ہی پریشان ہے ...... اور یہ بخت خان تو بس جو کچھ منہ میں آتا ہے بکے جاتا ہے۔

''بٹو! بخت خان کی باتوں کا برا نہ مانا کرو۔ وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی۔

''نہیں ...... انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔''

''دل میں کوئی بات نہیں رکھا کرو بیٹا! میں تمہاری ماں ہوں ...... کسی نے کچھ کہا ہے، کوئی گلہ، کوئی شکوہ ہو تو مجھے بتاؤ۔''

''نہیں تو ...... سب بہت اچھے ہیں۔'' اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

اور یہ حقیقت بھی تھی، سب بہت اچھے تھے۔

بو جی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے دو بیٹے مظہر خان اور اطہر خان اور دونوں بیٹیاں بیاہی ہوئی تھیں۔ بخت خان سب سے چھوٹے تھے اور غیر شادی شدہ تھے۔

دونوں بیٹوں اور ان کی اولادوں کے علاوہ بو جی کے تین بھتیجے اور ایک بھتیجی بھی ان کے ساتھ مقیم تھی۔

بھائی بھاوج کا انتقال ہو چکا تھا۔ وقار جاب کر رہے تھے۔ جواد اور فواد ابھی پڑھ رہے تھے۔ اسماء نے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان دے رکھا تھا۔ بھابھی تو چھوٹے بیٹے فواد کی پیدائش پر فوت ہو گئی تھیں۔ جب کہ بھائی کو کوئی تین برس پیشتر دل کا دورہ پڑا تھا اور ہاسپٹل لے جانے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ بو جی سارے بچوں کو سمیٹ کر گھر لے آئی تھیں۔ پہلے بھی زیادہ تر اسماء اور فواد ان کے پاس ہی رہتے تھے۔

بو جی کا دل سمندر تھا۔

اماں سچ کہتی تھیں۔

ایک لمحے کے لئے بھی انہوں نے یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ان پر بوجھ ہیں۔

"سب سو رہے ہیں بیٹی ...... تم بھی لیٹ جاؤ جا کر۔"

"نہیں بو جی! مجھے سویرے جاگنے کی عادت ہے۔"

"مظہر، اطہر اور وقار تو کب کے اپنے اپنے آفس جا چکے۔"

"اچھا۔"

"ہاں بیٹا! سب رات کو دیر تک جاگتے ہیں اس لئے دیر سے اٹھتے ہیں۔ کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ رات کو جلدی سویا کرو اور صبح جلدی جاگا کرو۔ بچے بھی تو سکول نہیں جا رہے۔"

"کیوں؟" وہ یونہی پوچھ بیٹھی تھی۔

"ارے بیٹا! ان حالات میں بچے بے چارے کیا سکول میں جائیں گے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ جان سُولی پر اٹکی رہتی ہے۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"بو جی! کیا حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے؟"

"اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہئے بیٹا۔"

'مگر اتنے دن ہو گئے ...... شاید سال سے بھی زیادہ۔ کب ٹھیک ہو گا سب؟' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور بو جی سے پوچھا۔

"چائے پئیں گی آپ؟"

"پی لوں گی ...... ادھر میرے کمرے میں ہی دے دینا۔ قرآن پڑھتے سے اٹھ کر آئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس لڑکے کے لئے میرا دل ہولتا ہے۔ اتنا غصہ بھرا ہوا ہے اس کے اندر۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تو وہ کچن میں آ گئی۔

پیر بخش نے چائے دم کر رکھی تھی۔

اس نے دودھ گرم کرنے کے لئے چولہے پر رکھا اور کپ نکال کر ٹرے میں رکھنے لگی تھی کہ پیچھے سے بخت خان کی آواز آئی۔

"پلیز، میرے لئے بھی ایک کپ بنا دینا۔ میں اُدھر ماں جی کے کمرے میں ہوں۔"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ اب وہ نارمل لگ رہا تھا۔ اگرچہ اس کی آنکھیں اب بھی سرخ تھیں۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ چلا گیا تھا۔ اس گھر میں سب سے پہلے وہ بخت خان سے ہی متعارف ہوئی تھی جب وہ بو جی کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئی تھی تو وہ گیٹ کے پاس ہی کھڑا مالی سے باتیں کر رہا تھا۔

"بو جی، آپ آ گئیں؟" وہ ایک دم مُڑ کر ان کے گلے لگ گیا۔ "آپ کے بغیر سب بہت اُداس تھے۔"

سانولا رنگ، اونچا لمبا قد، نقوش کچھ کچھ مظہر بھائی سے ملتے ہوئے اور بے حد چمکیلی سیاہ آنکھیں۔

بو جی سے مل کر اس نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہ تمہاری خالہ خالدہ کی بیٹی ہے۔ نویدِ صبح۔"

"آہا ہا......" وہ چہکا۔ "نویدِ صبح ...... اے نویدِ صبح، اس شہر میں تیری آمد اچھا شگون ہے۔"

اس کی آنکھیں زیادہ چمکیلی اور سیاہ لگنے لگی تھیں۔

"یہ شخص تو بالکل طیب بھائی جیسی باتیں کر رہا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

"یہ بخت خان ہے، میرا سب سے چھوٹا بیٹا۔" بو جی نے تعارف کروایا۔ "آؤ چلو اب اندر۔ کیا ہمیں یہاں ہی کھڑا رکھو گے؟"

"اوہ سوری، آیئے اندر۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "دراصل ہم اہلِ کراچی بہت خوش گمان ہو گئے ہیں۔ تنکے کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہاں اب ...... اب شاید سب ٹھیک ہو جائے۔ جیسے اب میں بہت خوش ہو رہا ہوں۔"

نوید کو وہ بہت اچھا لگا تھا۔ بالکل طیب بھائی کی طرح مخلص اور محبت کرنے والا۔

"اے لڑکے......" مظہر بھائی نے پیچھے سے آواز دی۔

"اوہ آپ...... سوری بھائی جان! میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ کہاں تھے آپ؟"

"بابا، باہر ٹیکسی والے سے گپ لگا رہا تھا۔"

"ٹیکسی والے سے گپ؟"

"ہاں......" انہوں نے مالی بابا کو آواز دی۔ "بابا! یہ سامان اندر پہنچا دیں۔"

"کیا ضرورت تھی ٹیکسی والے سے فضول گپ لگانے کی؟" وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگا تھا۔ "کیا خبر یہ بھی کوئی دہشت گرد ہو۔"

"اوہ نہیں۔" مظہر بھائی ہنس دیئے تھے۔ "یہ شخص میرا ہم جماعت تھا۔ میٹرک ہم نے اکٹھے ہی کیا تھا۔ اور تم پر ہر وقت دہشت گرد کیوں سوار رہتے ہیں؟ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے ہو۔"

"اس لئے کہ انہوں نے عمران کو بغیر کسی قصور کے گولی ماری ہے اور نہ جانے ...... نہ جانے کتنے عامی......" پھر ایک دم بات نامکمل چھوڑ کر وہ اندر چلا گیا تھا۔

اُسے یہاں آئے دس دن ہو گئے تھے اور دس دنوں میں وہ بہت کم دکھائی دیا تھا۔ زیادہ تر کمرے میں ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھار نکلتا تو کافی دیر سے لوٹتا اور بو جی پریشان ہوتی رہتیں۔ گھر کے باقی افراد بہت جلد اس سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ سب بہت مخلص اور ہمدرد تھے۔ شاید یہ بو جی کی تربیت کا اثر تھا۔

اسماء اس کی ہم عمر تھی اور بی۔ ایس۔ سی کا امتحان دے کر فارغ تھی۔ اسے یونیورسٹی میں ایڈمشن کا انتظار تھا۔ اسماء کے ساتھ وقت اچھا گزر رہا تھا۔ دونوں میں کافی دوستی ہو گئی تھی۔ اسماء مسلسل بولتی رہتی تھی۔ اس کے پاس باتیں کرنے کے لئے ڈھیروں موضوعات تھے۔ فارحہ بھابھی اور عارفہ بھابھی دونوں ملنسار تھیں اور اس کے ساتھ محبت سے پیش آتی تھیں۔

مظہر بھائی، اطہر بھائی اور وقار بھائی بہت شفیق اور مہربان لگتے تھے۔

جواد اور فواد شوخ و شریر لڑکے تھے۔ گھر کے کسی فرد نے بھی اس کی آمد پر تعجب کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مظہر بھائی اور اطہر بھائی کے بچے بھی اس سے مانوس ہو گئے تھے۔

بو جی کی ایک بیٹی تو کراچی میں ہی تھیں اور دوسری شارجہ میں۔ نوید کی آمد پر عام بطور خاص اس سے ملنے آئی تھی۔

"بو جی! ہمیں آپ سے بڑی شکایت ہے۔ آپ نے ہمیں ہماری اتنی پیاری ک کزن سے اب تک نہیں ملوایا تھا۔"

اس نے آتے ہی شکوہ کیا تھا۔

اور وہ ابھی تک ان ساری محبتوں میں گھری حیران حیران سی تھی۔ کیا اماں کے بعد بھی اسے یوں اتنا تحفظ، اتنی محبت مل سکتی تھی؟

آفتاب ماموں تو قصور لا کر اسے بھول ہی گئے تھے۔ مامی کے ڈر سے بات تک نہ کرتے تھے۔ اور اگر بو جی نہ آتیں آفتاب ماموں سے ملنے، اماں کا افسوس کرنے تو یہ محبت بھرا ماحول اسے کہاں ملتا۔

فیصل آباد میں اکیلے رہنا کس قدر مشکل ہوتا۔

اور پھر پتہ نہیں ماموں اسے جانے بھی دیتے یا نہیں۔

اور وہاں ماموں کے گھر میں رہنا اور بھی مشکل ...... اور بھی اذیت ناک ہوتا ......

تو مر ہی جاتی شاید۔

دودھ اُبل اُبل کر چولہے پر گر رہا تھا۔

"اوفوہ......" پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا اسے۔ بیٹھے بیٹھے کھو جاتی تھی...... گھنٹوں بیٹھی سوچتی رہتی۔

اس نے جلدی جلدی چائے بنائی اور بو جی کے کمرے میں آ گئی۔ بو جی کے گھٹنوں پر سر رکھے وہ ان کے پلنگ پر ہی لیٹا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"تھینک یو نوید صبح!"

وہ اسے ہمیشہ پورے نام سے بلاتا تھا۔ جب کہ بو جی کی دیکھا دیکھی سب اسے بنّو کہہ کر بلانے لگے تھے۔

اس نے کپ ٹرے سے اٹھا لیا۔

بو جی کو چائے دے کر وہ جانے لگی تو بو جی نے اسے روک لیا۔

"یہیں بیٹھ جاؤ بیٹا!"

"جی......" وہ ان کے سامنے رکھے موڑھے پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

"بیٹا! یہ یونیورسٹی میں داخلے کھلے یا نہیں؟"

"معلوم نہیں ماں جی۔"

"بیٹا! جب اسماء کے لئے فارم لاؤ تو بنّو کے لئے بھی لے آنا۔ اس نے بھی بی۔ اے کر رکھا ہے۔ ایم۔ اے کر لے گی۔"

"نہیں، نہیں بو جی! میں پرائیویٹ ایم۔ اے کر لوں گی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

وہ ان لوگوں پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ یہاں رہ رہی تھی۔ اتنی محبتوں کے درمیان۔

"پرائیویٹ کیوں ...... اسماء جائے گی تو تم بھی چلی جانا۔"

"ویسے ماں جی! یہ کہتی تو ٹھیک ہیں۔ کیا پتہ کسی صبح یہ یونیورسٹی جائیں اور پتہ چلے آج دہشت گردوں نے یونیورسٹی بس میں آگ لگا دی ہے اور ہمیں بی بی اسماء اور نوید صبح کی بجائے ان کی جلی ہوئی لاشیں ملیں۔"

"خدا کا خوف کرو بیٹا......" بو جی کانپ گئیں۔ "اول فول جو بھی منہ میں آتا ہے بکتے رہتے ہو۔ ہزار دفعہ کہا ہے منہ سے ہمیشہ اچھی بات نکالتے ہیں۔"

"کیا کروں، میرا مزاج کچھ کچھ چچا غالب سے ملتا ہے۔ اپنا مذاق خوب اُڑاتا ہوں

اور خوش ہوتا ہوں کہ لو غالب کو ایک اور جوتی پڑی۔“

”بخت خان......“ بو جی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”یہ خوش ہونے کا مقام ہے؟“

”تو کیا کروں ...... کیا کروں ماں جی؟“ وہ پھٹ پڑا۔ ”آپ کو کیا پتہ میرے اندر کتنے سارے آنسو اکٹھے ہو گئے ہیں۔ دریا بن گیا ہے میرے اندر۔ کیا کروں میں ماں جی ...... دریا یا سمندر میں آگ نہیں لگتی۔ اور میرے اندر یہ جو دریا ہے نا، اس میں آگ لگی ہے۔ میں کیا کروں ماں جی؟ ...... کہاں سے ڈھونڈوں عامی کے قاتلوں کو؟ ...... کس سے انتقام لوں؟ ...... کہاں تلاش کروں ان لوگوں کو جو میرے اس خوبصورت شہر کی رونقوں کو اُجاڑ رہے ہیں ...... بتائیں نا ماں جی ...... کیا کروں ...... کیا کروں؟“

وہ بلک بلک کر رونے لگا ...... وہ اتنا لمبا اونچا مرد۔

بو جی نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔ اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے اور ہولے ہولے اسے تھپکنے لگیں۔ وہ ہونٹ بھینچے بیٹھی تھی۔ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ کسی ننھے بچے کی طرح بو جی کے سینے سے لگا سسک رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

’اچھا ہے ...... وہ بہت سارا رو لے۔‘ اس نے سوچا۔

بو جی نے بتایا تھا کہ وہ عامی کی موت پر رویا نہیں تھا۔ ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا اس نے ...... لیکن وہ بہت چڑچڑا اور غصیلا ہو گیا تھا۔

’اچھا ہے ...... آج سارا غبار چھٹ جائے گا۔‘

وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسماء ابھی تک سو رہی تھی۔ اس نے شیلف سے ایک کتاب نکالی اور اس کی حالت پر نکل آنے والے آنسوؤں کو جنہیں لاشعوری کوشش سے وہ روکے ہوئے تھی، ہاتھوں کی پشت سے صاف کر کے کتاب پڑھنے لگی۔

☆☆☆

بہت دنوں سے کراچی میں سکون تھا۔ بچے سکول جانے لگے تھے اور چہروں پر اطمینان اتر آیا تھا۔ نوید اور اسماء نے بھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ نوید ایسا چاہتی تو نہیں تھی مگر بو جی نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ مظہر بھائی ناراض ہو گئے۔

”تم ہمیں غیر سمجھتی ہو بٹو! بھئی تم اب اس گھر کی فرد ہو۔ تمہارے دُکھ، سُکھ، تمہاری خوشیاں اور غم سب ہمارے ساتھ ہیں۔“

اُس کی پلکیں ان محبتوں پر نم ہو گئی تھیں۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے ان آنسوؤں کو

باہر نکلنے سے روک لیا تھا۔

اتنی چاہتیں، اتنی سہولتیں ...... زندگی میں اگر یہ سب کچھ پہلے مل گیا ہوتا تو زندگی کا رنگ شاید مختلف ہوتا۔ مگر شاید ہر بات کا کوئی وقت مقرر ہوتا ہے۔

اگر اماں زندہ ہوتیں تو اسے یوں اتنے سکون اور اطمینان سے رہتے دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں۔

مگر شاید سب کچھ یوں ہی ہونا تھا اور اس طرح وہ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی کبھی اسے طیب بھائی اور آفتاب ماموں یاد آتے۔

اور پھر وہاں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا۔

مامی کا شک ...... اور ان کا رویہ ...... سب کچھ کتنا تکلیف دہ تھا۔

وہ کچھ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے خود کو پڑھائی میں گم کر دیا تھا اور زندگی بڑی سہولت سے گزرنے لگی تھی۔ صبح سویرے یونیورسٹی جانا، واپس آ کر تھوڑا آرام کرنا پھر شام کو بھابھیوں کے ساتھ کچن میں کام کروانا۔ حالانکہ وہ منع ہی کرتی رہ جاتیں لیکن وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ اسے یوں فارغ بیٹھنا پسند نہیں تھا۔

گھر میں کام کے لئے ملازم تھے لیکن کچن کا کام خود ہی کیا جاتا تھا۔ مظہر بھائی اور اطہر بھائی کو ملازم کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند نہ تھا۔ خود بو جی بھی اسے پسند نہ کرتی تھیں کہ کھانا ملازم پکائیں۔

”اپنے ہاتھ کے پکے کھانے کی لذت ہی اور ہوتی ہے ...... اور پھر مرد کو بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے لئے، اس کی خاطر بیوی نے کھانا پکایا ہے۔“

اسے بو جی کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں اور وہ ان کی باتیں بہت دھیان سے سنتی تھی اور ذہن میں بٹھا لیتی تھی۔

رات کو سب اکٹھے کھانا کھاتے۔ تھوڑی بہت گپ شپ ہو جاتی۔ کچھ دیر ٹی۔وی لاؤنج میں بیٹھا جاتا۔ جواد اور فواد بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔ تینوں بہن بھائیوں کی نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ بخت خان زیادہ تر خاموش رہتا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ کبھی کبھار اس کا حال چال دریافت کر لیتا۔ ٹی۔وی روم میں بہت کم بیٹھتا ...... عموماً کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

کبھی کبھار فواد اور جواد اسے زبردستی روک لیتے تھے۔

اس روز بھی وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے اور ٹی۔وی پر کوئی گانوں کا پروگرام آ رہا

تھا۔ جواد گانے والے کی نقل اتار رہا تھا۔

''یار! اس طرح کا گانا تو میں بھی گا سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے فہدی! ہم دونوں مل کر ایک گروپ نہ بنا لیں؟ میں گانے لکھوں گا، تم دونوں ڈم ڈم ...... میرا مطلب ہے سا بجانا اور بخت خان گائیں گے۔ آواز خداداد ہے۔''

اس نے کونے میں بیٹھے بخت خان کی طرف دیکھا جو ٹی۔ وی پروگرام دیکھنے کی بجائے کوئی کتاب کھولے بیٹھا تھا۔

''تم ...... تم گانے لکھو گے؟'' فواد ہنسنے لگا۔

''ہاں ...... میں لکھوں گا۔ کون سے مشکل ہیں۔

او میری جانِ جاں
تم ہو کہاں
میں ہوں یہاں
تیرے بن اتنا اکیلا
آؤ نا ...... آ بھی جاؤ نا
او میری جانِ جاں!''

وہ لہک لہک کر گانے لگا۔

''بس بس ...... یقین آ گیا کہ تم بہترین گانے نہ صرف لکھ سکتے ہو بلکہ گا بھی سکتے ہو۔'' فواد نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

دونوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ جواد فواد سے کوئی ڈیڑھ برس بڑا تھا اور دونوں میں بہت دوستی تھی۔ فواد فرسٹ ائیر میں اور جواد سیکنڈ ائیر میں تھا۔

''بھائی! آپ کہاں کھوئے ہوئے ہیں؟'' فواد اپنی جگہ سے اٹھ کر بخت خان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟'' بخت خان نے مڑ کر اُسے دیکھا۔

''وہ ...... وہ بھائی......'' فواد اپنے کان کھجانے لگا اور شرارت سے جواد کی طرف دیکھا۔ ''یہ جاوی اپنا ایک گروپ تشکیل دے رہا ہے ...... اس کا خیال ہے کہ اس میں گانا آپ گایا کریں۔''

''کیا......؟'' بخت خان شاید کتاب میں الجھا ہوا تھا اس لئے اس کی بات نہ سمجھ سکا۔

''کچھ نہیں بھائی!'' جواد نے فواد کو گھورا۔

''یوں ہی مذاق میں بات ہو رہی تھی۔ یہ ٹی۔ وی پر گانے دیکھ رہے ہیں آپ؟''

''گانوں کے نام پر بے ہنگم اُچھل کود۔'' اسماء نے تبصرہ کیا۔

''اپنے ہاں کا ٹی۔ وی دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے سب بہت اچھا ہے۔ جیسے کراچی کے کسی گلی کوچے سے کبھی کوئی لاش نہیں ملی۔ کبھی کچھ نہیں ہوا۔''

بخت خان نے کتاب بند کر دی اور ایک اچٹتی سی نظر نوید پر ڈالی جو اسماء کے قریب ہی فلور کشن پر بیٹھی بڑے انہماک سے ٹی۔ وی دیکھ رہی تھی۔

بہت سادہ سی، کم گو سی اس لڑکی میں کہیں کوئی بات تھی ضرور کہ نگاہیں ایک بار اس کے چہرے پر پڑتیں تو دوبارہ ضرور اس کی طرف اٹھتی تھیں۔

اس کی سادگی میں بھی بلا کی اٹریکشن تھی۔

اس کے گندم رنگ چہرے میں بڑی ملائمت تھی۔

نقوش کچھ ایسے تھے کہ وہ بہت معصوم اور کم عمر لگتی تھی۔

''ویسے بھائی! ایک بات ہے ...... اگر آپ ٹی۔ وی پر گانے لگیں تو کیسا رہے؟ اتنی خوبصورت آواز ہے آپ کی۔'' فواد ابھی تک اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

''ربش ......'' بخت خان نے برا سا منہ بنایا۔

''اذان ہو گئی ہے بیٹی؟'' بو جی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بو جی! ابھی ہونے والی ہے۔'' اسماء نے ریموٹ سے آواز مدھم کی۔

''اپنے ٹی۔ وی سے تو لگتا ہے مسلمان صرف ایک وقت ہی کی نماز پڑھتے ہیں۔ شاید صرف عشاء کی نماز ہی فرض ہوئی ہے۔'' فواد نے کہا۔

''مسلمانوں کی فکر چھوڑو، تم ایک ہی وقت کی بھی پڑھ لو تو غنیمت ہے۔'' اسماء نے فواد کی بات پکڑ لی۔

''اور تم ...... بائے داوے، تم کتنی نمازیں پڑھتی ہو؟''

''تین ......'' وہ خجل ہو گئی۔ ''رات کو نیند آ جاتی ہے۔ صبح دیر سے اٹھتی ہوں۔''

''بری بات ہے اسی بیٹا ...... کوشش کیا کرو کہ ساری نمازیں پڑھ سکو۔ یہ ڈبو بھی تو صبح اٹھتی ہے۔ اس سے کہہ دو، تمہیں اٹھا دیا کرے۔''

''جی بو جی!'' اس نے بو جی کی نظر بچا کر فواد کو مکا دکھایا۔

''بیٹا! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' بو جی نے محبت سے بخت کی طرف دیکھا۔

"جی ماں جی ...... مجھے کیا ہونا ہے۔"

"صبح سے تم کہاں تھے ...... دل ہول رہا تھا۔"

"یوں ہی عارف کے پاس بیٹھا رہا۔"

"کیسا ہے عارف؟ بہت دنوں سے ادھر نہیں آیا۔"

"بزی ہے ...... انگلینڈ جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔"

"عارف بھائی ...... پڑھنے جا رہے ہیں؟" جواد نے اشتیاق سے پوچھا۔

اسے فارن سے ایجوکیشن حاصل کرنے کا کریز تھا۔ لیکن بو جی ابھی اتنی کم عمری میں اسے باہر بھیجنے کے خلاف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اسے گریجویشن کے بعد جانا چاہئے۔

"ہاں پڑھے گا بھی اور جاب بھی کرے گا۔" بخت خان نے کتاب پھر کھول لی۔

"تم نے اپنے لئے کیا سوچا ہے؟"

"ان حالات میں کیا سوچا جا سکتا ہے ماں جی؟ ایک دو جگہ درخواستیں دے رکھی ہیں ...... انٹرویوز کال کا انتظار ہے۔"

"بیٹا ...... ابھی تو حالات کچھ بہتر ہی ہیں۔"

"حالات کی بہتری کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا ماں جی!" اس کے لہجے میں دُکھ سا گھلنے لگا تھا۔

"کیا خبر یہ خاموشی کس طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ کچھ ہو جانے کا خوف، کچھ نہ ہونے کے دنوں میں بڑھ کر سوہانِ روح ہو جاتا ہے۔"

"اللہ سے ہمیشہ رحمت کی امید رکھنی چاہئے۔"

بو جی ہمیشہ کی طرح پُر سکون اور مطمئن تھیں لیکن وہ مضطرب لگ رہا تھا۔ ہولے ہولے ہاتھ کی انگلیوں کو چٹختا ہوا۔

"یہ امید ہی تو زندہ رکھے ہوئے ہے ماں جی! ...... خون کی ہولی ختم ہو جانے کی امید ...... مہنگائی ختم ہونے کی امید ...... پیٹ بھر روٹی ملنے کی امید ...... اچھی زندگی گزارنے کی امید ...... پتہ نہیں کتنی امیدیں انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

نوید گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بہت دھیان سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"اچھا بچو ...... میں نماز پڑھ کر سو جاؤں گی۔ تم بھی جلدی سو جانا۔"

"شب بخیر ماں جی!" بخت خان نے ان کے ہاتھوں پر بوسہ دیا۔ انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

پھر باری باری سب کو پیار کیا۔ ان کی عادت تھی کہ سونے سے پہلے سب کو پیار کرتیں اور دعا دے کر سوتی تھیں۔

ان کے جاتے ہی بخت خان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھائی! آپ تو بیٹھیں نا۔" فواد نے اس کا ہاتھ پکڑ لی۔ "ابھی خبروں کے بعد موسیقی کا بڑا زبردست پروگرام ہے۔"

"نہیں یار ...... تم لوگ سنو، میں ذرا اپنے کمرے میں لیٹ کر کچھ پڑھوں گا۔"

"چاچو ......" سعدی اس سے لپٹ گیا۔ "اب آپ ہمیں آئس کریم کھلانے بھی نہیں لے کر جاتے۔"

"تو اور کیا چاچو ...... ہمیں کبھی سیر کرانے بھی نہیں لے کر گئے۔" انس نے بھی شکوہ کیا۔

"حالات ٹھیک ہو جائیں تو لے جاؤں گا۔" وہ بے حد تھکا تھکا لگ رہا تھا۔

"حالات کب ٹھیک ہوں گے چاچو؟"

"تم دعا کیا کرو نا ...... بچوں کی دعائیں خدا جلدی سنتا ہے۔"

"چاچو ......" سعدی ابھی تک اس کے بازو سے لٹکا ہوا تھا۔ "یہ دہشت گرد لوگوں کو کیوں مار دیتے ہیں؟"

"بیٹا! کیا بتاؤں ......؟" وہ پوری کی پوری اس کی طرف متوجہ تھی۔ خود اسے ابھی تک بہت سی باتوں کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

بخت خان جاتے جاتے رک گیا اور بو جی سے بولا۔

"یہ فہدی کے بارے میں مجھے کچھ انفارمیشن مل رہی ہیں ...... یہ مشکوک لوگوں میں اٹھ بیٹھ رہا ہے اور اس کے خیالات بھی خاصے باغیانہ ہیں۔"

بو جی کے آنسو ان کے رخساروں پر پھیل آئے تھے۔

"ہاں بیٹا! تم نے تو سنا ہے، میں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ پر میں کیا کروں؟ یہ اس اسٹیج پر پہنچ گیا ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔"

"تو ماں جی! پھر آپ اسے سمجھائیں۔ مجھے ڈر ہے ماں جی! یہ کسی غلط سمت جا رہا ہے۔" بات کرتے کرتے وہ جواد کی طرف مڑ گیا۔

"جاوی! یہ آج کل اس کی کن لوگوں سے دوستی ہے؟"
"پتہ نہیں بھائی جان! مجھے کچھ زیادہ پتہ نہیں۔"
"تم پتہ رکھو اس کا ...... دھیان رکھا کرو کالج میں اس کا کہ یہ کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔"
"جی......"

جواد بھی پریشان ہو گیا تھا اور وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو روکنے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں بار بار اپنے ہونٹوں کو کچل رہی تھی۔ بخت خان کی نظر اس پر پڑی۔

"نویدِ صبح......"

اس نے پلکیں اٹھا کر اوپر دیکھنا چاہا لیکن پتہ نہیں کہاں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا تھا۔ حالانکہ اسے آنسوؤں پر بند باندھنے کی بہت پریکٹس تھی مگر اب آنسو روکے نہیں رک رہے تھے۔

"نویدِ صبح! کیا ہوا آپ کو؟" بخت خان حیران حیران سا اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔
"کیوں رو رہی ہیں آپ؟"
"میں ......" اس نے بہ مشکل نظریں اٹھائیں۔ "مجھے ان حالات سے ڈر لگ رہا ہے۔"

بخت خان کی نظریں اس کی نظروں سے الجھ کر رہ گئیں۔ اندر جیسے کہیں کچھ ہونے لگا۔ عجیب سی ہلچل ہوئی۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں اور اس کے قریب سے ہٹ گیا۔

"کم آن ...... ٹیک اِٹ ایزی ...... منہ ہاتھ دھو لو اور جا کر آرام کرو۔ صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔" اس کے لہجے میں ایک دم شفقت آ گئی۔

"جی......" اس نے جلدی جلدی ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں اور چہرہ صاف کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو امی! تم بھی اٹھو ......" بو جی نے اسماء سے کہا اور پھر وہ تینوں ہی بو جی اور بخت خان کے ساتھ ٹی۔ وی لاؤنج سے باہر آ گئے۔

☼☆☼

آج ہڑتال تھی۔ اس لئے سب گھر پر ہی تھے۔ اسماء کچن میں گھسی کچھ کھٹر پٹر کر رہی

تھی۔ جواد دو تین بار اسے دیکھ آیا تھا۔

"لگتا ہے کوئی زبردست ڈش تیار ہو رہی ہے۔" اس نے بڑی بھابھی کے پاس بیٹھی نویدِ صبح کو اطلاع دی۔
"اچھا ...... مثلاً کیا؟" وہ مسکرائی۔
"معلوم نہیں ...... لیکن شام "پوٹ لک" بڑے شوق سے دیکھا جا رہا تھا۔ دیکھئے کیا چیز بنتی ہے۔"

جواد ان کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو بنے گا ہی نا۔" بڑی بھابھی نے رائے دی۔
"اور آپ دیکھنا، چاچو سب سے زیادہ کھائیں گے۔"

سعدی پاس ہی بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو شیطان!"
"یوم آزادی کے لئے کچھ جھنڈیاں بنا رہا ہوں۔ ہم سکول میں پروگرام کر رہے ہیں۔ میری میڈم نے کہا تھا کہ یہ اس طرح کی پٹیاں گھر سے تیار کر لانا۔"
"اور اگر 14 اگست کو بھی ہڑتال ہو گئی مُنے میاں! تو پھر تم کیا کرو گے؟"
"نہیں ...... ہڑتال نہیں ہو گی۔" سعدی نے یقین سے کہا۔ "اور اگر ہو بھی گئی تو ہماری میڈم نے کہا ہے کہ ہم پھر اس دن پروگرام کر لیں گے جب سکول کھلیں گے۔"
"یہ فہدی کہاں ہے؟" نوید نے پوچھا۔
"کمرے میں ہے۔" جواد کھڑا ہو گیا۔ "میں ذرا امی کو چیک کروں، اس کی ڈش کون سی منزل پر ہے۔"

'یہ فہدی بہت خاموش اور چپ چپ رہنے لگا ہے۔' نوید نے سوچا۔ 'پتہ نہیں کیا سوچتا رہتا ہے ...... جواد نے بتایا کہ دو تین روز سے کالج بھی نہیں جا رہا ہے۔ پتہ نہیں اس نے بخت خان کو بھی بتایا ہے یا نہیں۔'

نوید نے پیچھے مڑ کر بخت خان کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ ناشتہ کر کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ سامنے ہی کرسی پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ عین اسی وقت اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اس کی نظریں نوید سے ملیں۔ نوید نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ بخت خان کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

'یہ لڑکی نویدِ صبح عام لڑکیوں سے قدرے مختلف ہے ...... سادہ اور پُر خلوص۔

ماں جی تو بہت تعریف کرتی ہیں ...... ان کا خیال بھی تو بہت رکھتی ہے۔ کیا تھا اگر اس کی ماں کو کچھ نہ ہوتا...... اللہ میاں کی مصلحتیں اللہ ہی جانے۔

اور یہ لڑکی سادہ اور پُر خلوص ہی نہیں، خوب صورت بھی ہے ...... بہت دلکش، دل میں اتر جانے والی۔'

بخت خان کی نگاہیں اسی پر تھیں۔ وہ شاید بڑی بھابھی کے دوپٹے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔

"کیا ہو رہا ہے بھابھی؟"

"کچھ نہیں ...... ذرا نگو سے اس کڑھائی کا ٹانکا سیکھ رہی تھی۔ لیکن مشکل ہے۔"

"میں نے کہا تو ہے، میں بنا دوں گی۔"

"تمہیں پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔"

"پڑھائی کے وقت پڑھائی، فارغ وقت میں کڑھائی۔"

"کیا قافیہ ملایا ہے......" جواد کچن میں تاک جھانک کر واپس آ گیا تھا۔

"امی کی ڈش تیار ہوئی؟" بھابھی نے پوچھا۔

"ابھی نہیں ...... کچھ ملغوبہ بن تو رہا ہے۔ میں وہاں اس کی مدد کے لئے موجود رہوں گا۔"

وہ پھر پلٹ گیا۔

"بخت خان! بیٹھ جاؤ نا......" بھابھی نے اسے بیٹھنے کی پیش کش کی۔

"یہ بھائی جان کدھر ہیں؟" بخت خان نے ذرا فاصلے پر پڑے موڑھے کو اپنی طرف کھینچا۔

"کمرے میں ہیں ...... اظہر بھائی سے کچھ بزنس کے متعلق بات چیت کر رہے ہیں۔ خیر چھوڑو، تمہارا کچھ بنا؟"

"ابھی تو نہیں۔"

"تم اپنے بھائیوں کے ساتھ بزنس میں کیوں نہیں ہاتھ بٹاتے؟"

"بھابھی! میرا ذہن بزنس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ میں انجینئر ہوں اور اسی پیشے میں کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"امی ...... آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔" سعدی نے جو اس دوران اٹھ گیا تھا، واپس آ کر کہا۔

"تم لوگ باتیں کرو، میں ابھی آتی ہوں۔ بلکہ ایسا کرتی ہوں، کارڈز لے آتی ہوں۔ ایک گیم ہو جائے۔" وہ ہنسیں۔ "تم بڑے دنوں بعد ہاتھ آئے ہو۔ اُس روز والی ہار کا بدلہ بھی لینا ہے۔"

"اپنے پارٹنر کو بھی لے آیئے گا۔" بخت خان کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔

"میں تو پارٹنر لے آؤں گی ...... تمہارا پارٹنر کدھر ہے؟" بڑی بھابھی جاتے جاتے پلٹیں۔

بخت کی نظریں بے اختیار کڑھائی کرتی نوید کی طرف اٹھ گئیں مگر لمحہ بھر بعد اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بڑی بھابھی کی طرف دیکھا۔

"وقار کو بھی لیتی آیئے گا۔"

"وہ سو رہا ہے...... اور اس نے منع کیا تھا کہ مجھے جگانا مت۔ تم نگو کو پارٹنر بنا لینا۔"

بخت خان کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

"نہیں ...... نہیں ...... مجھے کارڈز کھیلنا نہیں آتا۔"

"سیکھ لو۔"

"نہیں۔"

"کیوں ...... میرا پارٹنر بننا پسند نہیں؟"

"نہیں ...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ بہت شوق اور دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پہلی بار آج اس کے چہرے پر اتنی ملائمت اور نرمی دیکھی تھی۔

"پسند ہے؟" بخت خان نچلے ہونٹ کا کونا دبا کر شرارت سے مسکرایا۔

"کیا؟"

"میرا پارٹنر بننا۔"

"جی مگر وہ ...... وہ مجھے کھیلنا بالکل نہیں آتا۔ گھر میں صرف اماں ہوتی تھیں اور......"

"مگر میں کھیلنے کے لئے تو نہیں کہہ رہا۔" بخت خان کو اسے تنگ کرنے میں مزا آنے لگا تھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے بخت خان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

"میرا مطلب ہے لائف پارٹنر......" بغیر سوچے سمجھے یا کسی پیشگی ارادے کے بخت

خان کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا ...... مگر یہ ...... یہ کیسے ممکن ہے؟"

سُوئی اس کی انگلی میں چبھ گئی تھی۔ اس نے دبا کر خون کا قطرہ نکالا۔

"اوہ!" بخت خان ایک دم جھکا لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"ممکن کیسے نہیں؟" بخت خان ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اگرچہ بالکل غیر ارادی طور پر یہ اس کے منہ سے یہ نکلا تھا اور اس سے پہلے اس نے ایسی کوئی بات سوچی تک نہ تھی لیکن اب جب کہ بات اس کے لبوں سے نکل چکی تھی تو اسے محسوس ہوا جیسے یہ اس کے دل کی بھی خواہش ہو ...... جیسے یہ لڑکی سچ مچ اس کی زندگی میں نویدِ صبح بن کر آئی ہو۔ جیسے اس سے اچھی اور اس سے بہتر اور کوئی لڑکی اس کی زندگی کی رفیق نہیں ہو سکتی۔

"بس ...... ممکن نہیں۔" اس کی پلکیں لرز رہی تھیں اور رخساروں پر سرخی دوڑنے لگی تھی۔

"کیوں ...... میں بدصورت ہوں؟ ...... مجھ میں کوئی خامی ہے......؟"

"نہیں...... نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ تو بہت اچھے ہیں اور مجھے تو آپ......"

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا اور اس کا چہرہ مزید جھک گیا۔ رخسار مزید سرخ ہو گئے۔

اس نے کسی لڑکی کو اتنا شرماتے نہیں دیکھا تھا۔ آج کل تو لڑکیاں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آئی لو یو کہہ دیتی ہیں۔

"کہیے نا ...... بندہ ہمہ تن گوش ہے۔"

"وہ......"

"وہ کیا......؟"

"آپ اچھے لگتے ہیں ...... اچھے ہیں۔"

"اوہ تھینک یو ...... میں سمجھا تھا شاید آپ یہ کہنے والی ہیں کہ مجھے تو آپ اچھے نہیں لگتے۔"

"نہیں...... نہیں......" اس نے تردید کی۔ "آپ سب لوگ تو بہت اچھے ہیں۔ یہ گھر تو میری پناہ گاہ ہے اور اس گھر کے مکین اپنوں سے زیادہ اپنے ہیں۔ مجھے سب بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرے اختیار میں ہو تو......" اس کی آواز بھاری ہو گئی لیکن لاشعوری کوشش سے اس نے اپنے آنسوؤں کو روک کے رکھا۔

"بلال بھائی کا فون ہے۔" جواد نے آ کر اطلاع دی۔

"اوہ، اچھا......" بخت خان کھڑا ہو گیا لیکن جاتے جاتے اس نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔ یہ لڑکی اس کی آرزو بن چکی تھی۔ اس نے سوچا وہ جلدی ہی ماں جی سے بات کرے گا۔

نوید نے اس کی نگاہوں سے چھلکتی محبت کے احساس کو محسوس کیا اور اس کا دل بھر آیا۔

"کتنا پیارا...... کتنا اچھا بندہ ہے یہ......"

اور اگر زندگی بھر کے لئے اس کی رفاقت مل جاتی تو زندگی کتنی سہل ہو جاتی۔ یہاں اس گھر میں بو جی کے گھنے سائے تلے زندگی بتانا کتنی بڑی خوش قسمتی ہے ...... کاش، اماں نے جاتے جاتے اسے پابند نہ کیا ہوتا۔ اور پتہ نہیں کیسا ہے وہ بلال آفتاب...... طیب بھائی کی طرح نرم دل اور محبت کرنے والا یا مامی کی طرح سخت مزاج!

طیب بھائی کی بیماری پر وہ آیا تو تھا لیکن وہ تو کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھی اور خود شاید کسی نے بتایا تک نہیں تھا کہ اس کے گھر میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ کم از کم وہ اسے ماں کی موت پر افسوس ہی کر دیتا۔ ماموں کے بیٹے کی حیثیت سے ہی۔

پتہ نہیں مامی نے اس سے کیا کہا ہو گا۔

اس کے متعلق کیا بتایا ہو گا۔

شاید وہی ساری باتیں جو انہوں نے طیب بھائی سے کہی تھیں۔ تب ہی تو ...... تب ہی تو......

اور کیا خبر مامی اس بات کو تسلیم ہی نہ کریں ...... پھر...... پھر......

بخت خان کا سراپا اس کے تصور میں آ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس پر مایوسی طاری ہو گئی۔

ماموں نے آتے ہوئے بھی بو جی سے کہا تھا کہ وہ ان کے بلال کی امانت ہے۔

اسے یکایک احساسِ زیاں کا احساس ہوا۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑی خوشی کھو بیٹھی ہو...... جیسے کوئی بہت قیمتی شے اس کے ہاتھوں سے نکل گئی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جیسے دل میں کوئی چراغ سا جل اٹھا ہو۔

کسی محبت کا چراغ۔

"نہیں......"

اس نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔
نہیں ...... ایسا نہیں ہونا چاہئے۔
بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ بخت خان اچھا ہے ...... چاہے جانے کے قابل۔ لیکن میں......

بخت خان فون سن کر ادھر واپس آنے کی بجائے اندر بڑے بھائیوں کے پاس گیا۔

"آج بلال بھائی آئیں گے۔" جواد جو بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا، خود ہی بولا۔

"کون بلال؟" وہ چونک پڑی۔

"سنا ہے، وہ آپ کے سگے ماموں کے صاحبزادے ہیں اور آپ کو خبر تک نہیں۔"

"اوہ، اچھا......"

وہ پریشان سی ہوگئی۔

پتہ نہیں بلال اس کے متعلق یہاں کیا کہہ دے ...... پتہ نہیں، مامی نے اسے کچھ کہا ہے یا نہیں ...... مگر طیب بھائی کی بیماری کی کچھ وجہ تو بتائی گئی ہوگی۔ مگر کیا؟

"خیریت ...... آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔"

"آں ...... کچھ نہیں ...... اتنے دن ہو گئے مجھے یہاں رہتے ہوئے مگر پہلے تو وہ کبھی نہیں آئے۔"

"پہلے تو وہ بہت آتے تھے لیکن آج کل ایک تو کراچی کے حالات ہی اس طرح ہیں کہ بندہ بلاوجہ گھر سے نکلتے گھبراتا ہے۔ دوسرے وہ کچھ کام کے سلسلے میں غالباً کسی اور شہر میں گئے ہوئے تھے۔ چند ہفتے قبل ہی واپسی ہوئی ہے اور آتے ہی اشعر بھائی سے ملنے آئے تھے۔ اشعر بھائی کے گہرے دوست ہیں۔ آپ تب شاید یونیورسٹی میں تھیں۔" جواد نے تفصیل بتائی۔

"یہ اشعر بھائی کون ہیں ...... میں تو ان سے کبھی نہیں ملی۔"

"آ ہاہا......" جواد نے قہقہہ لگایا۔ "یہ بخت خان بھائی ...... دراصل ان کا اصل نام اشعر ہی تھا لیکن بخت خان، جنگ آزادی کے ہیرو ان کے آئیڈیل ہیں۔ وہ ان کو بہت آئیڈیلائز کرتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنا نام اشعر کے بجائے بخت خان رکھ لیا اور سب انہیں بخت خان ہی کے نام سے بلاتے ہیں۔"

"دیکھوں، امی کیا کر رہی ہے۔" نوید کھڑی ہوگئی۔ پتہ نہیں کیوں وہ بخت خان سے

گھبرا رہی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کی واپسی سے پہلے یہاں سے چلی جائے۔

"ضرور...... ضرور جائیے...... اور کہہ دیجئے گا کہ میں شدت سے منتظر ہوں۔"

وہ مسکرا دی۔

کچن میں اسماء کی مدد کرتے ہوئے بھی اس کا ذہن الجھا رہا۔ بخت خان کے تصور سے اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ تیز تیز ...... جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اور ساتھ ہی ایک مایوسی کا دھواں سا اندر پھیلنے لگتا تھا۔ اور اس کا ایسا نصیب کہاں کہ وہ ہمیشہ انہی محبتوں کے سائے تلے رہے۔

ایک دن پھر اسے اسی جہنم میں جانا ہوگا۔

وہی مامی کی تیز اندر تک اترتی نظریں ...... وہی زہر اگلتے ہونٹ ......

ماموں کی بے بس خاموشی ......

اور طیب بھائی محور خلوص۔

اور اس میں بلال آفتاب کا پتہ نہیں کیا کردار ہوگا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اسماء نے اجینوموتو کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

"ہوں ...... کچھ نہیں۔" وہ چونکی۔

"تم کچھ پریشان لگ رہی ہو بنّو؟"

"نہیں تو...... بس کچھ تھکن سی ہے۔"

"تو پھر ایسا کرو تم جا کر آرام کرو۔"

"میرا خیال تھا آج چھٹی تھی، کچن کا کام میں اور تم مل کر کر لیں۔ بھابھیوں کو آج آرام کرنے دیں۔"

"ہاں ...... یہ تو ٹھیک ہے مگر تمہاری طبیعت کچھ صحیح نہیں لگ رہی۔"

"نہیں ...... معمولی تھکن ہے۔ تم جا کر بھابی سے پوچھ آؤ، آج کیا بنانا ہے۔"

"ہاں جاتی ہوں۔ تم ذرا ٹیسٹ کرو اسے۔" اس نے ساس پین چولہے سے اتار کر کاؤنٹر پر رکھا۔

"جادی انتظار کر رہا تھا تمہاری اس ڈش کا...... اسے بھیج دو ٹیسٹ کرنے کے لئے۔"

"اچھا ...... بڑا اندیدہ ہے وہ۔"

اسماء ہنستی ہوئی باہر چلی گئی اور نوید کاؤنٹر پر بکھرے برتن سمیٹنے لگی۔

✱✩✱

خون میں لت پت یومِ آزادی آ کر گزر گیا تھا۔ لیکن فضائیں ابھی تک بوجھل تھ
پچاس سالہ تاریخ میں ایسا خونیں یومِ آزادی بھلا کب گزرا تھا؟

بوجی جاء نماز پر بیٹھتیں تو ان کے دعا کے لئے اٹھے ہاتھ دیر تک اٹھے رہتے ہاتھوں کے پیالوں میں آنسو گرتے رہتے۔ خاموش لبوں سے دعائیں نکلتیں۔

''کتنی قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا...... میرے مولا! تُو ہی اسے اس کی اور اس کے بچوں کی حفاظت فرما میرے مولا!''

چودہ اگست گزرنے تک چودہ لاشیں دریافت ہو چکی تھیں۔ عین چودہ اگست کو ملک میں چراغاں کیا جا رہا تھا، چھ نوجوانوں کی لاشیں گولیوں سے چھلنی خون میں پت ایک کوچ میں پڑی ملی تھیں۔

پتہ نہیں ان نوجوانوں کی کیا کیا امنگیں ہوں گی......

ماں باپ نے ان کے حوالے سے کیا کیا خواب دیکھے ہوں گے......

ان کی پیدائش پر دادا دادی نے کتنی خوشیاں منائی ہوں گی۔

پتہ نہیں یہ نوجوان گھر سے کیا سوچ کر نکلے ہوں گے۔

شاید جشنِ آزادی کی کسی تقریب میں شرکت کرنے......

شاید انہیں بھی کہیں نغمے پڑھنے ہوں گے...... چراغاں کرنا ہو گا...... جھنڈ لہرانے ہوں گے۔

مگر ان کے سارے خواب ان کی آنکھوں ہی میں مر گئے اور ملک دشمن عناصر انہیں اغواء کر کے صبحِ آزادی کے سورج کی پہلی کرن کو ہی خون رنگ کر دیا تھا۔

نوید کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں۔

کچھ کچھ اس نے اخبارات میں پڑھا تھا...... جن مظالم کے متعلق سنا تھا وہ سب آنکھوں سے دیکھ اور محسوس کر رہی تھی۔

محاصرہ ہوتے...... بے گناہوں کو گرفتار ہوتے...... چیزیں توڑتے، دھمکیاں د لوگ اس نے بھی دیکھے تھے۔

گھر سے یونیورسٹی تک آتے جاتے کیسے کیسے احساسات سے وہ دوچار ہو رہی تھی بوجی نماز سے اٹھتیں تو وہ ان کے پاس جا بیٹھتی۔

''بوجی! یہ سب کب تک ہوتا رہے گا؟...... کب یہ خون کی ہولی رُکے گی بو کب کراچی پہلے جیسا کراچی ہو جائے گا...... اس کی رونقیں زندہ ہو جائیں گی؟''

''دعائیں کیا کرو بیٹا!''

''دعائیں...... پتہ نہیں، دعاؤں میں بھی اثر کیوں نہیں رہا۔''

''جب کسی قوم میں برائیاں بڑھ جاتی ہیں تو اس قوم پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ یہ تو ہمارے گناہوں کی سزا ہے بیٹو! اللہ سے دعا کیا کرو، اللہ ہمیں معاف فرمائے۔''

''جی، بوجی!''

وہ اٹھتے بیٹھتے دعا کرتی رہتی۔

بڑے سے دوپٹے کے ہالے میں لپٹی وہ بخت خان کو بہت مقدس لگتی۔

معصوم اور سادہ دل لڑکی...... حب الوطنی کے جذبے سے سرشار۔

بہت دنوں سے چودہ اگست کی خونیں صبح کے بعد سے ہی گھر میں خاموشی مسلط تھی۔ سب سہمے سہمے تھے۔ حتیٰ کہ سعدی وغیرہ بھی شرارتیں نہیں کر رہے تھے۔ نہ تو وہ یونیورسٹی جا رہی تھی، نہ بچے سکول جا رہے تھے۔ ایک دو دن تو ہڑتالوں کی نذر ہو گئے تھے...... اب سکوت تھا۔ لیکن دلوں میں جیسے خوف سا رچ گیا تھا۔ ذرا سا دھماکا ہوتا تو سب کانپ جاتے۔ یونیورسٹی جانے کا موڈ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

صبح اس کی آنکھ حسبِ معمول بہت سویرے کھل گئی تھی۔ اسماء سو رہی تھی۔ وہ ایک ویکلی میگزین اٹھا کر باہر لان میں آ گئی۔ بند کمروں میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ میگزین کے پہلے ہی صفحے پر کوچ میں مرنے والے لڑکوں کی تصویریں تھیں۔

خون میں ڈوبے چہرے...... بے رنگ آنکھیں۔

اس نے گھبرا کر صفحہ پلٹ دیا۔

لوریاں سننے والا...... دھماکوں کی آواز سن کر گلابی ردا اوڑھ کر سو گیا تھا۔

نفرتوں کو ہدف دیکھ لینے کی مہلت ہی نہ تھی۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور میگزین بند کر کے گھٹنوں کے نیچے رکھ لیا۔ کہیں کوئی مید افزا بات نہیں تھی۔

اخبارات اور رسالے سب ایک ہی جیسی باتیں لکھتے تھے۔

پتہ نہیں کون لوگ ہیں یہ جو ملک دشمن ہو رہے ہیں۔ جنہیں سکون اچھا نہیں لگتا۔

اس نے ٹھوڑی اپنے گھٹنوں پر رکھ لی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

پتہ نہیں طیب بھائی کا کیا حال ہو گا...... اس کا دھیان اچانک ہی طیب بھائی کی رف چلا گیا۔

اور ماموں ...... کسی نے مڑ کر اس کی خبر تک نہیں لی تھی۔ طیب بھائی نے بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیسی ہے۔

'پتہ نہیں اُن کی طبیعت ٹھیک بھی ہوئی ہے یا نہیں۔' طیب بھائی کے لئے اس کا دل اُداس ہونے لگا...... 'کتنے شفیق اور مہربان سے لگتے تھے وہ ...... بالکل سگے بھائیوں کی طرح۔'

'اور پتہ نہیں اب زندگی میں کبھی ان سے مل بھی پاؤں گی یا نہیں......'

بلال ان سے کتنا مختلف لگتا تھا...... سنجیدہ سا۔

اس روز کھانے پر پہلی بار اس نے بلال کو دیکھا تھا۔

''یہ بلال بھائی ہیں......'' جواد نے اسے بتایا تھا۔

''اچھا......'' اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی۔ اچھا خاصا وجیہہ تھا۔ لیکن بخت خان سے باتیں کرتا ہوا وہ انتہائی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے ایک دو بار اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ بو جی نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ وہ بنو کو پہچان نہیں پایا۔

''بیٹا! تم بنو سے نہیں ملے ...... یہ بنو ہے، تمہاری پھوپھو زاد۔''

''اوہ......'' اس نے بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تو آپ ہیں بنو۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ اندر سے پانی پانی ہو گئی۔ یقیناً مار جی نے اس سے کچھ الٹی سیدھی لگائی ہوں گی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے اور نگاہیں جھک گئیں۔

''کیا آپ اس سے پہلے کبھی باجی سے نہیں ملے؟''

اسماء کو بے حد حیرت ہوئی تھی کہ وہ نوید کے سگے ماموں کا بیٹا تھا اور اس سے شاید پہلی بار مل رہا تھا۔

''ہاں ...... بس اتفاق نہیں ہوا۔ جب یہ فیصل آباد میں تھیں تو میں اپنی پڑھائی میں مصروف تھا۔ پھر کراچی آ گیا ...... اور کراچی میں ہی تھا تو یہ قصور آئیں ...... لیکن ملاقات نہ ہو پائی۔ خیر اب ہو گئی۔'' وہ پلیٹ میں سالن ڈالنے لگا۔

''ایسے موقعوں پر پتہ ہے کیا کہا جاتا ہے بلال بھائی؟''

''کیا......؟''

''یہ کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

''اگر خوشی نہ ہوئی ہو تو پھر بھی......؟''

''خیر......'' جواد نے نوید کی طرف دیکھا جس کا رنگ ایک دم سفید ہو گیا تھا۔

''بنو ایسی نہیں ہیں کہ کسی کو ان سے مل کر خوشی نہ ہو...... بلکہ......''

''بلکہ......'' بخت خان نے اس کی بات کاٹ دی۔ اسے بھی بلال کا اس طرح کہنا کچھ پسند نہ آیا تھا۔ ''یہ تو نوید صبح ہیں...... اور صبح کی خوش خبری دینے والے سے مل کر کون خوش نہیں ہوتا یار بلال!''

بلال نے بڑی عجیب سی نظروں سے بخت خان کو دیکھا۔

''بعض صبحیں بڑی ناخوشگوار بھی ہوتی ہیں۔''

اس نے زیر لب کہا تھا لیکن نوید نے سن لیا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک دم آنسوؤں سے بھر گئیں لیکن اس نے سختی سے ان آنسوؤں کو چھپا لیا۔

بو جی تاسف سے بلال کو دیکھ رہی تھیں۔

آفتاب نے تو ان سے کہا تھا کہ بنو ان کے بلال کی امانت ہے۔ جبکہ بلال کا رویہ انتہائی اجنبیت بھرا اور بیگانہ ہی نہیں بلکہ بے زاری کا اظہار کرتا ہوا بھی تھا۔ انہوں نے پاس بیٹھی نوید صبح کو دیکھا جو بڑی بے دلی سے نوالے اٹھا رہی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

''بنو، جاؤ تم ذرا قہوے کے لئے پانی رکھ دو۔''

نوید نے متشکر نظروں سے بو جی کو دیکھا۔ اسے وہاں بیٹھنا مشکل لگ رہا تھا اور اٹھنا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

''بو جی!'' بڑی بھابھی کو حیرت ہوئی۔ ''کھانے کے بعد قہوہ بن جاتا۔ بنو ابھی کھا رہی تھی۔''

''وہ کھانا کھا چکی تھی۔ صرف لحاظ سے بیٹھی ٹونگ رہی تھی۔''

بو جی بلال کو ٹوکنا چاہ رہی تھیں لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئیں۔ شاید بلال اس رشتے سے بے خبر ہے اور تاج بی بی نے اس کے کانوں میں زہر بھرا ہوا ہے۔ وہاں ایک رات کے قیام اور نوید کے فیصل آباد جانے کے فیصلے سے انہیں کچھ کچھ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا۔

قہوہ بھجوا کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ بلال کا رویہ تکلیف دہ تھا۔ اگرچہ بلال کو دیکھ کر اس کے دل میں کوئی گدگدی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی

تھی لیکن اس کا یہ معاندانہ رویہ چین ایبل تھا۔ جبکہ زندگی کا سفر اس شخص کے ساتھ تھا۔ وہ اماں کے فیصلے سے بغاوت نہیں کر سکتی تھی۔ بسترِ مرگ پر اماں کی اس آ خواہش کو وہ کچل نہیں سکتی تھی اور اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال ہی سو روح تھا جس کے دل میں نہ جانے کن کن غلط فہمیوں کے بیج ڈال دیئے گئے تھے۔

اس کا لہجہ ...... اس کا رویہ ...... اس کی نظریں سب بتا رہی تھیں کہ کہیں کچھ غلط ہو چکا ہے۔

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہی تھی۔

کچھ کھو جانے کا ملال ...... کچھ پا نہ سکنے کا دکھ ...... اور اس پر بلال کے ساتھ ز گزارنے کا تصور ...... اور بخت خان کی مہربان نظریں ...... کچھ کہتی ہوئیں ...... اٹ کرتی ہوئیں ...... اور وہ کس قدر مجبور تھی۔

رات بہت بے چینی سے کٹی تھی۔ پھر بھی وہ صبح جلدی اٹھ گئی تھی اور حسب مع باہر لان میں آ گئی تھی۔ ننگے پاؤں گھاس پر چلنا اسے اچھا لگ رہا تھا کہ اچانک سا سے بلال آ گیا۔ شاید رات وہ یہاں ہی رک گیا تھا اور اس کی طرح جلد اٹھنے کا عا تھا۔

"السلام علیکم ......" ایک دم سے اسے سامنے پا کر اس نے فوراً سلام کیا۔

بلال نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور ایک بہت گہری نظر اس پر ڈا

"آپ نے طیب بھائی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"میں نے کیا، کیا ہے؟" اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"یہ آپ خود زیادہ بہتر جانتی ہیں۔"

"مگر میں ......"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کی طرف توجہ دیئے بغیر اخبار اٹھانے گیٹ کی طر بڑھ گیا اور اخبار اٹھا کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس سامنے بن گیا تھا۔

'لیکن کچھ غلط ضرور کیا تھا ...... مگر کیا ......؟ مامی نے بلال کو کیا بتایا ہے؟ ...... شای کہ بلال بھائی میری وجہ سے بیمار ہوئے ہیں۔'

وہ چاہتی تھی کہ موقع پا کر بلال سے بات کرے اور اپنی پوزیشن کلیئر کر لے۔

اسے موقع ہی نہ مل سکا اور بلال واپس اپنے فلیٹ چلا گیا جہاں وہ دوستوں کے ساتھ

کر رہتا تھا۔ بو جی نے ہمیشہ کی طرح اسے روکا۔

"بلال بیٹا! وہاں کیا ہوٹلوں کا کھانے رہو گے ...... یہاں آ جاؤ۔"

"نہیں بو جی! جب گھر کا کھانے کو دل چاہتا ہے، آ جاتا ہوں۔"

"اب تو بجّو بھی یہاں ہے۔ اس کے لئے ہی آ جایا کرو۔ اس کا بھی دل گھبراتا ہے نئی جگہ پر۔" بو جی نے دانستہ اسے بجّو کی موجودگی کا احساس دلایا۔

"جی، کوشش کروں گا جلدی آنے کی۔"

اور اس رات جب وہ بو جی کو شب بخیر کہنے گئی تو بو جی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"بیٹا ...... ایک بات پوچھنی تھی۔"

"جی بو جی!"

"آتے ہوئے آفتاب نے ایک بات کہی تھی، کیا اس کا علم بلال کو بھی ہے ......؟"

"معلوم نہیں۔" اس کا سر جھک گیا۔

"تمہاری مامی اس رشتے پر خوش تھیں؟ برا نہ ماننا بیٹی! میں تاج کے مزاج کے پیشِ نظر پوچھ رہی ہوں۔"

"پتہ نہیں بو جی! یہ تو اماں کے آخری لمحوں میں ماموں نے ان سے کہا تھا" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"اچھا ...... اچھا ...... فکر نہ کرو۔ میں مناسب موقع دیکھ کر بلال سے بات کروں گی۔ کسی طریقے سے اس کے کان میں بات ڈال دوں گی۔ آج کل کے بچے مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ مجھے آفتاب پر حیرت ہوتی ہے، اتنا پڑھا لکھا، سمجھ دار ہو کر اس نے بیٹے سے ذکر تک نہیں کیا۔ مجھے لگتا ہے کہ بلال کو اس کی خبر نہیں۔ آفتاب کو چاہئے تھا فوراً اس سے ذکر کرتا۔ آج کل کے بچوں پر اگر کوئی فیصلہ مسلط کیا جائے تو چڑ جاتے ہیں۔ خیر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلال بہت تابعدار اور سمجھدار لڑکا ہے۔ اور پھر میں ہوں نا، تمہاری ماں۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

'اور اب بو جی کو کیا پتہ کہ بات صرف اتنی سی نہیں ہے ...... بات کچھ اور ہی ہے۔ اور جانے مامی جی نے اسے کیا کیا کچھ بتا رکھا ہے اور مامی جی کی بلاوجہ کی دشمنی اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ بعض لوگ کیسے بلاوجہ دشمنیاں پال لیتے ہیں ...... بلاوجہ نفرتیں کرتے ہیں۔'

اس نے تو ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا ...... حالات اسے ان کے گھر لے آئے تھے۔ اور

کیا تھا اگر مامی جی اسے کھلے دل سے ملتیں..... شفقت سے اسے گلے لگا لیتیں۔ اس کا کون تھا ماموں کے سوا؟

"نویدِ صبح....." بخت خان نے ہولے سے اسے پکارا تو وہ ایک دم چونک پڑی۔

"آپ....."

"بیٹھی رہو..... تم بہت جلد جاگتی ہو۔" وہ اس کے سامنے ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ "کیا کر رہی تھیں؟" اس کی نگاہوں کی تپش سے وہ بہت پزل ہو رہی تھی۔

"تم لوگ یونیورسٹی جانا کب شروع کرو گی؟ یہ ہنگامے تو اب زندگی کا حصہ بن گئے ہیں۔ آخر کب تک گھر بیٹھا جا سکتا ہے؟"

"جی..... ہم کل سے جائیں گے۔ آج اسماء کا موڈ نہیں تھا۔"

"یہ کیا پڑھ رہی تھیں؟" بخت خان کی نظر اس کے گھٹنوں تلے دبے میگزین پر پڑی۔

"کچھ نہیں....." وہ گھبرا گئی کہ کہیں اس روز کی طرح وہ غصے میں نہ آ جائے۔

بخت خان نے میگزین اٹھا لیا۔ بے اختیار اس نے میگزین اٹھا لینا چاہا تو اس کا ہاتھ بخت خان کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"آپ..... آپ یہ مت پڑھیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے، وہی پرانی خبریں ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"اچھا....." بخت خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "طبیعت بھی خراب ہو جائے تو تمہیں کیا؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ اور بو جی پریشان ہو جائیں گی۔" اس نے میگزین لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"نویدِ صبح!" بخت خان کی آنکھوں میں ایک پُرسوز کیفیت تھی۔ "مت پڑھا کرو میگزین..... دل دُکھتا ہے سب پڑھ کر..... سب دیکھ کر۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا..... کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی کہ کیا کریں، کدھر جائیں..... کس کو مجرم گردانیں..... کون مجرم ہے..... شاید کوئی تیسرا ہاتھ ہے جو پاکستان کی بیخ کنی کر رہا ہے اور اس کی یہ حرکت ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم۔ لیکن وہ تیسرا ہاتھ کس کا ہے، کہاں ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

"ایسے لوگ ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہئے۔" نوید نے بخت خان کو تسلی دی۔

"ہاں..... امید ہی تو ایک سہارا ہے نویدِ صبح! میرا دل چاہتا ہے کچھ کروں۔ لیکن

کیا..... یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کر سکتا ہوں میں، زیادہ سے زیادہ یہی کہ میں بھی کسی انجان سمت سے آنے والی گولی کا نشانہ بن جاؤں۔" اس نے میگزین اسے واپس کر دیا۔

"مایوسی گناہ ہے بخت خان!"

وہ جو ابھی لمحہ بھر پہلے اس کی موجودگی سے گھبرا رہی تھی اب اسے اتنا شکست خوردہ دیکھ کر ایک دم با اعتماد ہو گئی تھی اور اس کی وہی دلاسہ دینے والی، دوسروں کو حوصلہ دینے والی حس جاگ اٹھی تھی۔

"جس خدا نے یہ اتنا پیارا وطن دیا ہے، وہی اس کی حفاظت بھی کرے گا..... پلیز بخت خان! اب کچھ نہیں ہو گا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ملک دشمن عناصر ایک روز خود ہی اپنی موت مر جائیں گے۔"

اس نے پورے یقین سے کہا تو بخت خان کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔

"انشاء اللہ..... نویدِ صبح! تم زخموں پر مرہم رکھنے کا ہنر جانتی ہو۔ تمہارے اندر مایوسی کے اندھیرے میں امید کا چراغ جلانے کا حوصلہ ہے اور تم ایسا کر سکتی ہو۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو سوچا تھا کہ تم یقیناً ہمارے لئے نیک شگون ہو..... اندھیرے میں روشنی کا دیا..... مایوسیوں میں امید کا چراغ.....

نویدِ صبح! میں بہت سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ میرے پاس بہت سارے خوبصورت لفظ نہیں۔ شاید میں صحیح طریقے سے اپنا مدعا بھی بیان نہ کر سکوں لیکن میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ اگر زندگی کے سفر میں مجھے تمہاری ہمراہی کا شرف مل جائے تو میں دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ایک ہوں گا۔"

بخت خان کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں جس پر رنگوں کی بارش سی ہو رہی تھی۔ گھنی پلکیں لرز رہی تھیں..... بخت خان جیسے شخص کی رفاقت اور بو جی کی شفقت کے سائے..... اس سے بڑھ کر اور کیا تمنا کی جا سکتی تھی۔

اور یہ سب اُسے بن مانگے مل رہا تھا۔ اس کی زندگی میں تو ہمیشہ ہی بے وقت سب کچھ ہوا۔

اور کیا تھا اگر اس شخص کا سہارا اماں کی زندگی ہی میں مل جاتا..... ماموں سے کوئی عہد کرنے سے پہلے ہی۔ مگر اب.....

اُس نے بے دردی سے ہونٹ کاٹے..... 'کچھ لوگوں کی سزا شاید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ چند دن جو رہائی کے ہیں، بہت جلد بیت جائیں گے۔'

''تم بہت پیاری ہو ...... میری بے رنگ زندگی میں سچ مچ صبح کے حسین رنگوں کی نوید...... مجھے قسم ہے اس خوبصورت صبح کی ...... ان ٹھنڈی ہواؤں کی اور اس پاک فضا کی۔ کہ تم سے پہلے اس دل کی بستی بالکل خالی تھی...... اس دروازے پر پڑنے والے پہلے ہاتھ تمہارے ہیں۔ میرے دل کے اس بند کمرے میں پہلا قدم تمہارا ہے۔ اور مجھے قسم ہے اپنے پاک وطن کی کہ میں اپنے جذبوں میں بہت سچا اور مخلص ہوں اور میں کوشش کروں گا کہ تمہاری محرومیوں کا ازالہ کرسکوں ...... تمہاری ان ہر وقت بھیگی رہنے والی آنکھوں کی قسم، میں کوشش کروں گا کہ کبھی ان آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔''

چھم چھم اس کی آنکھیں برس پڑیں۔ اتنی دیر سے وہ جن آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ بے اختیار ہو گئے تھے۔

''کیوں رو رہی ہو؟'' وہ مضطرب سا ہو گیا مگر وہ روئے چلی گئی۔

''میری باتیں بری لگی ہیں ...... میری رفاقت قبول نہیں؟''

اس نے روتے روتے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر بے وقوف لڑکی! خوشیوں کا رو کر نہیں، ہنس کر سواگت کیا جاتا ہے۔ پھر پتہ ہے کہ تم بھی مجھے ...... اچھا بتاؤ کیا میں تمہیں برا لگتا ہوں؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''مگر...... وہ......''

''تو پھر اگر مگر کیا......؟'' بخت خان کی آنکھوں میں شریر سی مسکراہٹ اور چمکیلی آنکھوں میں محبت تھی۔ ''ایک تم لڑکیوں میں یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے کہ ہر بات میں اگر مگر۔''

''مگر......'' اس نے بتانا چاہا کہ وہ اماں کے عہد کی پابند ہے لیکن اسی وقت مظہر خان نے کمرے سے باہر آ کر بخت خان کو آواز دی۔

''بخت خان! آج تمہیں انٹرویو کے لئے جانا تھا۔ تم تیار ہو جاؤ، میں تمہیں راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔''

''جی بھائی جان!''

''اور سنو، اگر کچن میں کوئی ہے تو اسے ناشتے کے لئے کہہ دو۔''

''میں ناشتہ بنا دیتی ہوں۔'' وہ آنسو پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں ناشتے میں صرف ایک کپ چائے اور دو سلائس لیتا ہوں۔'' بخت خان نے اطلاع دی۔

''مجھے معلوم ہے۔''

''اوہ، ابھی سے میرے متعلق ساری خبریں رکھتی ہو۔'' بخت خان ہنسا۔

اس نے مڑ کر کچھ کہنا چاہا لیکن ذرا فاصلے پر کھڑے مظہر خان کو دیکھ کر بنا کچھ کہے تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☼☆☼

''بیٹا! اب تو تمہاری جاب بھی لگ گئی ہے۔ اگر تم کہو تو تمہارے لئے کوئی لڑکی دیکھیں؟'' بو جی نے محبت و شفقت سے بخت خان کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔ وہ بہت دیر سے بو جی کی گود میں سر رکھے، آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

''لڑکی دیکھنے کی کیا ضرورت ہے ماں جی!'' اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر بو جی کی طرف دیکھا۔

''کیوں ...... کیا ساری زندگی شادی نہیں کرے گا؟''

''نہیں ...... یہ میں نے کب کہا؟ میں تو کہہ رہا ہوں، لڑکی موجود ہے۔ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''کون؟'' بو جی اس کا اشارہ نہیں سمجھ سکیں۔

''نوید صبح۔'' اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

''نہیں۔'' انہوں نے بے اختیار اس کا سر اپنے گھٹنوں سے ہٹایا تو وہ بھی ایک دم اٹھ بیٹھا۔

''کیوں نہیں ...... کیا خرابی ہے اس میں؟''

''بیٹا! اس کے ماموں نے مجھے اس کی ذمے داری سونپی ہے۔ بن ماں باپ کی بچی ہے۔''

''ماں باپ کا نہ ہونا کوئی جرم ہے کیا؟'' اس کے لہجے کی تلخی لوٹ آئی۔ ''حیرت ہے ماں جی! کہ آپ بھی ایسا سوچتی ہیں۔''

''بخت خان! پوری بات تو سن لو میری جان! اس کے ماموں نے مجھے تاکید کی تھی کہ یہ میری امانت ہے ...... بلال کی امانت۔''

''وہاٹ......؟'' بخت خان کو بے انتہا حیرت ہوئی۔ ''بلال نے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔ پھر بلال تو......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے بلال کو اس بات کا علم نہیں ہے۔''

"کمال ہے......" اس کا لہجہ ہنوز تلخ تھا۔ "جس لڑکے کے ساتھ عمر بھر کا بند باندھا گیا ہے، اسے علم ہی نہیں۔ اس کا مطلب ہے نوید صبح کو بھی علم نہیں ہوگا۔"

"بیٹا! خالدہ نے مرنے سے کچھ دیر پہلے بیٹی کا ہاتھ بھائی کے ہاتھ میں دیا تھا آفتاب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بلال کے ساتھ بیاہے گا۔ تاج بھابی کا مزاج کچ ہے...... سسرال والوں کو بھی اس نے پسند نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آفتاب ابھی تک بلال سے بات نہیں کر پائے ہوں گے۔ مگر انہوں نے مجھے احتیاطاً بتا دیا تھا۔"

"مگر...... مگر یہ زیادتی ہے ماں جی!" اس نے مٹھیاں بھینچیں۔ "بلال تو......"

"اب کے بلال آیا تو میں اس کے کانوں میں یہ بات ڈال دوں گی۔"

بخت خان خاموش رہا۔ اس کے اندر ایک دم ٹوٹ پھوٹ سی شروع ہوگئی سارے خواب آنکھوں میں مر گئے تھے۔ بو جی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

یہ بخت خان نے کب، کس وقت اس لڑکی کو اپنے دل میں بٹھا لیا تھا؟ نوید صبح اُ بھی بہت پسند تھی۔

بو جی نے ایک گہری سانس لی۔ اگر انہوں نے وقار کو دودھ نہ پلایا ہوتا تو ا بخت خان کے لئے لڑکی ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن وقار کو دودھ پلا وجہ سے وقار کے چھوٹے بہن بھائی بخت خان کے دودھ شریک بہن بھائی بن تھے۔

بخت خان اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

یہ کیا ہوا تھا...... ابھی چند لمحے پہلے ہی تو ان پر انکشاف ہوا کہ یہ لڑکی اس کے کے کھلے دروازوں سے اندر آ بیٹھی ہے اور اس کے بغیر زندگی کا سفر بالکل بے رنگ اور ابھی...... ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کے بغیر ادھورا

پھر یہ کیا ہوا تھا۔

زندگی ایک دم بے رنگ ہوگئی تھی۔

ابھی تو بہت کچھ کہنا تھا۔ بہت کچھ سننا تھا۔

وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر نوید صبح پر پڑی۔ وہ شاید بھابی کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

"نوید صبح!" اس نے آہستگی سے پکارا۔

نوید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں جگنو سے لہرائے اور پھر یک دم ساری روشنیاں ماند پڑ گئیں اور اس نے نظریں جھکا لیں۔

"جی......"

"نوید صبح! تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم بلال سے وابستہ ہو۔ تم بتا دیتیں تو شاید ہم اتنا آگے نہ بڑھتے۔ میں اپنی آنکھوں میں خواب نہ سجاتا...... تمہیں یوں دن رات نہ سوچتا...... یہ آگہی کتنی اذیت ناک ہے نوید صبح! تم اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتیں۔ اپنے آپ کو یہ باور کرانا کہ تم کسی اور کی امانت ہو اور تمہارے حوالے سے جو خواب میں نے دیکھے تھے سب جھوٹے تھے، کس قدر تکلیف دہ اور مشکل ہے۔ تم نے بتا دیا ہوتا تو میں پہلے ہی قدم پر خود کو روک دیتا۔"

"میں......" نوید کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

"ہاں...... شاید تمہیں بھی پتہ نہ ہو۔ سوری، میں نے انجانے میں تمہیں بھی دُکھی کیا ہے نوید! مجھے معاف کر دینا۔" اس کی آواز بھرا گئی تو اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا مگر پھر ایک قدم اٹھا کر پلٹ آیا۔

"نوید صبح!" اس نے ساکت کھڑی نوید کو آہستہ سے پکارا...... "تم...... کیا تمہارے دل میں بلال کے لئے کوئی جگہ ہے؟ آئی مین تم پسند کرتی ہو بلال کو؟"

"میں نے اُس روز بلال کو پہلی بار دیکھا ہے اور......"

"اس کا مطلب ہے کہ......" بخت خان کے اندر اُمید کا ننھا سا دیا جل اٹھا۔ "نوید صبح! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم...... تم ماموں جان سے کہہ دو کہ تم بلال سے شادی نہیں کر سکتیں...... پلیز!"

"نہیں...... بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟" نوید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

دمِ مرگ اماں کی کی جانے والی خواہش کے لئے تو وہ جان بھی دے سکتی تھی۔ کاش...... اے کاش! بخت خان کے دل میں اس کا خیال پیدا نہ ہوتا۔ پتہ نہیں کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بندے کے دل میں انہونی خواہشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جب انہیں پورا ہی نہیں ہونا ہوتا تو پھر یہ پیدا ہی کیوں ہوتی ہیں؟

رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے، دن میں کام کرتے ہوئے، کتاب سامنے کھولے، ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے اس نے کتنی بار بخت خان کو سوچا تھا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ بخت خان اس کا مقدر نہیں بن سکتا۔ بلکہ اماں اس کی زندگی کا فیصلہ کر گئی تھیں اور ماموں جان

بہر حال جیسے بھی ممکن ہوا اُس فیصلے پر عمل کریں گے۔ بھلے مامی کتنا ہی شور کیوں نہ مچائیں۔

بخت خان لمحہ بھر اسے دیکھتا رہا پھر خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف پلٹ گیا۔ نوید صبح بھی بڑی بھابھی کی طرف جانے کی بجائے واپس اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ دل پر ایک دم ایک بوجھ سا آ پڑا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ اس نے اپنے ساتھ بخت خان کو بھی دُکھی کر دیا تھا۔ کاش وہ اسی لمحے جب پہلی بار بخت خان نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا، بتا سکتی کہ وہ کسی اور کی امانت ہے۔

کمرے میں آ کر وہ لیٹ گئی۔ اسماء نے ایک دو بار آ کر پوچھا بھی کہ وہ اس طرح کیوں لیٹی ہے مگر اس نے دردِ سر کا بہانہ کیا اور آنکھیں موندے لیٹی رہی اور سوچتی رہی کہ کبھی کبھی قسمت بھی آدمی کے ساتھ کیا کیا مذاق کرتی ہے۔

بلال آفتاب اسے شاید بلکہ یقیناً پسند نہیں کرتا تھا۔

تاج مامی بھی اسے بہو کی حیثیت سے قبول نہیں کریں گی اور اس کی ازدواجی زندگی کی کشتی ہمیشہ طوفانی لہروں پر ڈولتی رہے گی۔ ہمیشہ اسے ڈوبنے کا خطرہ رہے گا۔ اس صورت میں اور زیادہ جبکہ بلال کے دل میں پہلے سے اس کے متعلق شکوک ہیں۔

بخت خان اسے پسند کرتا تھا۔

بو جی محبت کرتی تھیں اور بخت خان کے ساتھ یقیناً وہ ایک خوش گوار اور خوش کن زندگی گزار سکتی تھی لیکن اس کے مقدر کے ستارے بخت خان کے ستاروں سے نہیں ملتے تھے۔

آنسو بار بار اس کی آنکھوں میں آ جاتے جنہیں وہ بار بار پونچھتی رہی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس لئے وہ شام ہونے پر باہر نہیں نکلی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اس نے اسماء سے کہہ دیا تھا کہ چونکہ اسے بھوک نہیں ہے اس لئے کھانے کے لئے اسے نہ جگایا جائے۔ وہ ٹیبلٹ لے کر سونے لگی ہے۔

باہر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہر چند کہ وہ سونے کی بہت کوشش کر رہی تھی مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ ذہن بے حد تھک گیا تھا اور وہ سونا چاہتی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تا کہ بو جی سے نیند کی گولی لے لے۔ بو جی کبھی کبھار والیم ٹو استعمال کرتی تھیں۔ باہر سے چونکہ مسلسل آوازیں آ رہی تھیں اس لئے اس نے خود بو جی کی طرف جانے کا ارادہ

ملتوی کر دیا تھا۔ امی آئے گی تو اس سے منگوا لوں گی۔

ایک گہری سانس لیتے ہی وہ پھر لیٹنے ہی لگی تھی کہ اسماء آ گئی۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔

''بنو!''

''کیا ہوا امی ...... تم رو رہی ہو؟'' وہ یک دم اٹھ گئی۔

''بنو فہدی نہیں ہے گھر پر۔ دوپہر کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا ہی تھا کہ چوکیدار نے بتایا کہ باہر کوئی اسے بلا رہا ہے۔ وہ میرے سامنے ہی باہر چلا گیا تھا پھر مڑ کر نہیں آیا۔''

نوید نے سامنے گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج رہے تھے......

''اتنی دیر ہو گئی۔ وہ پہلے تو کبھی اتنی دیر گھر سے غائب نہیں رہا۔'' وہ بھی پریشان ہو گئی۔

''بنو!'' اسماء ایک دم ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

''پلیز ...... پلیز امی! حوصلہ کرو نا۔ ابھی آ جائے گا'' نوید نے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے۔ ''شاید کسی دوست کی طرف چلا گیا ہو۔''

''نہیں، جاوی اس کے سارے دوستوں کے ہاں سے پتہ کر کے آیا ہے...... بنو! ایک کپ چائے تو پلا دو......'' اسماء کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ ''اور دیکھو، بو جی کے کمرے سے کوئی پین کلر مل جائے تو لیتی آنا۔''

''اچھا۔'' وہ چائے کا پانی رکھ کر بو جی کے کمرے کی طرف آئی مگر دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ شاید بلال تھا۔ اس کی آواز قدرے اونچی تھی۔

''یہ ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بو جی؟ نوید اور میں...... نہیں بو جی، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''بیٹا! تمہارے باپ نے آتے سمے مجھے کہا تھا کہ یہ میرے بلال کی امانت ہے۔''

''نو ...... نیور ...... امپاسیبل۔'' اس کے لہجے میں سختی تھی۔

''لیکن بیٹا ...... تمہارے باپ نے مرتی ہوئی پھپھو سے وعدہ کیا تھا'' بو جی کی آواز دھیمی تھی لیکن وہ دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔

''مگر ابا نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا بو جی! اور نہ ہی ماں نے۔ بلکہ اماں تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھیں۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز اتر آیا تھا۔

"کیا......؟"

"میں ابھی ...... آج ہی ابا سے بات کرتا ہوں۔"

"بیٹا ...... نوید بہت اچھی لڑکی ہے ...... بہت سمجھ دار، پڑھی لکھی ہے۔ محبت کرنے والی ہے۔"

"ٹھیک ہے بو جی! مگر میں ...... میں کسی اور سے وعدہ کر چکا ہوں۔ میں ڈاکٹر فرح سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میری اس سے کمٹ منٹ ہے۔ میں آج اس لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ ابا سے بات کریں۔ میں تو بہت پہلے آپ سے یہ سب کہنا چاہتا تھا لیکن پھر فہدی کی پریشانی کی وجہ سے بات نہیں کر سکا۔ آج بھی مجبوراً بات کی ہے آپ سے۔ کیونکہ فرح کے والدین مزید انتظار نہیں کر سکتے۔"

"مگر بیٹا......"

"پلیز بو جی! مزید کچھ نہ کہیں۔ میں اگر فرح سے شادی نہ بھی کرتا تو بھی میں اس لڑکی سے شادی ہرگز نہ کرتا۔"

"کیوں بیٹا؟"

اور باہر کھڑے نوید ساری جان سے لرز گئی ...... 'تو اب بو جی کی نظروں میں بھی بے بھرم ہو جاؤں گی۔ پتہ نہیں یہ شخص ...... یہ ظالم شخص کیا کہنے والا ہے ...... لیکن میں اتنی آسانی سے خود کو ان سب کی نظروں میں نہیں گرنے دوں گی۔ میں بتا دوں گی جی کو لفظ لفظ، حرف حرف ...... پھر جو بھی ہو۔'

"کچھ نہیں بو جی! بس یہ مجھے اس روپ میں اچھی نہیں لگتی۔"

'اوہ......' اس نے ایک لمبا سانس لیا اور وہیں سے پلٹ آئی۔ 'تو وہی ہوا جس کا خدشہ تھا ...... پتہ نہیں کیوں اس کے دل کو پہلے ہی یقین تھا کہ بلال اسے ٹھکرا دے ...... رد کر دے گا ...... اور وہ ڈاکٹر فرح شاید بہت خوبصورت رہی ہو گی۔'

اس رات اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے سوچا اور اپنے دل کو ٹٹولا۔

اندر کہیں کسی دُکھ کی چبھن نہ تھی۔

کوئی ملال نہ تھا ...... بلکہ عجیب سا سکون تھا۔ لیکن پھر بھی سونے سے پہلے اس نے کوئی سو مرتبہ سوچا۔

'تو بلال اور ڈاکٹر فرح۔'

'ڈاکٹر فرح اور بلال۔'

اُس روز بڑے دنوں بعد وہ بہت سکون سے سوئی۔

صبح وہ باتھ لے کر باہر آئی تو حسبِ معمول اخبار کے انتظار میں بخت خان کوریڈور میں بیٹھا تھا۔

"السلام علیکم!" وہ اس کے پاس ذرا کی ذرا رکی۔

"وعلیکم السلام۔" بخت خان نے نظریں جھکا لیں۔ "تم لوگ کب تک گھر بیٹھے رہو گے؟ یونیورسٹی جاؤ۔ اسماء کا بھی دل بہل جائے گا۔"

'جی ...... آج ہم یونیورسٹی جائیں گے۔' نوید صبح نے ایک نظر اسے دیکھا ...... بہت تھکا تھکا اور مضمحل سا لگ رہا تھا۔

"چائے لیں گے؟"

"یس پلیز۔"

نوید کا دل چاہا وہ اسے بتائے ...... بتا دے کہ بلال اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ شاید اس کے دل پر دھرا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ لیکن پھر کچھ کہے بنا وہ کچن کی طرف مُڑ گئی۔

'یہ زندگی بھی عجیب شے ہے۔'

بخت خان نے اس کے گھنے بالوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس کے بال اس کی پشت پر بکھرے تھے۔ شاید وہ ابھی ابھی باتھ لے کر آئی تھی......

'جو نہیں ہونا چاہئے وہ ہو جاتا ہے۔ اور جس ہونے کو ہم ترستے رہ جاتے ہیں، وہ نہیں ہوتا۔'

اس نے کبھی دھیان سے نوید صبح کو نہیں دیکھا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی رفاقت کی خواہش اتنی شدت سے اس کے اندر پیدا ہو گی کہ فہدی کی پریشانی کے باوجود بھی کبھی وہ بے چین ہو جاتا۔

اس کی محبت سے دستبردار ہونا بھی مشکل تھا اور پرائی چیز پر نظر رکھنا بھی زیب نہیں دیتا تھا۔

اور یہ کتنی مشکل آ پڑی تھی اس پر۔

بخت خان پر جو ایسی محبتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

جس کے نزدیک یہ محبتیں محض افسانوں اور کہانیوں میں نظر آتی تھیں۔ زندگی اتنی تلخ اور مصروف ہے کہ ایسی باتوں کے لئے وقت ہی کہاں ملتا ہے۔

لیکن اب وہ خود اس عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

ایک بالکل سادہ سی، عام سی لڑکی اس کے دل پر قابض ہو گئی تھی۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی سوچے چلا جاتا۔

اس کے خیال کو جھٹک کر اس نے پاس پڑی چھوٹی ٹیبل سے ایک میگزین اٹھا لیا۔ وقار اور مظہر علی خان یہ میگزین منگوایا کرتے تھے۔ نوید چائے لے کر آئی تو وہ میگزین میں کھویا ہوا تھا۔

''چائے پلیز۔''

''تھینک یو!'' اس نے چونک کر سر اٹھایا اور کپ لے لیا۔

***

زندگی ایک بار پھر معمول پر آ گئی تھی۔

شاید اب کراچی کی سڑکوں پر کوئی لہو نہیں بہے گا...... وہ بڑی پُر اُمید تھی۔

بخت خان اس کی باتوں پر مسکرا دیتا۔

''دُعا کرو نویدِ صبح! کہ ایسا ہی ہو۔''

وہ باقاعدگی سے یونیورسٹی جا رہی تھی۔ بچے بھی سکول جا رہے تھے۔ فہدی کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اپنے اپنے طور پر سب ہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ لیکن ایک امید تھی جو کبھی کبھی اس کے ہونے کا احساس دلاتی تھی۔

''بنو!'' اسماء آنسوؤں میں مسکراتی۔ ''کیا خبر کسی دن اپنا فہدی بھی دہشت گرد بن کر جائے اور نہ جانے اس کے ہاتھوں کتنے معصوموں کا، بے گناہوں کا قتل ہو جائے۔''

''لیکن اگر ایسا ہوا تو میں خود اسے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گا۔'' بخت خان بہت جلد غصہ آ جاتا تھا۔ ''میں وطن سے غداری کرنے والوں کو معاف نہیں کر سکتا۔''

''اور میں آپ سے گِلہ نہیں کروں گی۔'' اسماء رو پڑتی۔

گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ کبھی تو بالکل نارمل لگتا۔ ٹی وی دیکھا جاتا۔ حسبِ معمول رات کو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر گپ شپ لگائی جاتی۔ بچے اپنی گیمز کھیلتے اور کبھی ایک دم اتنی خاموشی اور سکوت چھا جاتا جیسے ابھی ابھی کسی کا جنازہ اٹھا ہو۔ وقفے وقفے سے اسماء کی سسکیاں سنائی دیتیں۔ بو جی اپنی نمازیں لمبی کر دیتیں۔ بخت خان کوریڈور میں زخمی شیر کی طرح اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہتا۔

اور جواد، فواد کی تصویریں نکال کر بیٹھ جاتا۔

''بنو! دیکھو، یہ فہدی اور میں ہوں...... یہ ہماری برتھ ڈے کی تصویر...... یہ سکول کی فیرویل کی...... یہ پرائز ڈسٹری بیوشن کی......''

اور وہ کئی بار کی دیکھی ہوئی تصویریں انہماک سے دیکھتی اور آنسو اندر ہی اندر اس کا حلق بھگوتے رہتے۔

اس روز بھی ایسا ہی دن تھا۔ اسماء اپنے کمرے میں گھٹنوں پر سر رکھے چپکے چپکے رو رہی تھی۔ بو جی کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ کسی بزرگ نے فہدی کے لئے یہ وظیفہ پڑھنے کو کہا تھا۔ بڑی بھابھی بچوں سمیت اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ چھوٹی بھابھی اور بچے آرام کر رہے تھے۔ مظہر خان اور اطہر خان اور وقار و بخت خان اپنے اپنے دفتروں میں تھے۔ جواد ابھی کالج سے نہیں آیا تھا اور وہ کوریڈور میں بخت خان والی مخصوص کرسی پر خالی الذہن سی بیٹھی تھی کہ اچانک اس نے گیٹ سے آفتاب ماموں کو آتے دیکھا۔

''ماموں جان!'' وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ ہمیشہ کی طرح آنسو بڑی جلدی اس کی آنکھوں میں آ گئے لیکن اس نے سخت لاشعوری کوشش سے انہیں روکا۔ ''وہاں سب ٹھیک ہیں نا...... مامی جی، طیب بھائی اور اویس......''

''سب ٹھیک ہیں۔'' آفتاب ماموں نے اسے الگ کرتے ہوئے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جو چمک، روشنی اور شگفتگی تھی اس نے انہیں یقین دلایا کہ وہ مطمئن اور خوش ہے۔

''بیٹا...... خوش تو ہو نا؟''

''جی ماموں جان...... یہاں سب لوگ بہت اچھے، مہربان اور محبت کرنے والے ہیں۔ بو جی میں تو اماں کی جھلک نظر آتی ہے۔''

''بیٹا...... میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ بس وہ تاج کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔''

''نہیں ماموں جان! میں تو بہت خوش ہوں یہاں۔ اور میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی لے لیا ہے۔ اماں کی خواہش تھی کہ ایم۔اے ضرور کروں۔ اماں کی روح خوش ہو گی۔'' وہ ان کا ہاتھ پکڑے انہیں بو جی کے پاس لے آئی۔

آفتاب ماموں، فہدی کے کھو جانے کا سن کر آئے تھے۔ بیماری کی وجہ سے وہ پہلے نہیں آ سکے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے بو جی کو یاد دلایا کہ بنو ان کی امانت ہے اور وہ بہت جلد اسے رخصت کروا کر لے جائیں گے۔

''میں تو چاہتا تھا کہ اسے جلد رخصت کروا کے لے جاؤں۔ مگر پتہ نہیں کیوں بلال

فی الحال شادی پر رضامند نہیں ہو رہا...... جب بھی شادی کی بات کرتا ہوں، ٹال دیتا ہے۔''

''آفتاب......'' بو جی نے نرمی سے کہا۔''غصے میں مت آنا......تم سے ایک بات کہوں۔ بلال بنّو سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ وہ کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر ہے وہ۔ فرح ہے نام اس کا۔''

''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے بو جی؟ میں نے خالدہ سے مرتے دم وعدہ کیا تھا، بلال کی شادی بنّو سے ہی ہوگی۔''

''بلال کی مرضی نہیں ہے آفتاب! جوان بچوں سے زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ اول تو بلال مانے گا ہی نہیں اور اگر مان بھی گیا تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے محسوس کیا ہے آفتاب! کہ بلال کے اندر حد سے زیادہ خود اعتمادی ہے۔ وہ اپنے فیصلے خود کر سکتا ہے اور اس پر عمل بھی کرسکتا ہے۔''

''آپ سے اس نے کہا تھا بو جی؟''

''ہاں...... اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر فرح کے سلسلے میں، میں تم سے بات کروں۔ لیکن فہدی کی پریشانی کی وجہ سے تمہیں فون نہ کرسکی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ جوان بچوں پر ہم اپنے فیصلے نہ ٹھونسیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بو جی...... لیکن خالدہ......''

''خدا بہتری کرے گا...... بنّو کے لئے اچھے لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔''

''پھر بھی بو جی! میں ایک بار بلال سے بات تو کرلوں۔''

آفتاب ماموں کو شاید امید تھی کہ بلال ان کی بات نہیں ٹالے گا۔ لیکن بلال نے صاف انکار کر دیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ابا جی!''

''مگر بیٹا! میں نے تمہاری مرتی ہوئی پھپھو سے وعدہ کیا تھا کہ......''

''اگر مجھے کسی بات کا علم نہ ہوتا تو شاید ابا جی! آپ کے وعدے کی خاطر میں اپنی تمناؤں کا خون کر دیتا۔ لیکن اب نہیں...... بالکل نہیں...... سب کچھ جاننے کے بعد ناممکن ہے ابا جی! آپ طیب بھائی کے ساتھ اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟''

''تمہیں اس کی ٹریجڈی نہیں معلوم...... وہ شادی نہیں کرتا...... بہت پہلے سے جب خالدہ نہیں مری تھی، تب سے اس نے کہہ دیا تھا کہ اسے شادی نہیں کرنی۔''

''ہوں......'' بلال طنزیہ ہنسا۔''وہ پہلے کی بات تھی ابا جی! یہ کوئی کتابوں میں نہیں لکھا ہوا کہ ایک آدمی ایک محبت کی ناکامی کے بعد ساری عمر محبت ہی نہ کرے۔ اس وقت وقتی صدمہ تھا اور اب۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ان بنّو بیگم نے طیب بھائی کو اپنی زلفوں کے جال میں پھنسانے کی پوری کوشش کی ہے اور طیب بھائی اگر اس جال میں نہ پھنس چکے ہوتے تو اماں کے سمجھانے پر ان کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہوتا۔''

''بلال......'' آفتاب ماموں کا ہاتھ بے اختیار اٹھا لیکن پھر بے بسی سے انہوں نے اپنا ہاتھ نیچے کرلیا۔''میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔''

وہ تھکے تھکے سے بو جی کے کمرے میں آ گئے۔

''بو جی! آپ ٹھیک کہتی تھیں۔ بلال کے اندر اس کی ماں نے جو زہر بھر دیا ہے میں اسے نکالنے کی قدرت نہیں رکھتا...... میں واپس قصور جا کر اویس سے بات کرتا ہوں۔ اس کا ہاؤس جاب تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ میں اویس کے جاب ملتے ہی بنّو کو لے جاؤں گا۔ تب تک میرا خیال ہے بنّو کا امتحان بھی ہو چکا ہوگا۔''

''تم بات کر کے دیکھ لو آفتاب! لیکن میرا خیال ہے تاج مانے گی نہیں۔ پتہ نہیں کیوں میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ تاج خالدہ سے اتنی نفرت کیوں کرتی تھی۔''

''بو جی! ستر فیصد عورتیں اپنے سسرالی عزیزوں سے بلاوجہ نفرت کرتی ہیں اور تاج بھی انہی عورتوں میں سے ایک ہے۔''

''آفتاب! تم بات کر کے دیکھ لو۔ اور اگر ناکام ہو جاؤ تو دھیان رکھنا، میرے بھی دو بیٹے ہیں۔ بخت خان اور وقار۔ اور مجھے بنّو جیسی بہو کہیں سے چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔''

''بو جی! بنّو کے لئے اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہوگی کہ اسے آپ کا سایہ اور شفقت مل جائے۔ لیکن مجھے ایک بار کوشش تو کر لینے دیجئے۔ میں خالدہ کی روح سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا۔''

وہ بو جی کے ہاتھوں پر بوسہ دے کر چلے گئے اور پھر بہت سارے دنوں بعد ان کا خط آیا۔

''بو جی! آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ تاج بی بی کا ماننا بہت مشکل ہے۔ وہ تو اویس کو روکنے کے لئے بنّو پر الزام تراشی کرنے سے بھی باز نہیں آئی یہ سوچے بغیر کہ اس کی زد میں ان کا اپنا بیٹا بھی آ رہا ہے۔ آپ کو اجازت ہے بو جی! کہ آپ جیسے چاہیں بنّو کے

لئے فیصلہ کریں۔ آپ کو ہر طرح کا اختیار ہے۔"

بو جی نے خط پڑھ کر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ بخت خان کو دیکھ رہی تھیں جو بہت خاموش اور کم گو ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ صرف فہدی کی گم شدگی کا دکھ نہیں ہے۔ یہ نارسائی کا کرب بھی ہے جو بخت خان کے وجیہہ چہرے پر رقم ہو گیا ہے۔

یہ اُس محبت کے نہ پا سکنے کا دکھ بھی ہے جو ابھی اس کے دل میں اُگ رہی تھی۔

اُس روز انہوں نے بخت خان کو بلایا۔

"بخت خان! اِدھر آؤ...... کہاں ہوتے ہو؟"

"بس ماں جی...... دفتر میں کام کا بوجھ زیادہ ہے۔ تھک جاتا ہوں۔"

"بیٹا! بہت دنوں پہلے تم نے ایک خواہش کی تھی۔ بنّو سے شادی کرنے کی خواہش۔"

"چھوڑیں ماں جی! خواہشوں کا کیا ہوتا ہے۔ آدمی بہت سی خواہشیں کرتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر خواہش پوری ہو۔" وہ ہمیشہ کی طرح ان کے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"بعض خواہشیں بعض اوقات غیر متوقع طور پر پوری ہو جاتی ہیں بخت خان! تم بتاؤ کہ کیا اب بھی تم ایسا چاہتے ہو؟"

"ماں جی......" وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بیٹا! بلال کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر فرح ہے، اُس سے۔ اُس کی ڈاکٹر فرح سے کمٹ منٹ ہے۔"

"جی ماں جی...... مجھے معلوم ہے۔"

"پھر تم نے بتایا کیوں نہیں تھا؟"

"میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ پھر میں نے سوچا تھا کہ ممکن ہے بلال کی فرح سے صرف دوستی ہو۔ شادی کا ارادہ نہ ہو۔"

"بخت خان! آفتاب نے بنّو کے متعلق فیصلہ کرنے کے سارے اختیار مجھے دے دیئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ بنّو کے امتحان کے بعد سادگی کے ساتھ تمہارا اور اس کا نکاح کر دوں۔"

"ماں جی......" اس کی آنکھیں زیادہ سیاہ اور چمکیلی لگنے لگیں۔ اس نے ایک دم ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی پیشانی کو چوم لیا۔ "تھینک یو ماں جی...... لیکن ایک بار نوید سے بھی اس کی مرضی پوچھ لیجئے گا۔"

"ہاں، ہاں...... کیوں نہیں...... پوچھ لوں گی کسی دن۔"

بخت خان بو جی کے کمرے سے نکلا تو اسے یوں لگا جیسے آج سورج زیادہ روشن، زیادہ چمکیلا ہو اور آج کا دن تمام دنوں سے زیادہ خوبصورت ہو۔

خواہشیں اس طرح بھی پوری ہو جاتی ہیں...... بخت خان نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

مایوسی کی انتہا پر پہنچ کر منزل ملنے کی نوید۔

وہ کتنا خوش نصیب تھا۔

کراچی میں سکوت تھا اور اس کے اندر ہلچل سی مچی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا، اپنی خوشی میں کائنات کی ہر شے کو شریک کر لے۔

جواد کے ساتھ کیرم کھیلے۔

ٹی وی دیکھتے ہوئے امی اور وقار کے ساتھ ہنسی مذاق کرے اور نوید کو...... نوید صبح کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر گھما ڈالے۔

شاید میرے جذبوں کی سچائی تھی...... میرے دل میں پیدا ہونے والی کونپل کی پاکیزگی تھی۔

وہ ذرا سی دیر کو کوریڈور میں رکا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

اسماء اور نوید ان دنوں پڑھائی میں مصروف تھیں۔ ان کے سمسٹر ہونے والے تھے۔

گنگناتے ہوئے اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

بہت دن ہو گئے تھے بلال سے ملے ہوئے۔ بلال اس کا بہت اچھا دوست تھا۔ لیکن کتنا گھنا تھا کہ اس نے ڈاکٹر فرخ سے اسے ملوایا تو تھا لیکن یہ ہرگز نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کے لئے سیریس ہے۔

بلال اپنے فلیٹ میں اکیلا ہی تھا۔ اس کے دوست شاید کہیں گئے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"میں تمہاری طرف ہی آنے کا سوچ رہا تھا۔"

"میری طرف یا ڈاکٹر فرح کی طرف؟" بخت خان شوخ ہو رہا تھا۔

"تمہاری طرف...... ڈاکٹر فرح کی طرف تو بو جی جائیں گی۔ ابا جی کہہ رہے تھے کہ وہ بو جی کو فون کر کے کہہ دیں گے۔"

"اچھا...... تو یہ بات ہے۔ مگر بلال! میں تم سے سخت ناراض ہوں۔ تم نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔ بتایا تک نہیں کہ تم فرح سے......"

"نہیں یار!" بلال نے سر کھجایا۔ "جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ فرح صرف میری دوست ہی نہیں بلکہ زندگی کا حصہ بن چکی ہے اور یہ کہ ہم دونوں کو زندگی کا سفر اکٹھے طے کرنا چاہئے ان دنوں تم فہدی کی وجہ سے بہت پریشان تھے اس لئے اپنی خوشیوں کا ذکر کرنا اچھا نہیں لگا۔"

"ہاں ......" بخت خان اُداس ہو گیا۔ "فہدی! تو ہم سب کو ہمیشہ کے لئے غمزدہ کر گیا ہے۔ میں تو اب مایوس ہونے لگا ہوں ...... لگتا ہے وہ کبھی واپس نہیں آئے گا اور اس کی جدائی کا دُکھ ہمیشہ اذیت دیتا رہے گا۔ ہماری خوشیاں ہمیشہ ادھوری رہیں گی۔"

"کیا خبر کبھی وہ اچانک لوٹ آئے۔"

"یہ آس ہمیشہ رہے گی۔" بخت خان نے آہستگی سے کہا۔ "چلو تم بتاؤ ...... شادی کا کب تک ارادہ ہے؟"

"فرح کے والدین جلدی کر رہے ہیں۔ اب ابا جی اور اماں آئیں گی تو پتہ چلے گا۔ پہلے بو جی بات کر لیں۔ تم نے بھی اپنے لئے کچھ سوچا میاں ...... اپنی پسند کو ترجیح دوگی یا بو جی کی؟"

"بو جی کی پسند میری پسند بھی ہو سکتی ہے۔"

"نہیں یار! محبت کرنے کا اپنا ایک الگ ہی مزہ ہے۔ جب سے مجھے پتہ چلا ہے کہ میں ڈاکٹر فرح سے محبت کرنے لگا ہوں تو بس عجیب سی کیفیت ہے۔ پا لینے کی خوشی۔ کھو جانے کا خوف۔ یار! عجیب کیفیتیں ہوتی ہیں۔"

"ہوں......" بخت خان مسکرایا۔

"یار! تمہاری یہ معنی خیز 'ہوں' بتا رہی ہے کہ تم ان کیفیتوں سے آشنا ہو چکے ہو۔"

"پا لینے کی خوشی ہے اور کچھ کھونے کا خوف نہیں۔"

"آہا......" بلال ہنسا۔ "اب اگر میں تم سے وہی شکایت کروں جو تم نے مجھ سے کی ہے؟"

"تو میں تمہیں وہی جواب دوں گا جو تم نے مجھے دیا ہے۔"

"یعنی......"

"یعنی میں بہت مختصر عرصے میں ان ساری کیفیتوں سے آشنا ہوا ہوں اور یہ مختصر عرصہ وہ ہے جب فہد کی گم شدگی سے ہم لوگ بہت پریشان تھے اور ہیں۔"

"کیا کوئی کلاس فیلو؟"

"نہیں۔"

"کوئی کولیگ؟"

"نہیں یار ...... اپنے گھر میں لڑکیاں ہوں تو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو کیا امی ہے؟"

"کمال ہے یار ...... تمہیں نہیں معلوم کہ وہ ہماری دودھ شریک بہن ہے۔"

"پھر کون ہو سکتا ہے ...... تمہاری بہنوں کے سسرالی عزیزوں میں کوئی؟"

"نوید صبح......" بخت خان کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔

"نہیں......" بلال کو حیرت ہوئی۔ "تو کیا اس نے تمہیں بھی......؟" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر بخت خان کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں محبت کے دھنک رنگ اترے ہوئے تھے۔ وہ جگمگاتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

یہ سادہ دل، سچا اور کھرا آدمی ...... کیا ساری زندگی ایک دھوکے باز لڑکی کے ساتھ گزارے گا؟ جس کے نزدیک انسانی دل کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ جو طیب بھائی کو موت کے کنارے تک پہنچا کر یہاں آ کر اتنی مطمئن اور پُرسکون ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور جس نے یہاں آ کر ایک خوبصورت دل والے نوجوان کو اپنی اداؤں میں پھانس لیا ہے۔

"بخت خان! ممکن ہے تمہیں میری باتیں بری لگیں، تمہیں بہت دکھ ہو۔ شاید تمہاری دلفریب مسکراہٹ دم توڑ دے لیکن میرے دوست، میری جان! آج کا دکھ اس دکھ سے بہتر ہے جو ساری زندگی تم اٹھاؤ گے۔ یہ لڑکی جس کی محبت نے تمہاری آنکھوں کو جگمگاہٹیں بخشی ہیں، یہ ایک بے وفا اور فریبی لڑکی ہے۔" بلال نے سنجیدگی سے اسے ساری تفصیل بتائی۔

بخت خان کی آنکھوں میں روشنیاں لمحوں میں ماند پڑ گئیں۔ ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے بلال کو دیکھنے لگا۔

"آئی ایم سوری بخت خان! مگر میرے دوست......"

"پلیز بلال......" بخت خان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔ "لیو اِٹ پلیز، اس بات کو ختم کر کے کوئی اور بات کرو۔"

"آل رائٹ ...... چائے پیو گے یا کافی؟"

"چائے۔"

چائے پی کر وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ بلال کی بات پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا اور یقین کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ بلال نے بتایا تھا اسی لئے تو اماں نے اسے بو جی کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

اس کا یوں اچانک بو جی کے ساتھ آنا۔ پھر آفتاب کا خط کہ بو جی جہاں چاہیں اس کی شادی کر دیں۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات نہ ہوتی تو یقیناً ماموں اسے اپنی بہو بناتے۔ بلال نہ سہی، اویس اور طیب بھی تو تھے نا۔ وہ ان کی سگی بھانجی تھی اور بقول بلال کے طیب اس سے شادی بھی کرنا چاہ رہے تھے لیکن سنا تھا فیصل آباد میں بھی کئی لڑکوں سے اس کی دوستی تھی۔ اس لئے اماں راضی نہ ہوئیں اور طیب بھائی کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔

دیکھنے میں تو وہ ایسی نہیں لگتی تھی۔

تقریباً دو سال ہو گئے تھے اُسے ان کے گھر رہتے ہوئے۔ اس نے اسے کبھی بلا ضرورت کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

وقار تھا۔ وہ خود تھا...... پھر...... پھر یہ سب کیا تھا؟

بلال نے اسے یہ سب کیا بتا دیا تھا؟ ابھی تو وہ پورے طور پر خوش بھی نہیں ہو پایا تھ کہ بلال نے اس کی خوشی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

وہ ماں جی کو اپنی رضامندی دے چکا تھا...... اپنی خواہش کا اظہار کر چکا تھا۔ پھر کیا کہے ماں جی سے...... کیا وہ سب کچھ بتا دے جو بلال نے اسے بتایا ہے؟ یا پھر خاموشی سے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لے۔ اس کا ماضی جو کچھ بھی رہا تھا، اسے بھول جائے اور صرف یہ یاد رکھے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے...... اس کے بغیر ادھورا ہے...... زندگی رائیگاں ہوگی......

لیکن وہ ہوگی، تب بھی شک اور بے یقینی اسے مار ڈالے گی۔

اُف خدایا...... وہ کیا کرے......

ساری رات وہ اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ سوچتا رہا۔

بے یقینی کا کرب رائیگاں زندگی سے زیادہ المناک ہے۔

'میں...... مجھے اس کی رفاقت قبول نہیں...... اس کی جدائی کا کرب میں سہہ لوں گا...... آخر پہلے بھی تو میں نے قبول کر لیا تھا کہ وہ میرے لئے نہیں ہے اور ہمارے راستے مختلف ہیں۔ اب بھی زندگی اس کے بغیر گزر جائے گی۔'

بو جی صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں کہ وہ ان کے کمرے میں آ گیا۔ سرخ آنکھیں، ستا ہوا چہرہ۔

''کیا ہوا بیٹا...... طبیعت اچھی نہیں ہے؟ کیا رات بھر سوئے نہیں؟'' بو جی بے حد پریشان ہو گئیں۔

''ماں جی......'' اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ''ماں جی! میں نوید صبح سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''بخت خان!'' بو جی نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ رات ہی تو انہوں نے اس سے اس کی مرضی پوچھی تھی اور نوید نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

''بو جی! میرے لئے آپ امی کی جگہ ہیں۔ میرے لئے آپ جو بھی فیصلہ کرتیں، مجھے منظور ہوتا۔ آپ نے مجھے ہمیشہ کے لئے اپنی شفقت کے سائے میں رکھنے کا جو فیصلہ کیا ہے یہ تو میری خوش نصیبی ہے ماں جی!''

انہیں اس کی سعادت مندی پر خوشی ہوئی تھی۔ پھر بھی انہوں نے وضاحت چاہی۔

''بچو! اس سے قطع نظر تم مجھے یہ بتاؤ کہ بخت خان تمہیں اس حیثیت سے پسند ہے؟''

اس کی پلکیں جھک گئیں اور رُخساروں پر شفق اتر آئی تھی اور اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

''بخت خان کی رفاقت میری خوش نصیبی ہے۔''

پھر یکایک بو جی کا ہاتھ تھام کر رو پڑی تھی۔

''بو جی...... مجھے کبھی اپنی شفقت کے سائے سے محروم نہ کیجئے گا...... کبھی نہیں۔''

اور بو جی نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ اور اب یہ بخت خان کیا کہہ رہا تھا۔

''بخت خان! اس کی وجہ؟'' وہ بہت سنجیدہ تھیں۔

''بس ماں جی......'' اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔ ''شاید میرا فیصلہ غلط تھا۔ میں نے جلد بازی میں فیصلہ کیا تھا۔''

''شادی بیاہ گڑیا گڈے کا کھیل نہیں ہوتا بخت خان کہ اس کے متعلق فیصلے بدلتے رہیں۔''

''ماں جی پلیز، میں شرمندہ ہوں...... لیکن میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''کسی انسان کو پرکھنے کے لئے دو سال بہت ہوتے ہیں بخت خان! وہ تمہاری

بہترین شریکِ حیات ثابت ہوگی۔ تم سوچ لو، اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔"

"میں سوچ چکا ہوں ماں جی۔"

"وجہ...... مجھے وجہ بتاؤ۔" ان کے لہجے میں سختی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ بتا دے کہ وہ اتنی معصوم نہیں ہے جتنی نظر آتی ہے...... طیب کو گھائل کر کے وہ قصور میں چھوڑ آئی ہے اور فیصل آباد میں بھی نہ جانے کون کون ہوگا۔ لیکن پھر پتہ نہیں، وہ کیا سوچ کر خاموش ہو رہا۔

"بخت خان! میں نے تم سے وجہ پوچھی ہے۔" بو جی بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ "ممکن ہے تمہیں کسی طرح کی کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔"

"ماں جی! وجہ بتانا اتنا ضروری نہیں ہے۔ کیا آپ کے لئے اتنا کافی نہیں کہ میں نے اس کی رفاقت کی خواہش کی تھی اور میں خود ہی اس خواہش سے دستبردار ہو رہا ہوں۔ یوں سمجھ لیں جیسے کوئی بچہ اپنی ناسمجھی میں کوئی غلط فیصلہ کر بیٹھے اور پھر اسے غلطی کا احساس ہو جائے۔"

"تم اتنے ناسمجھ نہیں ہو بخت خان! اور نہ ہی پنو کوئی مٹی کا کھلونا ہے...... میں رات اس سے بات کر چکی ہوں۔"

"آپ اس سے معذرت کر لیں ماں جی!" وہ کھڑا ہو گیا۔

"کیسے کہوں اس سے کہ میرا بیٹا بہت کمزور ارادے کا ہے اور لمحے لمحے میں فیصلے بدلتا ہے۔ بخت خان جسے وہ بہت آئیڈلائز کرتا ہے لیکن...... بخت خان کے ارادے کی پختگی کا شائبہ تک اس میں نہیں ہے۔ کتنی شرمندگی ہوگی مجھے اس کے سامنے۔"

"ماں جی!" اس نے بے بسی سے بو جی کی طرف دیکھا۔ مٹھیوں کو زور سے بھینچا۔ اس کا وہ بیمار غصہ ایک دم عود کر آیا......

"آپ کو اس کے سامنے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی اس سے کہہ دیتا ہوں۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور بو جی ہلتے پردے کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

نویدِ صبح بہت دنوں بعد یوں ہی صبح صبح کمرے سے باہر نکل کر لان میں آئی تھی اور کوریڈور میں پڑی چھوٹی ٹیبل سے مظہر خان کے لئے آنے والا مخصوص میگزین اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔

بخت خان کا سامنا ہونے کے خیال سے کئی دن ہو گئے تھے، وہ باہر نہیں نکلی تھی۔ نہ صبح کی چائے بنائی تھی۔ زندگی اس کے ساتھ عجیب مذاق کر گئی تھی۔ بو جی نے اسے جس جنت کی خوشخبری دی تھی وہ چند گھنٹوں میں ہی اس سے چھین لی گئی تھی۔

رات بھر وہ کیسے کیسے خوش کن خواب دیکھتی رہی تھی...... اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتی رہی تھی اور سوچتی رہی تھی کہ بھلا خدا کو اس کی کیا بات پسند آئی تھی جس کے صلے میں اسے بخت خان کی دائمی رفاقت مل رہی تھی؟ قسمت یاوری کرے تو اس ستاروں، پرندوں، رنگوں اور بدلتی رُتوں کی دنیا میں کون سی ایسی چیز ہے جو مل نہیں پاتی۔ کچھ لوگوں کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور کچھ میرے جیسے خوش نصیب جنہیں بن مانگے سب کچھ مل جاتا ہے۔ اوپر آسمانوں پر رہتا خدا ان پر مہربان ہوتا ہے۔

لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ ایسی روایتی دنیا میں رہتی ہے جہاں تمناؤں کی صبح ہوتی ہے تو پھر آرزوؤں کی شام ڈھل بھی جاتی ہے۔ محبتوں کی رُتیں چھاتی ہیں تو جدائیوں کی تیز آندھیاں بھی ضرور چلتی ہیں۔

ابھی تو اس نے ان خوابوں سے رنگ محل تراشے ہی تھے کہ بخت خان نے یہ سارے رنگ محل ایک ہی ٹھوکر سے ڈھا دیئے۔

وہ نماز پڑھ کر حسبِ معمول باہر آئی تھی اور ٹیبل سے اخبار اٹھا رہی تھی کہ بخت خان بو جی کے کمرے سے نکلا اور سیدھا اس کے پاس آیا۔ حیا سے اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

آج بخت خان سے بات کرنا اور نظریں ملانا کتنا مشکل لگ رہا تھا۔

"نویدِ صبح!" جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بالکل سرد تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہاری حقیقت جاننے کے بعد میں تمہیں اپنا نہیں بنا سکتا۔ یہ میری خواہش ضرور تھی لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ کچھ چہرے کتنے دھوکے باز ہوتے ہیں۔"

اُس نے تڑپ کر بخت خان کی طرف دیکھا تھا۔

"میری حقیقت!"

"ہاں...... بلال نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔" وہ اپنی بات کہہ کر پلٹ گیا۔

"بخت خان!"

وہ اُسے بلانا چاہتی تھی۔ بتانا چاہتی تھی کہ یہ سب غلط ہے...... جھوٹ ہے...... الزام

ہے۔ محض تاج مامی کی سازش......ان کی نفرتوں کا ردِعمل۔
لیکن اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔
آواز اندر ہی اندر کہیں اُبھر کر دم توڑ گئی تھی اور اس کے وہ ہمیشہ برسنے والے آنسو بھی اندر ہی کہیں برفاب ہو گئے تھے۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔
خوابوں کے رنگ محل کرچی کرچی ہو گئے تھے۔ شاید وہ اس خوش نصیبی کی متحمل نہیں ہو سکی تھی۔
وہ بو جی کا سامنا کرنے سے کترانے لگی۔
اسے لگتا تھا جیسے بو جی ابھی آئیں گی اور کہیں گی چلو اپنا سامان اٹھاؤ اور چلی جاؤ۔'
کئی بار اس نے سوچا وہ بو جی کے پاس جائے اور انہیں ساری حقیقت بتائے لیکن پھر اس کے حوصلے جواب دے گئے۔ اگر بو جی نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا ......اگر انہوں نے اسے گھر سے جانے کے لئے کہہ دیا تو......
وہ سارا دن کتابوں میں سر دیئے رکھتی۔
''امتحانوں کا کوئی اعتبار نہیں۔'' اسماء اسے کتابوں میں سر دیئے دیکھتی تو کہتی۔ ''خبر سال بھر نہ ہوں ...... ڈیٹ شیٹ آئے اور کچھ گڑبڑ ہو جائے۔ یہاں تو کسی چیز پر بھی اعتبار نہیں رہا۔''
لیکن اس نے تو خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔
اسے لگتا تھا جیسے گھر کا ہر فرد اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہو ...... جیسے سب کے چہروں پر بخت خان کی آنکھیں آ لگی ہوں ...... بے یقینی اور بے اعتباری سے اپنی طرف تکتی۔
'پتہ نہیں...... میں زندہ کیوں ہوں۔'
سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھوڑے کی طرح پکنے لگا تھا۔ بو جی نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ کبھی سامنا ہوتا تو نظریں چرا لیتیں۔
کیا خبر انہیں پتہ نہ ہو۔
کیا پتہ بخت خان نے اصل بات بتائے بغیر انکار کر دیا ہو۔
وہ کتابیں کھولے بیٹھی رہتی تھی لیکن ایک لفظ بھی اس کے ذہن میں نہیں بیٹھتا تھا۔ اس کی بھوک مر گئی تھی۔ ایک دو لقمے کھا کر اٹھ کھڑی ہوتی۔
رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دو تین نوالے لے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''بِٹو!'' بو جی نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''کھانا ٹھیک سے کھا لو بیٹی۔''
وہی شفقت، وہی محبت بھرا لہجہ جس میں اماں کے لہجے کی خوشبو تھی۔ اس کے اندر جو آنسو برفاب ہو گئے تھے، پگھلنے لگے۔ لیکن وہ ہونٹ بھینچے بیٹھی رہی۔
کھانے کے بعد بو جی نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔
''بِٹو بیٹھ جاؤ...... بخت خان نے تم سے کچھ کہا تھا؟''
اس نے ایک گہری سانس لی......تو وہ گھڑی آ گئی ہے، شاید بو جی اسے جانے کے لئے کہیں گی۔
''جی۔'' اس کی نظریں جھک گئیں۔
''میں شرمندہ ہوں بِٹو! جوان بچوں پر فیصلے مسلط نہیں کئے جا سکتے۔ میری خواہش تھی کہ تم بخت خان کی دُلہن بنو۔ لیکن معلوم نہیں کیوں، بخت خان ایسا نہیں چاہتا۔''
اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔
'تھینک یو بخت خان، میں تمہاری اس بڑائی کو یاد رکھوں گی کہ تم نے مجھے بو جی کی نظروں سے نہیں گرایا۔'
''بیٹا! اگر تم کہو تو میں وقار سے اس کی مرضی پوچھوں؟''
''نہیں بو جی ...... ابھی نہیں ...... پلیز بو جی نہیں...... میں ...... میں......'' اس کی آواز بھرا گئی۔
''اچھا...... اچھا ٹھیک ہے۔'' بو جی نے اسے تھپکا۔ وہ جانتی تھیں کہ زخم ابھی ہرا ہے۔ ''تم اطمینان سے اپنی تیاری کرو اور پریشان مت ہو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ بیٹا! اس بات پر میرا ایمان ہے کہ سب کام اوپر والے کی مرضی سے ہوتے ہیں ...... خدا کی مرضی نہیں ہو گی، اس میں کچھ مصلحت ہو گی ...... جاؤ اب آرام کرو۔''
وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسماء نے کئی بار اس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا اور پوچھا تھا۔ آج بھی پوچھ بیٹھی۔
''کچھ نہیں ...... تمہارا وہم ہے۔ بس امتحان کی فکر ہے مجھے۔ میں چاہتی ہوں جلد سے جلد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاؤں اور تم مجھے ڈراتی رہتی ہو کہ امتحان ایک سال بھی لیٹ ہو سکتا ہے اور وقت پر بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ اس کی بات کا جواب دے کر کتابیں

کھول کر بیٹھ گئی۔
تب ہی جواد اندر آ گیا۔ فہدی کے جانے کے بعد وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ اس کی وہ ساری شرارتیں اور ہنسی مذاق ختم ہو گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر آ کر بیٹھ گیا۔
''اسمی! آؤ...... ٹی وی دیکھ لو۔''
''جی نہیں چاہ رہا۔''
وہ ٹی وی دیکھنے کی کتنی شوقین تھی۔ اور بقول جواد کے آخری پروگرام دیکھ کر اٹھتی تھی۔ لیکن فہدی کے بعد تو جیسے سب ٹی وی دیکھنا بھول ہی گئے تھے۔ کبھی کبھار مظہر خان آ کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر خبریں سن لیتے۔ ورنہ ٹی وی بند ہی رہتا۔
''اسے ہم سے محبت ہوتی تو وہ ہمیں کبھی چھوڑ کر نہ جاتا اسمی...... اُسے ہم سے محبت ہی نہیں تھی۔'' جواد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''چلو اُٹھو آؤ...... ٹی وی لاؤنج میں چلو...... بہت اچھی انگلش مووی آ رہی ہے۔ بخت بھائی اکیلے بیٹھے ہیں۔ کم آن اسمی...... تم نے کبھی سوچا ہے، غور کیا ہے کہ ہماری صورتیں دیکھ دیکھ کر سب ہنسنا بھول گئے ہیں۔ ہماری وجہ سے سب پریشان رہتے ہیں۔ بخت بھائی جان کو دیکھا ہے تم نے، کتنے چڑچڑے ہو گئے ہیں اور کتنے کمزور بھی۔ رات گئے گھر آتے ہیں۔ جو چلے گئے ہیں، وہ چلے گئے۔ جو موجود ہیں ہمیں انکا خیال کرنا چاہئے۔ بتو کو دیکھو، ہمارے دکھ نے اس کو اپ سیٹ کر رکھا ہے۔ بتو! تم بھی چلو۔''
''نہیں جادی...... تم لوگ جاؤ۔ اور اسمی! جادی صحیح کہتا ہے۔'' وہ جواد کے اصرار کے باوجود نہیں گئی۔
بخت خان کا سامنا کرنا کتنا مشکل تھا۔
وہ آنکھیں جو اسے محبت سے تکتی تھیں، ان میں اپنے لئے بیگانگی، بیزاری اور نفرت دیکھنا کتنا اذیت ناک تھا۔
اور بخت خان شاید اس کی وجہ سے ہی گھر سے غائب رہتا ہے۔ گھر کا کھانا جس پر سب اکٹھے ہوتے تھے، اکثر باہر کھاتا ہے۔ بو جی اس کے لئے کتنی پریشان رہتی ہیں۔
کل مظہر خان اور اطہر خان بھی تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔
یہ لوگ جنہوں نے اسے عزت دی تھی۔
یہ گھر جہاں اسے بے غرض محبتیں ملی تھیں، اس کی ذات انجانے میں سب کے لئے پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔

ساری رات وہ جاگتی رہی تھی اور صبح ہوتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ فیصل آباد چلی جائے گی۔
وہ بو جی کو سب کچھ بتا دے گی۔
اپنے اور طیب بھائی کے متعلق۔
مامی کی ساری باتیں۔
طیب بھائی کی بیماری۔
بلال نے بھی اسے اسی لئے رد کیا تھا...... اور بخت خان نے بھی اسی لئے۔
محبتوں کا دعویٰ کرنے والا اپنی محبتوں میں کتنا کمزور تھا۔
فیصلہ کرتے ہی اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی اور صبح نماز پڑھ کر وہ باہر لان میں نکل آئی تھی۔
بو جی وظیفہ پڑھ لیں تو ان کے پاس جاؤں گی...... بو جی مانیں گی تو نہیں لیکن میں انہیں منا لوں گی۔
اس نے ویکلی میگزین کا صفحہ پلٹا اور تب ہی اس کی نگاہ گیٹ کی طرف اٹھی۔ بابا گیٹ کھول رہا تھا۔
'اتنے سویرے کون آیا ہے بھلا؟' وہ گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔
''فہدی......'' وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ کرتا، پاجامہ اور سیاہ ویسٹ کوٹ پہنے وہ فہدی ہی تھا۔
''فہدی......'' وہ پھر چیخی۔
''اسمی...... جواد...... بو جی...... بھائی جان...... فہدی آ گیا...... فہدی آ گیا۔'' وہ زور زور سے چیخنے لگی۔
دھڑا دھڑ کمروں کے دروازے کھلنے لگے...... سب فہدی کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ لیکن وہ ابھی بھی چیخ رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے اوپر اختیار نہ رہا ہو۔ یک دم اسے لگا جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہو۔ پتہ نہیں یہ رات بھر جاگنے کا اثر تھا یا پچھلے بیس دنوں سے جو ذہن پر بوجھ تھا، اس کا اثر تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اسے ڈولتے ہوئے بخت خان نے سب سے پہلے دیکھا۔ وہ فہدی کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔
''نوید...... نوید صبح......''

اس نے آنکھیں کھولنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی پوری کوشش کی لیکن حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ بخت خان نے اپنے بازوؤں میں اسے سنبھالا۔ اسے وہیں گھاس پر لٹاتے ہوئے بخت خان کی نظریں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ ان بیس دنوں میں وہ بہت کم دکھائی دی تھی۔ دو تین بار رات کھانے پر۔ اس نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

کہیں انجانے میں وہ اس لڑکی پر ظلم تو نہیں کر بیٹھا تھا؟'

فہدی کو سب اندر لے گئے تھے۔ بڑی بھابی اور بوجی اس کے پاس رک گئی تھیں اور بھابی اس کے تلوے سہلا رہی تھیں لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔

''بنو ..... بنو ..... آنکھیں کھولو۔'' وہ مسلسل اسے پکار رہی تھیں۔

''یہ اچانک بنو کو کیا ہو گیا ہے؟ ...... شاید بہت دنوں سے بیمار ہے ...... ہم نے فہدی کی پریشانی میں دھیان ہی نہیں دیا۔'' بڑی بھابی نے اس کے منہ پر پانی ڈالتے ہوئے بوجی کی طرف دیکھا۔

''بہت چپ چپ رہنے لگی تھی...... کھانا بھی بہت کم کھاتی تھی۔'' بوجی کی نظریں بخت خان کے چہرے کی طرف اٹھیں اور پھر بڑی بہو کی طرف دیکھنے لگیں۔

''بعض دکھ اندر ہی اندر آدمی کو کھا جاتے ہیں۔ اسے بھی کوئی دکھ اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا شاید۔ بیٹا! تم مظہر سے کہہ کر اسے اپنے کمرے میں پہنچانے کا انتظام کرو اور اسے ڈاکٹر کو فون کرنے کے لئے کہہ دو۔''

'کوئی دکھ تو مجھے بھی اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے ماں جی! لیکن آپ اپنے بیٹے کا دکھ نہیں جان سکتیں۔ آپ تو اسے ہمیشہ مجرم ہی سمجھتی رہیں گی۔ لیکن وقت آپ کو خود بتا دے گا۔'

اس نے آگے بڑھ کر دونوں بازوؤں میں اسے اٹھا لیا۔

بند آنکھیں ...... زرد رنگت ...... بے ہوشی میں بھی اس کے چہرے پر بہت سے ملال کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ امی کے کمرے میں اسے پہنچا کر وہ ڈاکٹر کو فون کرنے چلا گیا۔

☆☆☆

فہدی سے فی الحال کسی نے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں اور کیوں چلا گیا تھا۔

نوید کو اپنی بے ہوشی پر بہت شرمندگی تھی۔ ہمیشہ اس کے ساتھ گڑبڑ ہو جاتی۔ جب رونا ہوتا تھا تو آنسو غائب ہو جاتے تھے اور جب وہ آنسوؤں کو روکنا چاہتی تھی تو وہ دھڑا دھڑ آئے چلے جاتے۔ اب بھلا اس خوشی کے موقع پر بے ہوش ہونے کی کیا تک تھی۔ اور کتنے بڑے بڑے حادثے ہوئے تھے اس کے ساتھ۔

اماں کی موت ...... تاج مامی کی الزام تراشی ...... بخت خان کا انکار۔

وہ سب جھیل گئی تھی۔ اور اب...... اب کیا ہو گیا تھا اُسے؟ امی نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے کہا تھا ذہن پر بہت بوجھ ہے۔ وہ اسے سکون آور دوائیں دے گیا تھا اور ریسٹ کی تلقین کی تھی۔ تین دن سے وہ آرام کر رہی تھی۔

فہدی کے آنے پر بوجی نے منت کی دیگیں پکوائی تھیں۔ اس نے سوچا وہ اُٹھ کر بوجی کے پاس جائے۔ انہیں فہدی کی زندگی کی مبارکباد دے اور فیصل آباد جانے کی اجازت لے لے۔

اور یہ کتنا مشکل کام تھا۔ لیکن بہرحال اسے جانا تو تھا ہی۔ امتحان دینے کے لئے پھر آ جائے گی۔ اسماء کو یہ کہہ جائے گی کہ ڈیٹ شیٹ ملے تو اسے خط لکھ دے۔

اس نے اٹھ کر بالوں میں برش کیا۔

اسماء کسی کام سے اندر آئی تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسے کھڑے دیکھ کر کہا۔

''تم ٹھیک ہو بنو؟''

''ہاں......'' وہ مسکرائی۔ ''میں ابھی تم لوگوں کی طرف آ رہی تھی۔ فہدی کدھر ہے؟ کیا کہتا ہے وہ؟''

''فہدی باہر ہی ہے ...... بلکہ شام کی فلائٹ سے ماموں جان کے ساتھ اسلام آباد جا رہا ہے۔ رات ہی ماموں جان آئے ہیں۔'' (اسماء وغیرہ کے ماموں اسلام آباد جا رہے تھے) ''ماموں جان فی الحال تو اسے اسلام آباد لے جا رہے ہیں، جلد ہی باہر بھجوا دیں گے۔''

''ہاں، یہی مناسب ہے۔'' نوید نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا۔ ''چلو، فہدی کے پاس چلتے ہیں ...... کتنا یاد آتا تھا وہ۔''

''دو تین بار وہ تمہارے پاس آیا لیکن تم ٹرنکولائزر کے زیر اثر سو رہی تھیں۔''

اسماء کے ساتھ ہی وہ باہر نکلی اور پھر لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک کر رک گئی۔ کوریڈور میں جواد سے باتیں کرتے وہ طیب بھائی ہی تھے۔

''طیب بھائی آپ.......؟'' وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ ''آپ کب آئے؟''

''ابھی چند لمحے پہلے پہنچا ہوں۔ اور جاوی سے تمہارا ہی پوچھ رہا تھا، میری گڑیا کیسی ہے؟''

''طیب بھائی! میں نے آپ کو بہت مِس کیا۔'' آنسو بے اختیار آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔

''میں جانتا ہوں ...... تمہارا پرابلم سمجھتا ہوں بنّو! لیکن تم بے فکر رہو۔ میں صرف تمہاری خاطر آیا ہوں۔ مجھے بہت دیر میں پتہ چلا۔ کچھ دن پہلے جب ابا سے پتہ چلا کہ وہ لوگ چند دنوں تک بلال کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے کراچی جا رہے ہیں تو میں سمجھا کہ ابا تمہاری بات کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بلال سے پتہ چلا کہ وہ تمہاری نہیں ڈاکٹر فرح کی بات کر رہے ہیں تو حیرت ہوئی مجھے بہت۔ ابا جی نے کئی بار مجھے کہا تھا کہ اگر وہ نہ رہے تو میں یاد رکھوں کہ تم بلال کی امانت ہو اور مجھے ابا جی کا عہد نبھانا ہے۔ لیکن پھر یہ اچانک کایا پلٹ گئی۔ تب ابا جی نے مجھے ساری تفصیل بتائی تو میں نے بلال سے خود بات کی۔''

وہ ذرا دیر رکے ...... نوید کے آنسو مسلسل اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

''تب مجھے پتہ چلا کہ اماں نے بلال کے ذہن میں کس قدر زہر بھر دیا تھا۔ وہ بہت شرمندہ ہے بنّو! تم سے۔ اور بخت خان سے بھی ...... اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے بخت خان کو گمراہ کیا ہے۔ اس لئے میں چلا آیا ہوں تاکہ اگر غلط فہمی پیدا ہوئی بھی ہے تو اسے دور کر دوں۔''

''نہیں طیب بھائی! اب کیا فائدہ ...... جو ہونا تھا، ہو چکا ...... آپ کسی سے کچھ نہ کہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں فیصل آباد چلی جاؤں گی اور وہاں ہی رہوں گی رزلٹ کے بعد کہیں جاب کر لوں گی۔ کسی ہوسٹل میں رہ لوں گی۔''

''پاگل ہوئی ہو بنّو؟''

''اچھا ہوا آپ آ گئے ...... میرے لئے آسانی ہو جائے گی۔ میں بو جی سے بات کر کے آپ کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔'' آنسو پھر اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

'اماں کے بوئے ہوئے کانٹوں نے اسے یہاں بھی چین سے نہیں رہنے دیا۔' طیب نے بڑے دکھ سے سوچا۔ وہ تو مطمئن تھے کہ وہ یہاں بہت خوش اور مطمئن ہے۔

''پاگل پن کی باتیں مت کرو بنّو! میں نے کہا ہے نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

'شاید کچھ بھی ٹھیک نہ ہو۔' اس نے افسردگی سے سوچا۔

بھلا بخت خان کے دل میں چبھے کانٹے کیسے دور ہو سکتے ہیں؟

لیکن طیب بھائی نے یہ سارے کانٹے چن لئے تھے۔ بو جی کے پاس بیٹھ کر انہوں نے نہایت دل گرفتگی سے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ کہہ دیا تھا۔ بخت خان بو جی کے گھٹنے سے سر لگائے بیٹھا تھا۔

''ارے میں تو تاج کے مزاج سے خوب واقف ہوں۔ معاف کرنا، وہ تمہاری ماں ہے بیٹے! لیکن پتہ نہیں مرحومہ خالدہ سے اسے کیا بیر تھا۔'' بو جی نے ساری بات سن کر کہا۔ ''اور یہ بخت خان، اس نے مجھے بتایا ہی نہیں ورنہ میں اسی وقت ساری بات کلیئر کر دیتی۔ تمہارے باپ نے مجھے مختصراً بتایا تھا۔ بے چاری بچی خواہ مخواہ اذیت برداشت کرتی رہی اور اسی وجہ سے بیمار پڑ گئی۔''

'اور میں نے کچھ کم اذیت اٹھائی ہے؟' بخت خان نے سوچا۔

اپنی محبت سے دستبردار ہونا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے یہ کوئی اس کے دل سے پوچھے۔

'اور اب اسے منانا کتنا مشکل ہوگا۔'

''بو جی! وہ فیصل آباد جانا چاہتی ہے۔''

''میں سمجھا لوں گی اسے بیٹا! میری بات نہیں ٹال سکتی وہ۔ اور پھر آفتاب نے اس کا اختیار مجھے دیا ہے۔ اس جیسی ہیرا لڑکی کیلئے لڑکوں کی کوئی کمی ہے؟'' انہوں نے کن انکھیوں سے بخت خان کو دیکھا جو یک دم چونک کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔

''بخت خان نہ سہی، وقار سہی۔ اپنی گڑیا کا دیور ہے ...... ابھی جیالوجسٹ بنا ہے۔ گڑیا نے تو ایک دو بار مجھ سے کہا بھی ہے کہ ماں جی اگر بنّو کا رشتہ کہیں باہر کرنا ہو تو انجو کا خیال رکھئے گا۔''

بخت خان پہلو بدل کر رہ گیا۔ طیب کے سامنے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بو جی سے کہتا کہ وہ ...... وہ نوید......

''میرا خیال ہے، طیب! تم انجم سے بھی مل لینا۔ وقار کو تو تم جانتے ہی ہو۔''

''بو جی! آپ زیادہ بہتر سمجھتی ہیں ...... لیکن کچھ بھی کرنے سے پہلے بنّو کی مرضی ضرور پوچھ لیجئے گا۔''

''ہاں ہاں ...... کیوں نہیں۔''

"ماں جی!" بخت خان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "سوری ماں جی! میں بلال کی باتوں میں آ گیا تھا۔" طیب بھائی کی موجودگی ہی میں بخت خان کو کہنا پڑا۔ ورنہ اسے ڈر تھا کہ کہیں بو جی ابھی نوید کی قسمت کا فیصلہ نہ کر دیں۔

"کل کلاں کو پھر کسی نے کچھ کہہ دیا تو پھر ...... یہ کوئی گڈے گڑیا کا بیاہ نہیں۔ میں نے پہلے بھی تمہیں کہہ دیا تھا۔"

"ماں جی! میں نے کہا نا، میں نادم ہوں۔"

"تو بھئی، بتو سے معافی مانگو۔ تم نے اس کا دل دُکھایا ہے۔" بو جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ماں جی......" بخت خان نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ کر اسے عقیدت سے آنکھوں سے لگایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ بو جی مسکراتے ہوئے اسے جاتا دیکھتی رہیں۔

طیب کے ہونٹوں پر بھی آسودہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

نماز پڑھ کر نوید نے اوپر نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔

آج کی صبح کتنی روشن اور چمکیلی ہے۔

جیسے کائنات کی ہر چیز ہنس رہی ہو۔

آج اس نے باہر لان میں نماز پڑھی تھی۔

زندگی ایک بار پھر اپنے سارے رنگ لئے اس پر مہربان ہو گئی تھی۔

بخت خان معذرت خواہ تھا، شرمندہ تھا اور اسے مستقبل کی نوید دے رہا تھا لیکن اس کے دل سے ہزاروں خدشے لپٹے ہوئے تھے۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل پھر آپ کسی کے کہنے پر بدگمان نہیں ہوں گے؟ روز روز کے مرنے سے ایک ہی بار مرنا زیادہ آسان ہے بخت خان!"

"گارنٹی تو کوئی نہیں ہے نوید صبح! لیکن اگر میرے لفظوں پر اعتبار کر سکو تو مرا یقین کر لو۔ میں کوشش کروں گا کہ دنیا کے سارے سکھ تمہاری جھولی میں ڈال دوں۔ تمہیں اتنی محبت اور اتنی خوشیاں دوں کہ پچھلے دکھوں کی معمولی سی چبھن بھی باقی نہ رہے۔ ہاں نوید صبح...... میرا اعتبار کرو۔"

اس کی آنکھوں میں اور اس کے چہرے پر محبت کی جو تحریر رقم تھی، اس سے نظر چرانا اس کے لئے ناممکن تھا۔

انجانے وسوسوں سے وہ اس اتنے خوبصورت اور اتنے مہربان شخص کو کھو نہیں سکتی تھی۔ گئے دنوں میں وہ جان چکی تھی کہ یہ شخص اس کے وجود کا ایک ضروری حصہ بن چکا ہے...... اور اس کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن تھا۔

"یقین کرو نوید صبح! تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور میرے لئے کوئی آسان نہیں تھا۔ میری زندگی میں، میں نے یہ دن بہت مشکل سے کاٹے ہیں۔"

اور نوید کو یوں لگا تھا کہ اوپر نیلے آسمان پر رہتا خدا بڑا مہربان ہے۔

وہ مسکرا دی تھی۔

اور بخت خان نے سر کو خم کرتے ہوئے محبت لٹاتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"تم کبھی اپنے فیصلے پر نہیں پچھتاؤ گی نوید صبح!"

اور باہر لان میں بیٹھے بیٹھے اس نے مڑ کر بخت خان کے کمرے کی طرف دیکھا۔

اس نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔

"یا اللہ! میری خوشی کو سلامت رکھنا۔ اور اے خدا ...... اے مہربان خدا ...... میری اس پاک سرزمین کو وطن دشمنوں سے پاک رکھنا۔ یا اللہ! اس وطن کو دائم و قائم رکھ۔ اور اسے غداروں کی سازشوں سے بچا۔"

"آمین۔"

پتہ نہیں کب بخت خان بھی وہیں آ کر کھڑا ہو گیا تھا......

اُس کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ہوئے تھے اور ہاتھوں کے پیالے میں آنسو گرتے جا رہے تھے۔

اور جو دعائیں آنسوؤں کے جلو میں مانگی جائیں وہ ضرور قبول ہوتی ہیں۔

بخت خان کے اندر یقین کے بے شمار چراغ جل اٹھے اور اس نے بھی دو زانو بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔

☆☆☆

رگِ سنگ

فرح رضا کی منگنی میں میری شرکت بے حد ضروری تھی کیونکہ فرح میری واحد دوست ہے۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ میری دوست کیسے بن گئی حالانکہ اس کے اور میرے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کی پسند ناپسند، اس کے شوق سب مجھ سے مختلف ہیں۔ پھر بھی وہ میری دوست ہے۔ حالانکہ میرے ساتھ اس کی دوستی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ میں بچپن سے ہی بہت تنہائی پسند رہی ہوں۔ سکول سے لے کر یونیورسٹی تک میری کسی سے کوئی دوستی نہیں ہو سکی۔ السلام علیکم، وعلیکم السلام کے سوا کبھی کسی سے فالتو بات نہیں ہوئی۔

سکول میں، کالج میں اور پھر یونیورسٹی میں بھی لڑکیوں نے میرا نام کتابی کیڑا رکھا ہوا تھا اور یہ تھی بھی حقیقت کہ مجھے اپنی پڑھائی کے سوا کسی اور شے سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے، میں اکثر بے خبر رہتی تھی۔ کالج، سکول میں ہونے والے فنکشنز ہمیشہ مجھے وقت کا زیاں لگتے تھے اور میں سوچا کرتی تھی کہ آخر یہ استاد، یہ سکول و کالج کے کرتا دھرتا بچوں کا اتنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ آخر انہیں وقت کی قیمت کا احساس کیوں نہیں ہے؟ لیکن یہ میری اپنی سوچ تھی اور کوئی بھی میری سوچ سے متفق نہیں تھا۔

لڑکیاں تو مہینوں پہلے ہی مینا بازار اور دوسرے کئی فنکشنز میں پہننے کے لئے کپڑے تیار کرنا شروع کر دیتی تھیں۔ میں دل ہی دل میں ان کی اس احمقانہ تیاری پر ہنسا کرتی تھی اور شاید وہ دل میں مجھے بور، ڈل اور نہ جانے کیا کیا کہتی ہوں گی۔ لیکن بظاہر وہ میرا احترام ہی کرتی تھیں کیونکہ میں ہر سال پوزیشن لیا کرتی تھی۔ میں نے ہمیشہ اپنے سکول اور کالج کا نام روشن کیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں میری کسی سے دوستی نہ ہو سکی تھی۔ حالانکہ میں نہ تو بد اخلاق تھی، نہ منہ پھٹ۔ ہر جماعت میں میری ہم ذوق لڑکیاں بھی تھیں جو میری طرح پڑھائی کو بہت

زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ لیکن میں کسی کے قریب نہ ہو سکی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ میری امی کا انتقال تو میرے بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔ میرے بابا میری طرح کم گو اور سنجیدہ سے انسان تھے۔ میری والدہ کی وفات کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ ان کا حلقہ احباب بھی بہت کم تھا اور اتفاق کی بات کہ ہمارے قریبی عزیز بھی کوئی نہیں تھے۔ دادا دادی، نانا نانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ابو اور امی اکلوتے تھے۔ سو گھر میں کسی کا آنا جانا تھا ہی نہیں۔ شاید اس لئے بھی میرے اندر وہ گٹس پیدا نہ ہو سکے تھے جو ایک آدمی کو دوسرے سے بے تکلف کرتے ہیں۔

میرے بابا کے بھی کوئی دوست نہیں تھے اور اگر کوئی تھے بھی تو میں نے انہیں کبھی گھر آتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید میرے بابا میں بھی میری طرح دوست بنانے کے گٹس نہیں تھے۔ ایک دفعہ میں نے بچپن میں بابا سے پوچھا تھا۔

''بابا! آپ کے کوئی دوست کیوں نہیں ہیں؟''

''پتہ نہیں۔'' بابا ہنس دیئے تھے۔

''آپ دوست کیوں نہیں بناتے بابا؟''

دراصل ان دنوں میری کلاس میں ایک نئی لڑکی داخل ہوئی تھی نوشی۔ اور اتفاق سے وہ ہمارے سامنے والے گھر میں رہتی تھی۔ اس کے ڈیڈی کا تبادلہ کسی اور شہر سے یہاں ہوا تھا۔ وہ کلاس میں ہر وقت ذکر کیا کرتی تھی۔

''آج ڈیڈی کے دوست انکل فلاں آئے تو بڑا مزہ آیا۔ آج فلاں انکل میرے لئے گڑیا لائے اور آج وہ جو ڈیڈی کے وہ والے دوست ہیں انہوں نے ہمیں باہر لنچ دیا۔''

وہ میرے آگے والے بینچ پر بیٹھتی تھی اور مسلسل اپنی سیٹ فیلو سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کی یہ باتیں سن سن کر ہی میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ میرے بابا کے تو کوئی دوست نہیں ہیں۔ بابا دفتر سے سیدھے گھر آتے تھے، ہم باپ بیٹی مل کر کھانا کھاتے۔ بابا مجھ سے سکول کی باتیں پوچھتے۔ غفور سے اس کا حال دریافت کرتے اور پھر کوئی کتاب، رسالہ لے کر بیٹھ جاتے۔ گھر کا سارا نظام عملاً غفور کے ہاتھ میں ہی تھا۔ کھانا پکانے سے لے کر بازار سے سودا لانے تک۔ کیا لانا ہے، کیا چیز کم ہو گئی ہے، کس چیز کی ضرورت ہے، یہ سب اسے ہی پتہ ہوتا تھا۔

بابا،غفور پر بہت اعتماد کرتے تھے اور وہ گھر کی ایک ایک چیز کا خیال رکھتا تھا۔ پہلے تو خیر میں چھوٹی تھی لیکن بعد میں جب میں اس قابل ہوگئی کہ کچن کی دیکھ بھال کر سکوں تب بھی میں نے کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی اور گھر کا سارا نظام ہمیشہ غفور کے ہاتھ میں ہی رہا۔

مجھے اپنی تنہائی اور اُداسی کا کبھی خیال نہیں آیا۔ کیونکہ میں نے کبھی تنہائی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ ہاں، بابا کی تنہائی کا خیال بڑی شدت سے میرے دل میں پیدا ہوا تھا، کیونکہ میری زندگی کا محور ہی بابا کی ذات تھی اور میں نے سوچا تھا کہ اگر نوشی کے ڈیڈی کی طرح بابا کے بھی بہت سارے دوست ہوں تو بابا بھی خوش رہا کریں۔ جب سے نوشی آئی تھی، میں دن میں کئی کئی بار بابا کا جائزہ لیتی تھی مگر وہ مجھے بہت اُداس اور چپ چپ دکھائی دیتے تھے اور اس کا واحد حل مجھے یہی نظر آیا تھا۔

بابا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک روشن سی چمک تھی اور اس سمے وہ بالکل بھی اُداس نہیں لگ رہے تھے، جیسے انہیں دوست نہ ہونے کا کوئی دکھ نہیں ہے۔

''بتائیں نا بابا! آپ دوست کیوں نہیں بناتے؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا تو انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھے دوست نہ مل سکیں تو دوست کا نہ ہونا بہتر ہوتا ہے۔''

''تو کیا اچھے دوست مشکل سے ملتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ...... مشکل سے۔''

''آپ تو مشکل کام بھی کر لیتے ہیں نا بابا! تو پھر اچھا سا دوست کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے؟''

''پگلی! یہ ڈھونڈنے سے تھوڑا ہی ملتا ہے؟ یہ تو نصیب کی بات ہوتی ہے نا...... آدمی کی خوش بختی ہوتی ہے کہ اسے کوئی اچھا دوست، اچھا رفیق مل جائے۔''

''تو کیا یہ خودبخود ملتا ہے؟''

''ہاں ......'' بابا نے سر ہلا دیا۔

''وہ نوشی کے ڈیڈی کتنے خوش نصیب ہیں ...... ان کے اتنے ڈھیر سارے دوست ہیں۔'' میں نے بڑی حسرت سے کہا۔

''کیا پتہ وہ اچھے دوست نہ ہوں۔'' بابا نے میرے لہجے کی اُداسی کو محسوس کرتے

ہوئے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ''اور میرے بھی دو دوست تو ہیں نا ...... ایک میری بیٹی اور ایک عبدالغفور۔''

بابا ہمیشہ اس کا پورا نام لے کر بلاتے تھے اور مجھے بھی تاکید کرتے تھے کہ میں بھی اسے بلاؤں تو چاچا عبدالغفور کہا کروں، غفور چاچا نہیں۔

''اور میں تو نوشی کے ڈیڈی سے زیادہ خوش نصیب ہوں۔ بھلا نوشی کے ڈیڈی کا کوئی دوست بھی ہمارے دوستوں جیسا ہوگا؟''

اگرچہ بابا نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ دوستوں کے نہ ہونے سے قطعی اُداس نہیں ہیں، پھر بھی میں مہینوں دل ہی دل میں ان کی خوش نصیبی کی دعا مانگتی رہی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ بابا آدم بیزار تھے۔ محلے کے ہر فرد سے سلام دعا تھی۔ لوگ ان کا احترام کرتے تھے اور وہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔ دفتر میں بھی اپنے جونیئرز، سینئرز سب کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے۔ ہاں مگر ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔

میں بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ ان کی خوش نصیبی کی دعا مانگا کرتی تھی مگر شاید ابھی میں چھوٹی تھی اور شاید مجھے دعا مانگنے کا صحیح طریقہ نہیں آتا تھا کہ میری دعائیں قبول ہی نہیں ہوتی تھیں۔ بابا کو ابھی تک کوئی اچھا دوست نہیں ملا تھا۔ میں کبھی کبھار ان سے پوچھ لیتی تھی کہ انہیں کوئی اچھا دوست ملا یا نہیں؟ اور بابا کا جواب ہمیشہ نفی میں ہوتا۔

اُدھر نوشی کے ڈیڈی کے دوستوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے ڈیڈی کے پاس بھی ان کے بہت اچھے دوست بن گئے تھے اور میری ساری دعائیں بیکار جا رہی تھیں۔ یہ بات نہیں کہ مجھے کوئی لالچ تھا کہ بابا کے دوست مجھے بھی قیمتی کھلونے اور گڑیاں لا لا کر دیں، جیسے نوشی کے ڈیڈی کے دوست لاتے تھے۔ بخدا مجھے کھلونوں اور گڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری الماری میں پہلے ہی ڈھیروں کھلونے پڑے ہوئے تھے اور نہ ہی مجھے سیر وتفریح کا کوئی شوق تھا۔

بابا کبھی کبھی مجھے گھمانے لے جاتے تھے لیکن میں جلد ہی بور ہو جاتی تھی جس پر بابا کبھی کبھی حیران ہوتے تھے۔

''ظلِ ہما! تم کیسی بچی ہو ...... بچے تو اس عمر میں گھوم پھر کر خوش ہوتے ہیں۔''

''میں اپنے بابا جیسی بچی ہوں۔'' میں ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی۔ ''مجھے اپنے بابا کی طرح رہنا اچھا لگتا ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر، بیڈ سے ٹیک لگا کر پڑھنا۔''

''مگر بیٹا! جب میں تمہاری عمر میں تھا تو مجھے کھیلنے کودنے کا بہت شوق تھا اور گھومنے پھرنے کا بھی۔ بلکہ ایک بار تو سیر کے شوق میں گم ہوتے ہوتے بچا تھا۔ بیٹا! تم اپنی سہیلیوں کو گھر بلایا کرو۔ کھیلا کرو ان کے ساتھ۔''

''میری تو کوئی سہیلی ہی نہیں ہے۔'' میں نے بالکل بابا کے انداز میں جواب دیا تھا۔

''ارے کیوں؟''

''اچھی سہیلیاں نہ مل سکیں تو پھر ان کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔''

بابا نے لحہ بھر میرے جملے پر غور کیا اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیئے تھے۔ وہ اس طرح کھل کر کبھی کبھی ہی ہنستے تھے اور ایسے میں بہت اچھے لگتے تھے۔

''اچھا ...... تو یہ اچھی سہیلیاں کب ملیں گی؟''

''جب نصیب یاوری کرے گا۔'' میں نے بابا کا جملہ دہرا دیا تھا۔

''اچھا، ہم اپنی بیٹی کے لئے دعا کریں گے کہ ہماری بیٹی کو بہت جلد ایک اچھی سی سہیلی مل جائے۔

''اور پتہ ہے بابا!'' اُس روز میں نے بابا کو اپنے اس راز میں شریک کر لیا۔ ''میں بھی آپ کے لئے، آپ کی خوش نصیبی کے لئے دعا کرتی ہوں۔''

''ارے ...... مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا جس کی تمہارے جیسی بیٹی ہے اور جسے خدا نے دنیا کی بہت سی آلائشوں سے بچا رکھا ہے......''

''لیکن پھر بھی آپ کا دوست تو کوئی نہیں ہے۔'' میں نے بابا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اور میں تو یہ دعا کرتی ہوں کہ خدا آپ کو بہت اچھا سا دوست دے دے۔''

بابا بہت دیر تک یونہی مجھے دیکھتے رہے تھے اور کچھ سوچتے رہے تھے۔

اور اس روز بابا نے عبدالغفور چاچا سے کہا تھا۔

''عبدالغفور! تیری ایک بیوہ بہن ہے نا جو گاؤں میں رہتی ہے؟''

''جی صاحب......''

''تو جا کر اسے یہاں لے آ۔ ظلِ ہما شاید گھر میں تنہائی محسوس کرتی ہے۔ گھر میں عورت ہوگی تو شاید ...... اور پھر اب یہ بڑی ہو رہی ہے۔''

''جی صاحب ...... اُس بے چاری کا بھی میرے سوا کوئی اور نہیں ہے۔''

اور پھر عبدالغفور اسے لے آیا۔ لیکن مجھے اس کے آنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی وہ میرے بے حد لمبے اور گھنے بالوں میں تیل ڈال کر مالش

کر دیا کرتی تھی اور کبھی کبھی جب سکول جانے کی جلدی میں وہ مجھ سے سلجھ نہ پاتے تو وہ انہیں سلجھا دیا کرتی تھی۔ زیادہ تر کام تو اب بھی عبدالغفور ہی کرتا تھا۔ وہ تو بیٹھ کر بس حقہ پیا کرتی تھی اور حقہ پیتے ہوئے اپنے مرحوم خاوند کا ذکر کرتی رہتی تھی یا پھر اپنے سسرال والوں کے مظالم کا جنہوں نے خاوند کی وفات کے بعد اسے دھکے مار کر نکال دیا۔

مجھے اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بولتی رہتی اور میں اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی۔ بابا سمجھتے تھے، شاید اس کے آنے سے میں نے ان کے لئے ایک اچھے دوست کی دعا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ میں اب بھی اسی خشوع و خضوع کے دعا کرتی تھی۔ اور ایک روز جب میں تقریباً اپنی دعاؤں کی قبولیت سے مایوس ہو چکی تھی، میں نے عبدالغفور کی بہن سے پوچھا۔

''تمہیں پتہ ہے بے بے (عبدالغفور اسے بے بے کہتا تھا لہٰذا میں نے بھی اسے بے بے کہنا شروع کر دیا تھا) دعائیں کیسے قبول ہوتی ہیں؟''

''بس جی ...... سچے دل سے جو دعا مانگی جائے، وہ قبول ہوتی ہے بی بی!''

''پر بے بے! سچے دل سے کیسے دعا مانگی جاتی ہے؟''

''رو کر ...... تڑپ کر ...... سچی لگن سے۔''

اور اس سے پہلے کہ میں رو رو کر خدا سے دعا مانگتی کہ ایک عجیب واقعہ ہوگیا۔ اس روز میں نے کئی بار رونے کی کوشش کی تھی لیکن میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے۔ مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا نہیں آتا تھا۔ بہت بچپن میں ہی بابا نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے رونا نہیں ہے۔ چنانچہ میں کبھی نہیں روئی تھی۔ کئی بار میں گر کر زخمی ہوئی، کئی بار بیمار ہوئی لیکن میں روتی نہیں تھی اور بابا بہت خوش ہوتے تھے کہ میں بہت بہادر ہوں۔

میری امی کی جب وفات ہوئی تھی، اس وقت میں دو سال کی تھی اور مجھے امی کی وفات، ان کی بیماری کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ عبدالغفور کی بہن نے دو تین بار امی کا ذکر کر کے مجھے رُلانے کی کوشش کی لیکن اس وقت جب اس کی آواز میں رقت پیدا ہونی شروع ہوتی تو مجھے یاد آ جاتا کہ مجھے تو الجبرے کے سوال حل کرنے ہیں۔

تو جب مسلسل آنکھیں رگڑنے کے باوجود بھی میرے آنسو نہ نکل سکے تو میں عبدالغفور کی بہن کے پاس یہ پوچھنے کے لئے آئی کہ اگر آنسو نہ آ سکیں تو پھر کیا کیا جائے؟ مگر بے بے اکیلی نہ تھی۔ اس کے پاس شفقت صاحب کی آپا بیٹھی تھی۔ شفقت صاحب بالکل نوشی کے ساتھ والے گھر میں رہتے تھے اور بے بے جب سے آئی تھی،

اردگرد کے دو تین گھروں میں اس نے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ وہاں سے بھی کوئی خاتون آ جاتی تو بے بے کا وقت ان کے ساتھ گپ شپ میں اچھا گزر جاتا۔

میں ایک طرف کھڑی ہو گئی تاکہ شفقت صاحب کی آپا چلی جائے تو میں بے بے سے پوچھوں۔ شفقت صاحب کے تین بچے تھے۔ ان کی بیگم بڑی نحیف و نزار قسم کی تھیں۔ ان کے بچے زیادہ تر آپا جی کے پاس ہی رہتے تھے۔ اس وقت بھی چھوٹا بچہ آپا جی کی گود میں تھا۔ سنہرے بالوں اور سنہری رنگت والا وہ چھوٹا سا بچہ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں وہیں بیٹھ کر اس سے کھیلنے لگی۔ کبھی اس کے سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی، کبھی اس کے ہونٹوں کے نیچے انگلی رکھ کر اسے ہنسانے کی کوشش کرتی۔

بے بے اور آپا باتوں میں مشغول تھیں۔ پھر آپا اسے مکمل طور پر میری گود میں دے کر بے بے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بچہ میری گود میں سو گیا تو میرا دھیان بے بے اور آپا کی باتوں کی طرف چلا گیا۔ آپا کہہ رہی تھی۔

''اور بٹ صاحب تو تین دن باہر ہی نہیں نکلے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ بیوی گئی، سو گئی، ساتھ بیٹی اور بیٹا بھی چھن گئے۔''

(بٹ صاحب نوشی کے والد تھے)

''ارے......'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر بے بے کی طرف دیکھا۔ نوشی تین چار دن سے سکول نہیں آ رہی تھی۔ تو کیا نوشی، اس کی امی اور بھائی مر گئے؟ مگر ایک ساتھ تینوں ......ضرور ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو گا اور وہ جو میں اتنی دیر سے رونے کی کوشش کر رہی تھی اور مجھے رونا نہیں آ رہا تھا، میری آنکھوں میں خودبخود نمی اتر آئی۔ ہائے! نوشی کتنی اچھی لڑکی تھی اور اس کا بھائی تو اتنا پیارا تھا...... گول مٹول، سرخ و سپید۔ اور اس سے پیشتر کہ میں باقاعدہ ان کی موت کا تصور کر کے رونے لگتی، بے بے نے حقہ ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

''قصور بھی تو بٹ صاحب کا اپنا ہی ہے نا۔ دوستوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ نہ دن دیکھتے تھے، نہ رات۔ جب دیکھو، تحفوں سے لدے پھندے چلے آ رہے ہیں۔ بٹ صاحب دفتر میں ہیں تب بھی آ رہے ہیں اور ارجمند بی بی ہیں کہ بن سنور کر ان کی گاڑی میں بیٹھی جا رہی ہیں۔ اکیلی، تنہا۔ اے بی بی، عورت تو عورت ہی ہے نا۔ اب اگر بٹ صاحب کا کوئی دوست انہیں بھگا کر لے گیا ہے تو اس میں بھلا ارجمند بیچاری کا کیا قصور؟''

''بے بے! تُو بھی بھولی ہے۔ شہر کے چکر تجھے کیا پتہ۔ اپنے صاحب ایک روز بیگم صاحب کو بتا رہے تھے کہ بٹ صاحب اپنی بیگم کے حُسن کو کیش کراتے ہیں۔ یہ اضافی ترقیاں، یہ ٹھاٹھ باٹھ یوں ہی تھوڑے ہیں۔''

آپا اور بے بے کی گفتگو سے میں جو اخذ کر سکی تھی وہ یہ تھا کہ نوشی کی ممی اور بھائی اور نوشی تینوں کو بٹ صاحب کا کوئی دوست اغوا کر کے لے گیا تھا۔ باقی باتیں اس وقت مجھے سمجھ نہیں آئی تھیں۔ ان کا ادراک بہت بعد میں کہیں جا کر ہوا لیکن اس وقت میرے اندر ایک خوف سا پیدا ہو گیا۔ مجھے بابا کی بات سچ لگنے لگی کہ برے دوست سے دوست کا نہ ہونا ہزار ہا درجے بہتر ہے۔ اور پھر مارے خوف کے کئی دن تک میں نے بابا کے لئے دعا نہیں کی۔ اور پھر ہولے ہولے میں نے خود ہی یہ فرض کر لیا کہ اگر بابا کے نصیب میں کوئی اچھا دوست ہے تو وہ خودبخود ہی اچانک کسی دن انہیں مل جائے گا۔

مگر شاید بابا نے میرے لئے دعا کرنا نہیں چھوڑا تھا کہ مجھے فرح مل گئی۔ اگرچہ دیر سے ہی بابا کی دعا قبول ہوئی تھی لیکن بہرحال قبول ہو گئی تھی۔ میں فزکس میں ایم ایس سی کر رہی تھی اور یہ میرا فائنل ایئر تھا۔ ایک دن لیب میں، میں نے فرح کو اکیلے بیٹھے روتے دیکھا تھا۔ میں ادھر سر حبیب کو ڈھونڈتے ہوئے آئی تھی۔ میں ان سے ایک مسئلے پر ڈسکس کرنا چاہتی تھی جو مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا اور مجھے عابد نے بتایا تھا کہ سر حبیب ابھی ابھی لیب کی طرف گئے ہیں۔ لیکن وہاں سر حبیب نہیں تھے اور فرح تھی جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور رو رہی تھی۔

فرح میرے ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھی۔ خوبصورت، گوری چٹی اور ہنس مکھ۔ کلاس کے تمام لڑکے لڑکیوں کے ساتھ اس کی دوستی تھی اور وہ ہر ایک سے بے تکلف تھی۔ نام کی حد تک میں اس سے واقف تھی اور ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں ہونے کی وجہ سے میں اسے اچھی طرح پہچانتی بھی تھی۔ سلام و دعا بھی تھی۔ دو ایک بار نوٹس کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔ بس جیسے کلاس کی دوسری لڑکیاں اور لڑکے تھے، وہ بھی میرے لئے ایسی ہی تھی۔

اگرچہ اب میں یونیورسٹی میں تھی لیکن ابھی تک میری کسی سے کوئی خاص دوستی نہیں ہوئی تھی۔ اتنی کہ میں یہ کہہ سکتی کہ وہ لڑکی میری دوست ہے یا کبھی اسے گھر بلاؤں یا اس کے گھر جاؤں۔

شاید میرے دل میں لفظ 'دوست' خوف پیدا کر دیتا تھا۔ شاید بچپن کی وہ یاد مجھے تکلیف دیتی تھی۔ حالانکہ کالج میں ایک دو لڑکیوں نے میرے قریب آنے کی کوشش بھی

کی تھی اور مجھے دوستی کی آفر بھی کی تھی۔ آمنہ نے تو بہت عرصے تک میرا ساتھ دیا تھا۔ کالج میں وہ میری سیٹ فیلو تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر کے ہر فنکشن میں مدعو کیا تھا، بھتیجوں کی سالگرہ، بسم اللہ کی رسموں سے لے کر بہن بھائیوں کی شادیوں تک میں۔ لیکن میں نے کسی فنکشن میں شرکت نہیں کی۔ نہ اسے اپنے گھر بلایا۔ یہاں تک کہ آخری دنوں میں تو وہ مجھ سے بات بھی نہ کرتی تھی۔ شاید میرے لاشعور میں کہیں کوئی خوف کا کانٹا چبھا تھا۔

بچپن میں کئی بار میں نے خواب دیکھا تھا کہ بابا اکیلے کمرے میں بیٹھے رو رہے ہیں اور مجھے بابا کا کوئی دوست نوشی کے ڈیڈی کے دوست کی طرح اغوا کر کے لے گیا ہے، مجھے، بے بے کو بھی اور عبدالغفور کو بھی۔ اور بابا بے چارے اکیلے رہ گئے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میرے لاشعور میں کوئی بات چھپ کر بیٹھ جاتی تو پھر نکلتی ہی نہ تھی۔ مجھے یاد ہے، ایک بار جب میں بہت چھوٹی تھی تو میں نے کمرے میں پنکھا چلایا تو تھوڑی دیر بعد ایک چڑیا پنکھے سے ٹکرا کر نیچے گری اور زخمی ہو گئی اور گرنے کے تھوڑی دیر بعد مر گئی۔ پتہ نہیں کب وہ کمرے میں آئی تھی اور کہیں بیٹھ گئی تھی۔ پھر کتنے سالوں تک پنکھا آن کرتے ہوئے میں خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ کسی چڑیا کو دیکھتی تو میرے اندر کپکپی طاری ہو جاتی۔ مجھے لگتا جیسے وہ چڑیا ابھی ٹکرا کر گر پڑے گی اور مر جائے گی۔ بلکہ آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی کبھی کبھی وہ منظر پوری جزئیات کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ شاید یہی کوئی خوف تھا میرے اندر کہ میں بڑی ہو کر بھی کوئی دوست نہ بنا پائی۔ یہ بات نہیں کہ میں جھینپو تھی یا مجھے کسی قسم کا کوئی کمپلیکس تھا۔ نہیں، میرے اندر بلا کی خود اعتمادی تھی اور ہے۔ اور مجھے کوئی کمپلیکس بھی نہیں تھا۔ میں اچھی، خوش شکل تھی۔ یہ تو نہیں کہ میں حسین ترین تھی لیکن یہ کہ خوش شکل تھی۔ اگرچہ میرا تعلق متوسط گھرانے سے تھا، میرے بابا گریڈ 17 کے آفیسر تھے۔ لیکن ہم دو بندوں کا خرچ ہی کتنا تھا۔ ہم بہت مزے سے زندگی گزار رہے تھے۔

میں اپنے ہم جماعت لڑکوں سے بات کرتے ہوئے ذرا بھی نہ جھجکتی تھی۔ سب لڑکے مجھے اپنے بابا اور عبدالغفور کی طرح لگتے تھے۔ مجھے ان میں کوئی خاص پراسراریت نہیں لگتی تھی۔ نہ ہی کسی کو دیکھ کر میرا دل دھڑکا تھا اور نہ ہی کبھی وجود میں تھرتھری سی ہوتی تھی۔ میں بس انہیں عام سے انداز میں دیکھتی۔ ان کی کسی بات کا جواب دیتی اور اپنی راہ چل پڑتی شاید میرے ہارمونز میں ہی کوئی گڑبڑ تھی کہ لڑکے مجھے اس طرح

اٹریکٹ نہیں کرتے تھے جس طرح کسی لڑکی کو کوئی لڑکا اٹریکٹ کرتا ہے۔

میرے لئے اگر کسی لڑکے میں کوئی اٹریکشن تھی تو یہ کہ وہ بڑا لائق ہے، اس کا ذہن بہت اچھا ہے، اس کے سوال بڑے اچھے ہوتے ہیں، جواب بڑے مدلل ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ شاید اسی لئے یونیورسٹی کے پہلے سال میں ایک دو منچلوں نے مجھے روبوٹ اور کمپیوٹر کہہ کر تپانے کی کوشش کی لیکن میں ان چھوٹی موٹی باتوں کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ اس لئے جب فرح کے رونے کی وجہ معلوم ہوئی تو میں کتنی ہی دیر حیرت سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ میرے لئے یہ بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ فرح کو روتے دیکھ کر میں غیر ارادی طور پر لیب میں چلی گئی تھی۔

"فرح ...... فرح! کیا ہوا ...... کیوں رو رہی ہو؟"

فرح نے سر اٹھا کر بہت حیرت سے مجھے دیکھا تھا، شاید میرا اس طرح اس سے پوچھنا اس کے لئے اور بھی حیرت کا باعث تھا۔ شاید وہ مجھے کوئی سخت دل، پتھر قسم کی لڑکی سمجھتی تھی۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ نہ میرا دل پتھر تھا، نہ میں بے حس تھی۔ میرے اندر ہر دُکھی آدمی کے لئے ہمدردی اور محبت کا جذبہ موجود تھا لیکن میں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ مجھے اظہار کرنے کا قرینہ ہی نہیں آتا تھا۔ بے بے بیمار ہوئی تو میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر اس کی تیمارداری کی۔ ہمارے کالج کے چوکیدار کو ٹی بی تھی تو میں اسے اپنے جیب خرچ سے دوائیں خرید کر دیتی تھی۔ بابا کے دفتر کے ایک کلرک کی بیوی بیمار تھی اور ہسپتال میں ایڈمٹ تھی تو میں اکثر بابا کے ساتھ اسے ہسپتال دیکھنے جاتی تھی اور پھر بابا سے پوچھ کر جب وہ صحت مند ہوئی تو میں اس کے بچوں کو گھر لے آئی تھی۔ پھر بھی میرے ہم جماعتوں کا خیال تھا کہ میں پتھر دل ہوں ...... بے حس ہوں اور نہ جانے کیا کیا۔ دراصل اس میں تھوڑا بہت آمنہ کا بھی ہاتھ تھا۔ اس نے میرے متعلق یہ افواہیں پھیلائی تھیں۔ بلکہ ان دنوں تو کالج میں کئی ایک اندازے لگائے جاتے تھے میرے بارے میں۔

کسی کا خیال تھا کہ میں بہت دولت مند فیملی سے تعلق رکھتی ہوں اور مغرور ہوں، کسی کے خیال میں میرا تعلق انتہائی نچلے طبقے سے تھا اس لئے میں کسی سے راہ و رسم نہیں بڑھاتی تھی کہ کہیں میرا بھرم نہ ٹوٹ جائے اور یہ خیال یونیورسٹی میں بھی پایا جاتا تھا، جیسا کہ بعد میں فرح نے مجھے بتایا تھا۔

اور ...... اور آمنہ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میرا تعلق "اُس بازار" سے ہے اور

میں ضد کر کے پڑھ رہی ہوں۔ وہ چونکہ میری سیٹ فیلو تھی اس لئے اکثر لوگ اس کی بات پر ایمان لے آئے تھے۔ اس لئے کالج کے آخری چند مہینوں میں لڑکیاں مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شاید میرے ساتھ بولنے یا رہنے سے میرے وجود کی گندگی ان سے بھی لپٹ جائے گی۔ حالانکہ برائی اور گندگی تو آدمی کے اپنے اندر، اپنے وجود میں ہوتی ہے۔ یہ تمام قیاس آرائیاں جو لڑکیاں میرے بارے میں کرتی تھیں، خودبخود مجھ تک پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی کوئی لڑکی آکر بتا دیتی۔

''سنو ظلِ ہما! فلاں لڑکی تمہارے متعلق یہ کہہ رہی تھی۔''

اور کبھی کوئی لڑکی۔

مجھے بڑی ہنسی آتی تھی کہ یہ لڑکی جو مجھے بڑے وثوق سے بڑی ہمدرد بن کر مجھے یہ بات بتا رہی ہے، جب میرے بارے میں بات ہو رہی ہوگی تو ممکن ہے یہ سب سے زیادہ بول رہی ہو۔ کیونکہ عورتوں میں یہ خامی ہے کہ وہ بات کو چھپا ہی نہیں سکتیں۔ بے بے کہتی تھیں۔

''عورتیں جب تک اپنے دل کی بات چار سے کہہ نہ لیں، ان کے پیٹ میں اُبال اٹھتے رہتے ہیں۔''

اور مجھے یہ بھی پتہ ہوتا تھا کہ اس لڑکی کو یقیناً کسی مضمون کے نوٹس چاہئے ہوں گے اور میں خاموشی سے اپنے نوٹس اس کے حوالے کر دیتی۔ میں اپنے نوٹس کسی کو دینے میں بالکل نہیں ہچکچاتی تھی۔ اس لئے کہ بابا کہتے تھے کہ اپنے علم کو چھپا کر رکھنے والا خسیس ہوتا ہے۔ علم کو صرف اپنے تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہئے۔ اور بابا کی باتیں تو مجھے ہمیشہ سچ لگتی تھیں جنہیں میں پلو میں باندھ لیا کرتی تھی۔

میں نے کبھی کسی کی بات سن کر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ فرق اس سے پڑتا ہے کہ میں کیا ہوں۔ البتہ مجھے اس بات پر ضرور دکھ ہوتا تھا کہ یہ کیسی لڑکیاں ہیں جو اپنی مطلب براری کے لئے اپنے آپ کو اور اپنی دوستوں کو دھوکا دیتی ہیں۔ ان دوستوں کا نام لے کر وہ مجھے ان کی قیاس آرائیاں بتاتی ہیں اور بلاشبہ یہ اچھی دوست ہرگز نہیں ہیں اور یہ کہ اچھا دوست تو نصیب سے ہی ملتا ہے۔

سو شاید فرح بھی کچھ تھوڑا بہت جانتی تھی۔ کیونکہ ہم نے ایک ہی کالج سے بی ایس سی کیا تھا۔ اس لئے اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''فرح!'' میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ ''تمہارے گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں......'' اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''پھر......'' میں نے اپنا ہاتھ بدستور اس کے بازو پر جمائے رکھا۔ ''اگر مناسب سمجھو تو مجھے اپنا پرابلم بتا دو......شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔''

اس نے پھر سر اُٹھا کر مجھے دیکھا لیکن اب اُس کی آنکھوں میں حیرت کی بجائے نمی تھی۔

''مجھ پر اعتماد کرو فرح۔ فرض کرو میں تمہاری مدد نہ بھی کر سکی تو تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں تمہیں کوئی اچھا مشورہ دے سکوں۔ اچھا چلو، میں مشورہ نہ دے سکی تو میرے بابا...... ہم بابا سے مشورہ کر سکتے ہیں۔''

''تمہارے بابا۔''

اس کی آنکھوں کی نمی ایک بار پھر خشک ہو گئی۔ میں نے اپنے گھر یا خاندان کے حوالے سے شاید پہلی بار کوئی بات کی تھی۔ شاید اُسے میرے بابا کے وجود کا یقین نہیں تھا یا پھر شاید وہ آمنہ کی بات کو سچ سمجھتی تھی۔ لیکن میں نے اس وقت ان ساری باتوں پر غور نہیں کیا بلکہ میرے ذہن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ کسی طرح اسے تسلی دے سکوں، اس کا دکھ بانٹ سکوں۔''

''ہاں...... میرے بابا......'' میں نے فخر سے کہا۔ ''ان کے پاس بہت علم ہے اور وہ بہت اچھے ہیں۔ بہت محبت کرنے والے، ہمدرد دوست۔ اگر میرے پاس تمہارے مسئلے کا حل نہ ہوا تو ہم بابا سے مدد لے سکتے ہیں اور یقین کرو فرح! میرے بابا بہت اچھے ہیں اور وہ تمہاری مدد ضرور کریں گے۔''

''میری مدد...... میری مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ تمہارے بابا بھی نہیں۔''

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ پہلے آہستہ آہستہ، پھر زور سے۔ حتیٰ کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور میں نے بے اختیار اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ہولے ہولے اسے تھپکنے لگی۔ میں چاہتی تھی وہ خوب سارا رو کر اپنے دل کا غبار نکال لے۔ پھر خود ہی وہ بتا دے گی۔

ہولے ہولے وہ سنبھل گئی۔ پہلے اس نے شوں شوں کر کے ناک صاف کی، پھر آنکھیں پونچھیں۔ جب وہ کچھ ریلیکس ہوئی تو میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم......'' اس نے الجھی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''اچھا ایسا کرو فرح......'' میں نے نرمی سے اسے خود سے الگ کیا۔ ''مجھ سے نہ سہی، اپنی کسی دوست سے، کسی بہت ہی اچھی دوست سے اپنا مسئلہ کہہ ڈالو۔''

''دوست سے......'' اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ''رابو ہے...... مانی ہے...... دونوں ہی بدتمیز ہلکے پیٹ کی ہیں۔ ابھی پورے ڈیپارٹمنٹ میں کہانیاں بکھری ہوں گی۔''

''پھر ایسا کرو، اپنے ممی ڈیڈی سے یا پھر اگر تمہارے بہن بھائی ہیں تو ان سے کہہ ڈالو۔ دیکھو، بابا کہتے ہیں ماں باپ سے بہتر کوئی دوست نہیں ہوتا۔ ان سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔ وہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا بھی دفاع کرتے ہیں اور ہمیں ہر ممکنہ خطرات سے بچا لیتے ہیں۔''

''ہاں...... تمہارے بابا صحیح کہتے ہیں...... لیکن میرے ممی ڈیڈی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اور پھر یوں بھی وہ بہت مصروف لوگ ہیں۔ ڈیڈی مصروف بزنس مین ہیں۔ ان کا بزنس دور تک پھیلا ہوا ہے اور ممی...... پتہ ہے تمہیں، میری ممی بہت مشہور رائٹر ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنف ہیں۔ فاطمہ رضا۔''

''ارے فاطمہ رضا......'' مجھے انجانی سی خوشی ہوئی۔

فاطمہ رضا کی کئی کتابیں بابا کی لائبریری میں تھیں اور ایک دفعہ بابا نے بتایا تھا کہ فاطمہ رضا بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے اپنی غفلت پر شرمندگی ہوئی کہ اتنے عرصے سے فرح رضا میرے ساتھ پڑھتی رہی ہے اور مجھے خبر تک نہیں کہ یہ مشہور رائٹر فاطمہ رضا کی بیٹی ہے۔

''اور جو میری ممی ہیں نا، وہ تو ڈیڈی سے بھی زیادہ مصروف رہتی ہیں۔ گھر میں ہوں تو لکھتی پڑھتی رہتی ہیں اور باہر ہوں تو مختلف ادبی تقریبات اٹینڈ کرتی رہتی ہیں۔ لوگ انہیں گھیرے رکھتے ہیں...... ان کی تعریفیں کرتے ہیں اور وہ دوسروں سے اپنی تعریفیں وصول کر کے بہت خوش رہتی ہیں۔ بہن کوئی ہے نہیں، ایک بڑا بھائی ہے۔ ایک حادثے میں اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی بلکہ کافی ہڈیاں ٹوٹی پھوٹی تھیں، بے شمار آپریشن ہوئے لیکن اس کی ٹانگ میں ہلکا سا نقص رہ گیا۔ معمولی سا لنگڑا کر چلتا ہے...... حالانکہ ڈیڈی کا سارا بزنس اسی نے سنبھالا ہوا ہے لیکن پھر بھی ہر وقت غصے میں رہتا ہے جیسے اس حادثے کے ذمہ دار ہم سب ہوں۔ اور مجھے اس سے بات کرتے ہوئے

ڈر لگتا ہے۔ حالانکہ اس کی شخصیت میں بلا کی کشش ہے۔ لڑکیاں اب بھی اسے اتنا ہی پسند کرتی ہیں جتنا کہ اس حادثے سے پہلے کرتی تھیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں، وہ اتنا غصیلا ہو گیا ہے۔ اس حادثے سے پہلے ہم میں بہت دوستی تھی اور وہ بہت خوش مزاج ہوتا تھا۔''

''تو......'' اس کی پوری بات نہایت اطمینان سے سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''تب تم اپنی فرینڈز سے اپنا پرابلم ڈسکس کر سکتی ہو۔ رابو اور مانی سے۔''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور لحہ بھر مجھے دیکھتی رہی۔

''ظلِ ہما! تم...... کیا تم میری دوست نہیں بن سکتیں؟''

''میں......؟'' میں گھبرا کر ہکلانے لگی۔ ''میں تو......''

''ہاں تم۔'' اس نے ملتجی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تم پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور تم ہی شاید مجھے کوئی راہ سجھا دو۔''

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگے۔ میں عجیب طرح سے پھنس گئی تھی۔ میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ میں کسی بھی طرح کی دوستی افورڈ نہیں کر سکتی۔ مجھے شاید دوستی کے تقاضے نبھانے آتے ہی نہیں۔ اس لئے تو آج تک میں نے کبھی کوئی دوست نہیں بنایا۔ لیکن بالکل غیر ارادی طور پر میرا سر اثبات میں ہل گیا اور اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''وعدہ کہ آج سے ہم دوست ہیں۔''

''وعدہ......'' میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کئی دن تک میں خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتی رہی کہ شاید بابا کی دعائیں اب اتنے عرصے بعد جا کر درِ قبولیت تک پہنچی ہیں اور یہ کہ اچھا دوست خود بخود ہی زندگی میں مل جاتا ہے اگر نصیب یاور ہو تو۔ بعد میں جا کر مجھے بھی یقین ہو گیا کہ واقعی بابا کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں اور فرح کی صورت میں مجھے ایک اچھی اور غم گسار دوست مل گئی تھی۔

''چلو آؤ، کہیں باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' فرح نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور ہم دونوں لیب سے باہر آ گئے تھے۔

''ہاں، اب بتاؤ۔'' ایک بالکل الگ تھلگ کونے میں بیٹھتے ہوئے میں نے فرح سے پوچھا۔

''وہ...... وہ جو سر حبیب ہیں نا......''

''ہاں کیا ہوا؟''
''وہ ...... وہ ......'' اُس کی آواز بھرا گئی۔
''کیا انہوں نے ڈانٹ دیا تمہیں؟''
''نہیں۔''
''پھر......؟''
''وہ ...... وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔''
''تو کیا ہوا، مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ وہ ہیں ہی اچھے۔ ان کے پاس اتنا علم ہیں، ان کے پڑھانے کا طریقہ بھی بہت موثر ہے۔'' میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔
''ہاں، لیکن ظلِ ہما! تم میری بات کو سمجھ نہیں رہی ہو۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔ ''میں ...... میں ان سے محبت کرنے لگی ہوں۔ بہت ہی شدید قسم کی محبت۔ اور اگر انہوں نے میری محبت کی پذیرائی نہ کی تو میں مر جاؤں گی۔ خدا کی قسم، مر جاؤں گی ظلِ ہما!''

وہ پھر رونے لگی۔ میں گھبرا گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہہ کر تسلی دوں۔ محبت تو ایک بڑا پاکیزہ اور ارفع جذبہ ہے۔ ایک بار بابا نے نہ جانے کس بات پر کہا تھا کہ محبت کرنے والوں کو تو اس بات کی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ کوئی ان کی محبت کی پذیرائی کر رہا ہے یا نہیں۔ پھر یہ فرح رضا آخر اتنا رو کیوں رہی ہے؟ یہ کوئی پچھتاوے یا ندامت کی بات تو نہیں ہے۔
''کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ظلِ ہما!'' روتے روتے اس نے پوچھا۔
''ہاں ...... میں بابا سے، چاچا عبدالغفور سے اور بے بے سے محبت کرتی ہوں۔''
''نہیں، اس طرح کی محبت۔ جیسی میں کرتی ہوں، سر حبیب سے۔''
''یہ کیسی محبت ہے؟'' میں نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا اور سوچا کیا یہ کوئی مختلف قسم کی محبت ہے؟ دراصل میں نے اس محبت کے متعلق کچھ اتنا سنا نہیں تھا۔ نہ تو میں نے کبھی ٹی وی دیکھا تھا نہ ہی فلم اور نہ ہی کبھی کوئی افسانہ یا ناول پڑھا تھا۔ میری دنیا صرف نصاب کی کتابوں تک محدود تھی۔ میں نے بتایا ہے نا کہ مردوں نے مجھے کبھی اٹریکٹ نہیں کیا تھا۔ لفظ محبت سے تو میں آشنا تھی لیکن فرح کی بات کچھ زیادہ میرے پلے نہیں پڑی تھی۔ دو چار خواتین کے رسالے پڑھ رکھے ہوتے تو فرح کی حالت پر مجھے اتنی تشویش ہرگز نہ ہوتی۔

''اور خدا کرے، تمہیں ایسی محبت کسی سے نہ ہو۔'' فرح نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں ہر وقت ان کے متعلق سوچتی رہتی ہوں ظلِ ہما! اٹھتے بیٹھتے، کام کرتے ہوئے، پڑھتے ہوئے ہمہ وقت ان کا خیال میرے ذہن میں رہتا ہے۔ ان کی صورت میری نگاہوں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔ رات کو جب میں بستر پر لیٹتی ہوں تو نیند بھاگ جاتی ہے۔ تم میری تڑپ اور بے چینی کو نہیں سمجھ سکتیں ظلِ ہما!''
''ہاں ......'' میں نے سچائی سے اعتراف کیا۔
''میرے اندر ایک آگ لگی ہے ...... تن من جل رہا ہے ...... پلیز، مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟''
میں جو خود کو بڑا سقراط بقراط سمجھتی تھی اور چھوٹی عمر سے ہی پہلی پوزیشن لیتی آ رہی تھی، ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔
''ایسا کرتے ہیں، بابا سے پوچھتے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو نا ہمارے گھر۔''
''نہیں، نہیں ظلِ ہما! یہ بات بابا سے کرنے کی نہیں ہے۔''
''تو......؟'' میں سوچنے لگی کہ اس مسئلے کا کیا حل ہو؟ بالآخر مجھے ایک حل سوجھ ہی گیا۔
''تم سر حبیب سے کیوں نہیں کہتیں؟ انہیں بتا دو سب کچھ۔ اور پھر ان سے کہو کہ وہ ان سے شادی کر لیں۔ یعنی اپنا رشتہ تمہارے لئے بھیج دیں۔''
''یہ سب اتنا آسان کہاں ہے؟'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے وہاں لیب میں، میں نے ان سے بات کرنا چاہی تھی تو انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں اسی لئے تو انہوں نے۔''
''اوہ ......تو تب ہی رو رہی تھیں؟''
''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
''اور تم اب کیا چاہتی ہو؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔
''میں چاہتی ہوں کہ سر حبیب بھی مجھ سے ......''
یہ بڑا گمبھیر مسئلہ تھا اور فی الحال اس کا کوئی حل میرے پاس نہ تھا۔ جبکہ ہم اس بات سے بھی لاعلم تھے کہ سر حبیب شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ۔ خود فرح کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔
''کم از کم محبت کرنے سے پہلے اتنا تو پتہ کر لینا چاہئے تھا تمہیں۔'' میں نے اسے

سرزنش کی تو وہ مسکرا دی۔

''ہما! محبت کوئی فزکس کا نیومیریکل تو نہیں ہے نا ...... نہ کوئی فارمولا ہے۔ یہ تو خود بخود ہو جاتی ہے ...... روح میں اتر جاتی ہے اور محبت کے لئے وصل ضروری بھی نہیں ہے۔''

''تو پھر تم اتنا دُھواں دھار رو کیوں رہی تھیں؟'' مجھے واقعی حیرت ہوئی۔

''میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ میری محبت قبول کر لی جائے۔ وہ بھی مجھ سے محبت کریں۔ محبت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔''

''یعنی تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ شادی شدہ ہوں؟''

''ہاں......'' اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے۔

یہ واقعی گمبھیر مسئلہ تھا جو اگلے چھ سات مہینوں میں بھی حل نہ ہو سکا۔ لیکن میری اور فرح کی دوستی ان چھ سات ماہ میں بہت مضبوط ہوگئی۔ اگرچہ ان چھ سات ماہ میں، میں صرف اس کے آنسو پونچھنے اور تسلیاں دینے کے علاوہ اس کے کوئی کام نہ آسکی۔ کیونکہ سر حبیب نہ صرف شادی شدہ تھے بلکہ تین بچوں کے باپ بھی تھے۔ پھر بھی فرح میری احسان مند رہتی تھی اور اسے میری دوستی پر فخر تھا۔ اتنے تھوڑے سے عرصے میں ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ جب پہلی بار وہ میرے ساتھ گھر آئی تھی تو بابا بہت خوش ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی خوشی کا اظہار بھی کیا تھا۔

''مجھے تمہارے اندر یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔''

''بابا! یہ آپ کی دعا ہے۔ فرح رضا۔'' میں نے اس کا تعارف یہ کہہ کر کروایا تھا اور بابا کو اپنی برسوں پرانی بات یاد آ گئی تھی اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگے تھے۔ میرے اور بابا کے درمیان یہی بات تو مزے کی تھی کہ ہمیں کسی بات کو دہرانا یا اس کی وضاحت کرنا نہیں پڑتا تھا۔ ہم ایک لمحے میں ساری بات سمجھ لیتے تھے اور فرح بھی بابا سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔

''تمہارے بابا بہت اچھے ہیں ...... اور تمہارے گھر میں بہت سکون ہے۔''

اور جب فرح چلی گئی تھی تو بابا بہت مطمئن اور پُرسکون سے بیٹھے مجھے تکتے رہے تھے۔

''پتہ ہے ظلِ ہما! کبھی کبھی تمہاری طرف سے ڈر جاتا تھا کہ نہ تمہاری کوئی دوست ہے نہ بہن ہے نہ چچا زاد، خالہ زاد وغیرہ۔ کہیں آگے چل کر تمہاری زندگی تمہارے لئے مشکل نہ ہو جائے۔''

''کیوں بابا؟'' میں بابا کی بات نہ سمجھ سکی تھی۔

''میں سمجھتا تھا کہ شاید اس میں میرا قصور ہے اور یہ کہ تم میں لوگوں کے ساتھ مکس اَپ ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور آدمی اکیلے تو نہیں رہ سکتا نا۔ کبھی کبھی تنہائی آدمی کو پاگل کر دیتی ہے۔ لیکن اب فرح کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔''

''بابا! ایسی تو کوئی بات نہیں تھی کہ میں کسی کے ساتھ مکس اَپ نہیں ہوتی۔ دراصل میں تو انتظار کر رہی تھی کہ جب اللہ نصیب یاوری کرے گا مجھے اچھی دوست مل جائے گی، سو اب مل گئی۔ دیر آید درست آید۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ فرح اچھی لڑکی ہے۔''

''اور فاطمہ رضا کی بیٹی۔''

''ارے......'' بابا اچھل پڑے۔ ''یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ وہ ایک بڑی رائٹر ہے۔ چھا جانے والی ادیبہ۔''

پھر بہت دیر تک بابا فاطمہ رضا کی تحریروں کے متعلق مجھے بتاتے رہے اور میں چپ چاپ سنتی رہی۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے ادب اور شاعری وغیرہ سے کوئی دلچسپی کیوں پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ بابا ادب کے رسیا تھے۔ میں نے نصاب کے علاوہ اگر کچھ کتابیں پڑھی بھی تھیں تو ان کا تعلق میرے مضمون سے ہی تھا یا پھر وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے موضوع پر تھیں۔ فرح اور مجھ میں اگر کوئی بات مشترک تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ اسے بھی ادب اور شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ورنہ میری اور اس کی عادات میں بہت فرق تھا۔ پھر ہمارے طبقے بھی مختلف تھے۔ وہ بہت بڑے بزنس مین کی بیٹی تھی۔ گلشن اقبال میں اس کا کئی کنال پر بنا ہوا گھر تھا۔ جب کہ میرا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ یونیورسٹی میں سب نے ہماری دوستی کو حیرت سے دیکھا تھا۔ کچھ نے فقرے بھی اچھالے۔

''لو ...... پتھر میں بھی جونک لگ گئی۔''

''فرح کی دولت سے متاثر ہو گئی۔''

''نہیں، اس کے بھائی کی وجاہت لے ڈوبی۔'' وغیرہ وغیرہ۔

''پتہ نہیں، لوگ اتنے حاسد کیوں ہوتے ہیں؟ اور بلا جواز دوسروں کے متعلق فضول اور غلط باتیں کیسے اور کیوں کر لیتے ہیں؟ یہ مجھے کبھی سمجھ نہیں آیا۔ لیکن چونکہ میں نے زندگی میں ایسی باتوں کی پہلے بھی کبھی پرواہ نہیں کی تھی اس لئے اب بھی نہ کرتی۔ البتہ

فرح چڑ جاتی، الجھ پڑتی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میں نہ تو فرح کے اسٹیٹس سے باخبر تھی اور نہ ہی مجھے اس کے بھائی کی وجاہت کا علم تھا۔ میں اس کے گھر کبھی نہیں گئی تھی۔ لیکن وہ اکثر میرے ساتھ گھر آ جاتی تھی۔ جب وہ بہت ڈیپریس ہوتی تو میں اسے زبردستی ساتھ لے آتی۔ پھر ہم ڈھیر ساری باتیں کرتے بلکہ میں تو زیادہ سنتی ہی تھی، وہ ہی بولتی رہتی تھی۔ ان چند ماہ میں، میں اس کے گھر کے ایک ایک فرد سے واقف ہوگئی تھی۔ ان کی پسند ناپسند، ان کے شوق، دلچسپیاں، عادات، سب سے۔ حتیٰ کہ بابا بھی سب کچھ جان گئے تھے۔ اکثر بابا بھی ہماری گفتگو میں شریک رہتے تھے اور فرح ان سے بہت متاثر ہوتی۔

جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ سر حبیب تین اچھے خاصے بڑے بچوں کے باپ ہیں تب سے اس کی محبت کی شدت کم ہوگئی تھی لیکن پھر بھی کبھی کبھی وہ بہت ڈیپریس ہو جاتی تو پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ میز پر مکے مار مار کر مجھ سے پوچھتی۔

''بتاؤ نا ظلِ ہما! اگر مجھے محبت ہونی ہی تھی تو پھر سر حبیب سے کیوں ہوئی؟ احمر، عادل، محسن وغیرہ سے کیوں نہ ہوئی؟ وہ بھی تو آخر مرد ہیں نا۔ اور عادل تو بہت خوبصورت، وجیہہ لڑکا ہے۔ سر حبیب سے کہیں زیادہ۔ پھر مجھے پتہ ہے وہ تھوڑا تھوڑا مجھے پسند بھی کرتا تھا مگر میرا دل......''

اور واقعی یہ سوچنے والی بات تھی کہ فرح کو سر حبیب سے ہی آخر محبت کیوں ہوئی؟ احمر یا عادل سے کیوں نہ ہوگئی؟ حالانکہ عادل کی شخصیت میں بھی بلا کی کشش تھی۔ (بقول فرح کے مجھ یہ کشش وشش کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی) میں نے اس بات پر کافی غور کیا تو مجھے اس کا یہ جواز سمجھ میں آیا کہ بچے خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، اپنے اساتذہ سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور لڑکیاں خاص طور پر۔ مجھے یاد تھا سکول میں، میں نے اکثر لڑکیوں کو دیکھا تھا کہ وہ اپنی پسندیدہ ٹیچر کو پھول دینے کے لئے ان کے آنے سے پہلے گھنٹوں گیٹ پر کھڑی رہتی تھیں۔ کلاس میں بیٹھ کر، ٹیچر کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتیں اور کاپیوں پر ان کے نام لکھ لکھ کر مٹایا کرتی تھیں۔ آج کل کی لڑکیاں تو بہت میچورڈ ہوتی ہیں۔ شاید وہ ایسا نہ کرتی ہوں۔ لیکن میں جب سکول میں پڑھتی تھی تو ایسا ہی تھا تو فرح کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ سر حبیب سے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہی متاثر ہوئی تھی۔ اکثر طلباء ان سے متاثر تھے۔ بلاشبہ وہ ایک بہت اچھے ٹیچر تھے لیکن فرح اپنے جذبے کی صحیح طرح سے تشخیص نہیں کر سکی تھی اور چونکہ سر حبیب

کا تعلق جنسِ مخالف سے تھا اس لئے وہ اسے محبت سمجھ بیٹھی تھی اور اس محبت کا اظہار بھی انتہائی بھونڈے طریقے سے کر چکی تھی اور شاید اسے اس محبت سے زیادہ اپنے اس اظہار پر ندامت تھی اس لئے اسے یہ ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔ لیکن سر حبیب بلاشبہ انتہائی شریف آدمی تھے کہ انہوں نے اس کی اس دیوانگی سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ایک روز اسے اپنے بچوں سے ملوا دیا۔ اس روز ہم دونوں لائبریری کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے سے وہ آ گئے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا۔ تیرہ چودہ برس کا۔

''مس فرح! یہ میرا بیٹا ہے...... بڑا بیٹا۔ دو بچے اور بھی ہیں۔ اس سے چھوٹے۔''

وہ شاید اسی مقصد کے لئے اپنے بیٹے کو لائے تھے۔ انہوں نے فرح سے صاف الفاظ میں کچھ نہیں کہا تھا لیکن جتلا دیا تھا کہ وہ غلط راستے پر ہے۔

''ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہے جو ہماری جنت ہے۔''

انہوں نے خوش دلی سے کہا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور میں ان کی عظمت کی قائل ہوگئی۔

''بلاشبہ سر حبیب کا تعلق کسی اور سیارے سے ہے۔'' میں نے اظہارِ خیال کیا۔

''ورنہ اس سیارے کا مرد ہو اور فرح جیسی دیوانی لڑکی۔ اگر واقعی یہ محبت کی کوئی قسم ہے تو تمہیں اپنی محبت پر شرمندہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ فخر کرنا چاہئے کہ تم نے ایک ایسے انسان سے محبت کی ہے جو بلاشبہ محبت کرنے کے قابل ہے۔''

اور میں جو محبت کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھی۔ ہولے ہولے فرح کو سمجھانے میں کامیاب ہوگئی اور فرح بہت حد تک عادل کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ اگرچہ ابھی تک اس نے محبت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔

''میں تمہاری بہت ممنون ہوں ہما! اگر تم نہ ہوتیں تو سچ مچ میں خودکشی کر لیتی یا مر جاتی۔ یہ محبت ایسی ہی ظالم شے ہوتی ہے۔ پر تمہیں کیا پتہ؟''

وہ کبھی کبھی کہتی تھی۔

اور واقعی مجھے کیا پتہ تھا۔ میرا دل تو کبھی کسی کو دیکھ کر اس طرح نہ دھڑکا تھا جس طرح بقول فرح اس کا دھڑک اٹھتا تھا۔ میں ناصر حبیب سے ایک ایک گھنٹے تک کسی مشکل مسئلے پر بحث کرتی رہتی تھی اور میں اس کی ذہانت کی اور اس کی Ready wit (فوراً سمجھ جانے والی عقل یا صلاحیت) کی بہت معترف تھی۔ اور ایک دو بار میں نے اس کا اعتراف بھی کیا تھا لیکن ناصر سے باتیں کرتے ہوئے میں نہ کبھی سرخ ہوئی، نہ میری

دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ ایک دو بار ناصر نے میرے بے حد لمبے بالوں کی اور میرے خوبصورت قد کی تعریف بھی کی لیکن مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے سادگی سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے بتایا کہ میرا قد میری ماں کی طرح ہے اور لمبے بال بابا کو بہت پسند ہیں۔ اس لئے انہوں نے بچپن سے ہی مجھے بال کٹوانے نہیں دیئے اور اب بھی ہفتے میں دو بار بے بے ناریل کے تیل کی مالش کرتی ہے۔ بات مکمل کر کے جب میں نے ناصر کی طرف دیکھا تو اس کی شکل عجیب سی ہو رہی تھی جیسے وہ کونین کی گولی کھا رہا ہو۔ اور ایک بار فرح نے انکشاف کیا تھا کہ ناصر مجھ سے متاثر ہو رہا ہے۔

اور غالباً وہ میری محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ مگر میں نے اس کی بات پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ دراصل میرے پاس کسی اور موضوع پر سوچنے کے لئے وقت بالکل نہیں تھا۔ میں اپنی پوزیشن برقرار رکھنا چاہتی تھی اور پہلے ہی میرے وقت کا بہت سا حصہ فرح کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔

فرح بلا شبہ ایک اچھی دوست تھی اور مجھے اپنی خوش نصیبی پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں تھا۔ جب بابا بیمار ہوئے اور انہیں ہسپتال میں ایڈمٹ کرانا پڑا تو وہ نہ صرف یہ کہ میرے ساتھ ہی ہسپتال میں رہی بلکہ جب میں روتی تو میرے ساتھ وہ بھی دھواں دھار روتی۔ مجھے تسلیاں دیتی، میرے ساتھ ڈاکٹروں کی طرف دوڑتی بھاگتی۔ گھر سے بے بے اور عبدالغفور کو لانا لے جانا، صبح دوپہر شام بابا کے لئے کھانا، چائے وغیرہ لانا۔ سب اُس نے اپنے ذمے لے لیا تھا کیونکہ اس کے پاس گاڑی تھی اور اسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔

مجھے ذرا سا فلو بھی ہوتا تو یونیورسٹی سے بھاگی چلی آتی۔ رابو، مانی اور دوسری لڑکیاں ہماری اتنی شدید دوستی پر بہت حیران ہوتی تھیں لیکن مجھے یا فرح کو اس کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ امتحان ہونے تک فرح کے مرض میں کافی افاقہ ہو گیا تھا۔ عادل اور وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے اور یونیورسٹی چھوڑنے سے پہلے عادل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجے گا۔ اور اس نے اپنا وعدہ نبھایا بھی تھا۔

فرح کے گھر اچھی خاصی آزادی تھی۔ اس کے ڈیڈی اور ممی نے یہ کہہ کر کہ زندگیاں بچوں کو گزارنی ہیں اور اپنے فیصلے بھی انہوں نے ہی کرنے ہیں، عادل کا پرپوزل قبول کر لیا تھا اور کچھ دنوں بعد منگنی کی تقریب ہونا طے پائی تھی۔ اُس کی منگنی میں میری

شرکت لازمی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ جس روز اُس کی منگنی تھی، اُس روز بابا حج کے لئے روانہ ہو رہے تھے اور میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اس کی منگنی میں شرکت کر سکوں۔ البتہ میں نے فرح سے وعدہ کر لیا تھا کہ بابا کو سی آف کر کے میں اس کے پاس آؤں گی۔ میں کراچی تک بابا کے ساتھ جا رہی تھی۔ دراصل بابا نے کراچی سے جانا تھا اور فرح نے بابا سے بھی اجازت لے لی تھی کہ اُن کے حج کے دوران میں اُس کے پاس اُس کے گھر میں رہوں گی۔

چونکہ فرح میری واحد دوست ہے جیسا کہ میں کہہ رہی تھی، میری اکلوتی دوست۔ مگر بہرحال وہ میری دوست ہے۔ اور مجھے بابا کے رخصت ہونے کے بعد اب اس کے گھر جانا ہے اور یہ طے ہے۔ اس لئے بابا کے سامان کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی پیکنگ بھی کر لی ہے۔ اب پتہ نہیں وہاں اس کے گھر میں میرا دل لگے گا بھی یا نہیں۔ لیکن بہرحال مجھے جانا تو ہے۔ اور یوں بھی میرے جانے کا سن کر بے بے اور عبدالغفور نے بھی گاؤں جانے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ بے چارے کتنے عرصے سے گاؤں نہیں گئے۔ اگر فرح کے ساتھ میری دوستی نہ ہوتی تو شاید میں بھی اب بابا کے ساتھ جا رہی ہوتی لیکن پتہ نہیں کیوں، بابا نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا پروگرام نہیں بنایا۔ شاید وہ میرے اندر کچھ اور تبدیلیاں لانا چاہتے تھے مگر کیا؟ یہ مجھے نہیں پتہ۔ لیکن بابا کل شام کہہ رہے تھے کہ میں چاہتا ہوں ظلِ ہما، تم گھومو پھرو، لوگوں سے ملو اور لوگوں کی طرح سوچو۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح۔ جو لوگ، خاص کر وہ لڑکیاں جو مختلف سوچ رکھتی ہوں نا، وہ بہت دکھ اٹھاتی ہیں۔ اور بابا کی یہ بات مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی۔

تاہم میں نے بابا سے بحث نہیں کی تھی۔ اس لئے کہ میں بحث کے موڈ میں نہیں تھی۔ کیونکہ میں بابا کے جانے سے اداس تھی۔ زندگی میں پہلی بار میں بابا سے اتنے دنوں کے لئے بچھڑ رہی تھی۔ شاید بابا ایسا جان بوجھ کر کر رہے تھے تاکہ میرے اندر مزید حوصلہ پیدا ہو ان سے بچھڑ جانے کا۔ کیونکہ ایک روز وہ بے بے سے میری شادی کی باتیں کر رہے تھے جبکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

میں رزلٹ کے بعد جاب کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن میں اپنی خواہش کا اظہار اب بابا کی واپسی پر ہی کروں گی۔ کل صبح ہمیں یہاں سے روانہ ہونا ہے اور پھر میں اور چاچا عبدالغفور دو دن بعد واپس آ جائیں گے اور پھر مجھے فرح کے پاس چلے جانا ہے اور بے بے اور چاچا کو اپنے گاؤں۔ فرح کے ساتھ رہنے سے مجھے بھی اِدھر اُدھر کی ہانکنے

کی عادت ہوگئی ہے۔ حالانکہ بات تو صرف اتنی سی تھی کہ مجھے بابا کے بعد فرح کے گھر رہنا ہے اور فرح رضا میری اکلوتی دوست ہے۔

***

اور مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ میرے ساتھ ......

میں ظلِ ہما۔

جس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ میں روبوٹ ہوں یا شاید میں نارمل نہیں ہوں۔

اور یہ بات ایک بار میری واحد دوست فرح رضا نے کہی تھی جب وہ دھواں دھار رو رہی تھی اور میں اسے سمجھا رہی تھی کہ محبت خود بخود دل میں جنم نہیں لیتی بلکہ کئی عوامل ہوتے ہیں جو سب مل کر ہمارے اندر اس جذبے کو پیدا کرتے ہیں اور یہ کہ محبت کو روگ نہیں بنانا چاہئے، وغیرہ وغیرہ۔

اور تب اُس نے کہا تھا۔

''تم نارمل نہیں ہو ظلِ ہما! تمہارے اندر کہیں کوئی کمی ہے۔ یہ تو ایک نیچرل جذبہ ہے اور ہر جاندار میں ہے۔ منفی اور مثبت ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔ جس طرح لوہا اور مقناطیس۔ کچھ اشیاء میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ کچھ میں زیادہ ہوتی ہے لیکن ہوتی تو ہے نا۔''

''لیکن کچھ میں بالکل بھی نہیں ہوتی۔ جیسے یہ چینی کی پلیٹ۔ تم مقناطیس اس کے کتنے قریب بھی رکھ دو تب بھی اس پر اثر نہیں ہوگا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں ...... اور اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم سچ مچ ابنارمل ہو۔'' فرح نے جل کر کہا تھا۔ ''ورنہ ناصر کی محبت کا کچھ تو اثر ہوتا تم پر۔''

اور شاید کمرے میں آتے بابا نے بھی اُس کی یہ بات سن لی تھی کہ اس روز میں نے ان کے چہرے پر تفکر کی لکیریں دیکھی تھیں۔ وہ کئی بار بے دھیانی میں مجھے دیکھتے رہے تھے۔ سوچتے رہے تھے اور میں نے پوچھا بھی تھا۔

''بابا! کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں، بیٹا! بس سوچ رہا تھا کہ تم باہر نکلا کرو، گھوما پھرا کرو۔ کیا ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ ٹی وی دیکھا کرو۔ فارغ ہو تو اچھی کتابیں پڑھا کرو۔''

اور شاید بابا کا بھی خیال یہی تھا کہ میں نارمل نہیں ہوں۔ تب ہی تو وہ چاہتے تھے کہ میں بدل جاؤں ...... میرے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا ہوں۔

اور میرے اندر سچ مچ کتنی بڑی تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ ایک دم اچانک ...... اور فرح کہتی تھی کہ محبت کوئی سائنس کا فارمولا نہیں ہے۔ یہ تو بس اچانک حملہ کرتی ہے اور آدمی کو بے بس کر دیتی ہے۔ اور میں بھی چاروں شانے چت گر پڑی تھی۔

بے بس ہوگئی تھی۔

میں جو روبوٹ تھی۔

ایک مشین۔

جو ہر کام کرتی ہے لیکن احساسات نہیں رکھتی۔ لطیف جذبوں سے عاری ہوتی ہے۔

فرح رضا کے گھر میں ہی ایک دن میں نے ایک ڈائجسٹ میں ایک روبوٹ کی کہانی پڑھی تھی۔ جس کے دل میں اچانک لطیف جذبات بیدار ہو گئے تھے اور جو اپنے مالک کی بیٹی سے محبت کرنے لگا تھا۔

اور یہ کیسی انہونی اور ناقابل یقین بات تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک فرح سے اس کہانی پر ڈسکس کرتی رہی تھی اور ہنستی رہی تھی کہ یہ لکھنے والے بھی بس یوں ہی لکھ دیتے ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے۔ محض چھپنے کے شوق میں۔

اور میرے ساتھ بھی یہ انہونی ہو گئی تھی۔ یعنی میں، ظلِ ہما محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ وہی محبت جو ازل سے آدم اور حوا کے درمیان ہے۔

اور یہ محبت پتہ نہیں کب، کیسے اور کیوں پیدا ہوگئی تھی۔

اس کی وجہ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی ہے۔

حالانکہ وہ ناصر حسیب سے زیادہ خوبصورت ہرگز نہیں تھا۔ لیکن میرے دل کے سارے بند دروازے اچانک ہی اس کے لئے کھل گئے تھے۔

محبت تو میں نے بھی عام لڑکیوں کی طرح ہی کی تھی لیکن میرے ساتھ کچھ مختلف ضرور ہوا تھا اور شاید بابا صحیح کہتے تھے کہ لڑکیوں کو مختلف نہیں ہونا چاہئے۔ اور یہ بات میں نے وہاں فرح کے گھر میں فاطمہ رضا کے ایک ناول میں بھی پڑھی تھی اور بابا نے کہا تھا۔

''مختلف لڑکیاں عام لڑکیوں کی نسبت زیادہ دُکھ اٹھاتی ہیں۔''

اور شاید مجھے بھی زیادہ دُکھ اٹھانے ہیں۔ یہ مجھے پتہ ہے۔

فرح کے گھر میں تقریباً ایک ماہ رہی اور اس ایک ماہ میں میرے اندر کتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ میں ابھی تک حیران ہوں۔

کراچی سے واپس آتے ہی میں نے فرح کو فون کر دیا تھا اور فرح اسی وقت مجھے لینے آ گئی تھی اور بے بے نے مجھے بہت ساری نصیحتیں کی تھیں۔

اپنا خیال رکھنا۔

اپنی صحت کا۔

اپنے کھانے پینے کا۔

اور اسی وقت مجھے بے بے کی محبت کا احساس ہوا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ بابا نے بے بے کو لانے کا فیصلہ بروقت کیا تھا اور بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک کئی بار مجھے بے بے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

''دل گھبرائے تو خط لکھ دینا۔ ہم دونوں آ جائیں گے۔'' عبدالغفور چاچا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

''میں کوئی پردیس تو نہیں جا رہی، اسی شہر میں ہوں چاچا! تم واپس آ جاؤ تو مجھے فون کر دینا۔ میں آ جاؤں گی۔''

''چاچا! خبردار، ایک ماہ سے پہلے تمہارا دل گھبرایا اور تم واپس آئے تو۔'' فرح نے اسے دھمکی دی۔ ''دس ماہ کی اس دوستی میں تم ایک بار بھی میرے گھر نہیں آئیں۔ اور یہ اس کی سزا ہے کہ میں تمہیں بابا کے آنے تک ملنے بھی نہیں دوں گی۔''

اور میں فرح کی اس محبت پر ہنس دی تھی۔ فرح کی انگلی میں خوبصورت انگوٹھی تھی اور وہ خوش دکھائی دیتی تھی۔

''سب ٹھیک رہا نا؟''

''ہاں......'' فرح نے ڈرائیو کرتے ہوئے بتایا۔ ''فنکشن بہت شاندار رہا۔''

''ڈیپارٹمنٹ سے کون کون آیا تھا؟''

''تقریباً سب ہی...... ناصر کے سوا۔''

''کیوں، ناصر کیوں نہیں آیا تھا؟'' میں نے یونہی پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے انوائٹ نہیں کیا تھا؟''

''انوائٹ کیا تھا...... لیکن اس نے معذرت کر لی تھی۔ تم جانتی ہو کیوں؟''

''نہیں تو...... بھلا مجھے کیا پتہ؟ امتحانوں کے بعد میری ملاقات نہیں ہوئی اس سے بھی۔''

''تمہاری وجہ سے۔''

''میری وجہ سے......؟'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''بھلا میری وجہ سے کیوں؟''

''اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ تمہیں بھلانا چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمہیں دیکھ کر......''

اور میں دل ہی دل میں ہنس دی تھی کیونکہ میرے نزدیک محبت ایک اجنبی مرد اور عورت کے درمیان کوئی حقیقی جذبہ نہیں ہے۔ ہاں، شادی کے بعد اس جذبے کا پیدا ہونا فطری ہے۔ ظاہر ہے۔ اتنی قریبی رفاقت میں محبت کا جذبہ پیدا ہونا لازمی ہے۔

''مگر......'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔ ''خیر چھوڑو اور بتاؤ کوئی نئی بات۔''

''نئی بات...... سر حبیب بھی آئے تھے۔ ان کی مسز بھی تھیں اور بچے بھی۔''

''تم نے سر حبیب کو بھی بلایا تھا؟''

''ہاں۔''

میں نے دیکھا، سر حبیب کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو گئی تھیں اور چہرے پر چند لمحے پہلے نظر آنے والی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

'تو کیا ابھی تک اس کے دل میں سر حبیب کا خیال ہے؟'

میں نے کتنی دعائیں کی تھیں اور کتنے خلوص سے دعا کی تھی کہ اس کے دل سے سر حبیب کا خیال نکل جائے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اس کے دل میں سر حبیب کا خیال اب نہیں رہا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میری دعائیں قبول نہیں ہوتی تھیں۔ شاید مجھے دعا مانگنے کا قرینہ نہیں آتا تھا۔ اور بے بے کہتی تھی کہ روز گڑگڑا کر دعا مانگی جائے تو قبول ہوتی ہے۔

مگر......

اور وہ ایک دعا جو میں نے اپنی ذات کے لئے، اپنی خوشی کے لئے کی ہے اس کے لئے میں کتنا روئی ہوں، گڑگڑائی ہوں لیکن......

''تم نے سر حبیب کو کیوں بلایا تھا فرح؟'' اس کے گھر پہنچ کر اس کے کمرے میں بیڈ پر آرام سے بیٹھتے ہوئے جب میں نے پوچھا تو اس نے نگاہیں چرا لی تھیں۔

''یونہی......'' اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''شاید میں انہیں جتانا چاہتی تھی کہ وہ جو ایک بار میں نے ان سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا وہ محض......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور اس نے ایک دم ہی اپنا رخ موڑ لیا تھا۔ ''سر حبیب بہت مطمئن اور خوش دکھائی دیتے تھے اور انہوں نے بڑی گرم جوشی سے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''مجھے امید ہے تم بہت خوش رہو گی۔ عادل

بہت اچھا لڑکا ہے۔'' وہ رخ موڑے موڑے ہی بول رہی تھی۔ ''اور انہوں نے میرا تعارف اپنی بیوی سے یہ کہہ کر کروایا کہ ''یہ میری بہت ذہین اور بہت اچھی اسٹوڈنٹ ہے...... ہما! میں سمجھتی تھی کہ وہ مجھے بہت چیپ، بہت خراب لڑکی سمجھتے ہوں گے اور میرا خیال تھا کہ شاید وہ میرے بلانے پر نہ آئیں۔''

''ان کی بیوی کیسی تھی فرحو، کیا بہت پیاری؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''نہیں ...... بالکل بھی نہیں۔'' وہ یک دم میری طرف مڑ کر دیکھنے لگی۔ ''تم یقین کرو گی ہما کہ وہ ایک بالکل عام سی شکل کی سادہ سی عورت تھی۔ بالکل ہی عام سی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چوڑا دہانہ، سانولا رنگ۔ اور سر حبیب، ہُما تم نے صحیح کہا تھا وہ یقیناً کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہیں۔ ورنہ ...... ورنہ وہ میری نادانی سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اس عورت کا بھرم رکھا۔ میرے دل میں ان کی محبت دوچند ہوگئی ہے ہما ...... دوچند۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور میں انتہائی حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ ...... یہ اس طرح کی محبت کیا بلا ہے ...... اور اس محبت کا بھلا کیا فائدہ جبکہ اسے پھر بھی سر حبیب سے نہیں ملنا۔ عادل کے سنگ زندگی گزارنی ہے۔ اور کیا یہ عادل کے ساتھ بے ایمانی نہیں ہوگی کہ اس کے دل سے کبھی سر حبیب کا خیال نہ نکل سکے۔ مگر شاید کچھ ہی جذبہ بہت دنوں بعد میں نے ہاجرہ مسرور کے ایک افسانے میں پڑھا تھا کہ ''محبت مکڑی کے جالوں کی طرح ہوتی ہے۔ کونوں کھدروں میں گھسو تو وہ کپڑوں کے ساتھ چمٹ جائیں اور لاکھ چھڑاؤ پھر بھی کہیں نہ کہیں جالا چمٹا ہی رہ جاتا ہے۔''

اور شاید فرح کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں سر حبیب کا کوئی جالا چمٹا رہ گیا تھا۔

جب وہ رو دھو کر چپ ہوگئی اور ہم کولڈ ڈرنکس وغیرہ کے ساتھ انصاف کر چکے تو وہ مجھے عادل کے گھر سے آنے والی چیزیں بہت اشتیاق سے دکھانے لگی۔

جیولری، کپڑے، جوتے سب کچھ ہی بہت شاندار تھا۔

اور اس روز مجھے پتہ چلا کہ عادل کا تعلق بھی اچھی خاصی دولت مند فیملی سے تھا۔ اس کے والد بھی بہت بڑے بزنس مین تھے۔ گویا فرح اور عادل کا جوڑ بالکل صحیح تھا۔

پھر اس نے منگنی کی مووی لگا دی۔

ہنگامہ، شور، رنگ برنگے کپڑے پہنے مہمان ...... سب کچھ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ عادل کی بہنیں اور کزنز سب نے مل کر رونق سی لگا دی تھی۔ لڑکے دوپٹے گلے میں

لٹکائے ڈانس کر رہے تھے۔ میں نے اس سے قبل نہ تو کوئی منگنی کی تقریب اٹینڈ کی تھی اور نہ ہی کوئی شادی کی۔ اس لئے میں بہت دلچسپی سے مووی دیکھتی رہی اور مجھے اس فنکشن کے مِس ہونے کا بڑا افسوس ہوا۔

ویڈیو دیکھتے ہوئے ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ جب فرح کے خانساماں نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو ہم ٹی وی بند کر کے کھانے والے کمرے میں آ گئے۔ بہت بڑا ڈائننگ ہال تھا اور شوکیسوں میں انتہائی خوبصورت، نفیس اور قیمتی برتن سجے تھے۔ کھانے کی میز پر صرف ہم دونوں ہی تھے۔

''فرح! تمہاری ممی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''وہ ایک روز کے لئے کراچی گئی ہیں، اپنی نئی کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت کرنے۔ رات تک واپس آ جائیں گی۔ اب رات کے کھانے پر ہی تمہاری سب سے ملاقات ہو سکے گی۔ ڈیڈی سے اور جبران بھائی سے تو صرف رات کے کھانے یا ناشتے پر ہی ملاقات ہوتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

کھانے کے بعد اس نے مجھے اپنا سارا گھر دکھایا۔ دو کنال پر بنا ہوا یہ گھر انتہائی خوبصورت تھا۔ قیمتی فرنیچر، قالین، پردے۔ میں نے فراخ دلی سے گھر کی تعریف کی۔

''ممی کا ذوق بہت اچھا ہے اور گھر ممی نے خود ڈیکوریٹ کیا ہے۔'' فرح نے مجھے بتایا۔

گھر دیکھ کر ہم پھر فرح کے بیڈروم میں آ گئے۔ فرح نے مجھے اپنی کیسٹس کا انتخاب دکھایا۔ میں تو اس معاملے میں بھی ڈل تھی۔ لیکن فرح کی پسندیدہ غزلیں سننا مجھے بہت اچھا لگا۔ اس سے پہلے مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ موسیقی میں بھی اتنا اثر ہوتا ہے کئی غزلیں تو میں نے دوبارہ سنیں۔ جب ہم موسیقی سن کر تھک گئے تو پھر لیٹ کر باتیں کرنے لگے۔ فرح مجھے اپنے ڈیڈی ممی اور جبران کے متعلق بتانے لگی۔

''ڈیڈی بہت اچھے ہیں ...... بہت مہربان اور شفیق۔ وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن ہما! ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ جب وہ گھر ہوتے ہیں نا، تب بھی وہ اپنی بزنس کالیں اٹینڈ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں اور ممی بھی پاپا جیسی ہی ہیں۔ اتنی ہی شفیق اور مہربان۔ لیکن تمہیں پتہ ہے نا، وہ ایک رائٹر ہیں۔ اگر ممی یا ڈیڈی تمہیں وقت نہ دے سکیں تو پلیز تم محسوس نہ کرنا۔ اور جبران بھائی، پتہ نہیں، وہ تمہارے ساتھ کیسا رویہ رکھیں۔ ان کے

مزاج میں تھوڑا سا کھردرا پن ہے اور اس کی وجہ وہ حادثہ ہے جس نے ان کی شخصیت میں گھن لگا دیا ہے۔ لیکن یہ صرف ان کا اپنا احساس ہے۔ ورنہ عام لوگوں کو محسوس نہیں ہوتا کہ ان کی ٹانگ میں کوئی معمولی سا نقص ہے۔ تاہم یہ کھردرا پن ہمیشہ نہیں ہوتا۔ اکثر وہ بہت خوش مزاج ہوتے ہیں اور مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ خاص طور پر کسی تقریب یا فنکشن میں۔ لیکن پھر کبھی کبھی ان کا موڈ خراب ہوتا ہے۔ سو اگر کبھی ان کا موڈ خراب ہو تو پلیز تم محسوس نہ کرنا۔''

''تم بالکل پاگل ہو فرح۔'' میں ہنس دی۔ ''تم یوں پریشان ہو رہی ہو جیسے میں نے سارا وقت تمہارے ممی ڈیڈی اور جبران کے ساتھ گزارنا ہے۔ سارا دن تو بس ہم دونوں ہی ہوا کریں گے نا۔''

''اوہ ہاں......'' وہ ہنس دی۔ ''دراصل تم میری بہت اچھی دوست ہو اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ اس لئے کہہ رہی تھی۔''

''پگلی! اچھے دوست کبھی نہیں کھوتے۔''

''ہاں ...... یہ تو ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر اپنی ممی اور ڈیڈی کی تعریف کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے میری ممی بہت خوبصورت ہیں اور ڈیڈی بھی۔''

''اچھا، جبران بھائی کیسے ہیں؟''

''جبران بھائی ممی اور ڈیڈی دونوں کا خوبصورت امتزاج۔''

''تمہارے جیسے؟'' میں نے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھا۔

''میں ...... میں کہاں خوبصورت ہوں؟''

''اتنی پیاری تو ہو۔'' میں نے اس کی چھوٹی سی ناک کو پکڑ کر کہا۔

''نہیں ظلِ ہما!'' اس کی آواز میں اُداسیاں سی گھل گئیں۔ ''اگر میں پیاری ہوتی تو سر حبیب......''

''ابھی تک سر حبیب کا خیال تمہارے دل سے نہیں نکلا۔ جب کہ عادل جیسا اچھا شخص تمہارا رفیق بن رہا ہے۔'' مجھے فرح پر ازحد حیرت تھی۔

''تم نے محبت نہیں کی ظلِ ہما! اس لئے تم نہیں جان سکتیں۔ تم نہیں جانتیں میری کیفیات۔ بس تم میرے لئے دعا کیا کرو کہ میں عادل کے ساتھ انصاف کرسکوں۔''

'مگر میری دعائیں ......' میں نے سوچا۔ 'وہ تو قبول ہی نہیں ہوتیں۔ لیکن میں فرح کے لئے ضرور دعا کروں گی۔' میں نے دل ہی دل میں کہا اور پھر باقی کا دن ہم نے

باتیں کرتے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے گزارا۔ شام کی چائے ہم نے کمرے میں ہی پی اور پتہ نہیں، کب فرح سے باتیں کرتے کرتے میں سوگئی۔

جب آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے۔

''ارے ......اتنی دیر ہوگئی؟'' میں اٹھ بیٹھی۔

''ممی آگئی ہیں۔'' فرح نے مجھے بتایا۔ ''اور ڈیڈی اور جبران بھی۔ اور پتہ ہے، جبران تمہارے لئے ایک بہت اہم میٹنگ کینسل کر کے آیا ہے۔ دراصل سب کو تمہارے آنے کا پتہ تھا نا۔ اور ممی بھی تمہاری وجہ سے جلدی آگئی ہیں ورنہ وہاں کئی لوگ ان کے ساتھ شام منانا چاہ رہے تھے۔ ماہنامہ ''چاندنی'' والے تو بقول ممی کے گلے ہی پڑ گئے تھے اور ممی نے بڑی مشکل سے معذرت کی۔''

''ارے ...... اس ملک میں لکھنے والوں کے اتنے چاہنے والے ہیں ...... اور ان کی اتنی قدر ہے ...... مجھے اس سے قبل ہرگز پتہ نہیں تھا۔ بلکہ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ بے چارے لکھنے والوں کی قدر افزائی ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتی۔ جبھی تو وہ گلہ کرتے رہتے ہیں کہ

فن کی پوجا کرنے والو قدر کرو فنکاروں کی''

''تم جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔''

''مجھے بھلا کیا تیاری کرنا ہے۔'' میں نے کہا اور ہاتھوں سے اپنے بال سنوارتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ ''چلو۔''

فرح کے ممی اور ڈیڈی بہت شفقت اور محبت سے ملے۔ اتنی زیادہ پذیرائی اور شفقت نے مجھے حیران اور ممنون کر دیا تھا۔ جبران نے کھڑے ہو کر مجھے تعظیم دی۔

یہ سب لوگ کتنے اچھے اور محبت کرنے والے تھے۔ جبران مجھے ذرا بھی کھردرا نہ لگا۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ اپنی دلچسپ باتوں سے ہنساتا رہا۔ میں زندگی میں کبھی اتنا نہیں ہنسی جتنا اس روز ہنسی۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی اور میں نے دل ہی دل میں اس بات کا فراخ دلی سے اعتراف کیا کہ وہ بلاشبہ ایک وجیہہ اور شاندار مرد ہے۔

ڈیڈی نے اپنے بچپن کے قصے سنائے۔

ممی اپنے لکھنے کے شوق کے متعلق بتاتی رہیں کہ کیسے انہوں نے لکھنے کی ابتداء کی اور پھر کس طرح انہوں نے پہلی بار کسی رسالے میں اپنی تحریر چھپنے کے لئے بھیجی اور ان

کے پاپا اور مما نے کتنی مخالفت کی۔

یہ سب کچھ بہت دلچسپ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم سب ڈرائنگ روم میں آ گئے اور پھر دیر گئے تک باتیں کرتے رہے۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اپنی اس پذیرائی پر بہت حیران تھی۔ کیا فرح نے انہیں بتایا ہے کہ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے؟ کیا یہ جانتے ہیں کہ میرے بابا گریڈ سترہ کے آفیسر ہیں؟ اور اگر انہیں پتہ ہے تو پھر اپنی بیٹی کی ایک دوست کی اتنی عزت اور پذیرائی۔ میں دل ہی دل میں ان سب کی محبتوں کی قائل ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک بزنس کال آنے پر ڈیڈی معذرت کر کے چلے گئے۔ ممی کو بھی ضروری خطوط لکھنا تھے اور ڈرائنگ روم میں ہم تینوں رہ گئے تو ماحول میں زیادہ بے تکلفی ہو گئی۔ جبران نے بے شمار لطیفے سنائے اور فرح کو عادل کا نام لے لے کر تنگ کیا اور مجھے بتایا کہ وہ سی ایس ایس کرنا چاہتا تھا اور بزنس میں آنے کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

''پھر......؟'' میں نے سوال کیا۔

''پھر یہ کہ کبھی کبھی آدمی کے اپنے فیصلے پر تقدیر کے فیصلے حاوی ہو جاتے ہیں۔''

''تو کیا اب آپ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں؟''

''مطمئن......'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مطمئن تو آدمی ہو جاتا ہے لیکن اپنی خواہش کے پورا نہ ہونے کی کسک تو رہتی ہے نا۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ فرح کی مثال میرے سامنے تھی۔ وہ عادل کی رفاقت پا کر مطمئن بھی تھی لیکن اس کے دل میں سر حبیب کے نام کا کانٹا ابھی چبھا ہوا تھا، یوں جیسے کوئی ننھا سا کانٹا چبھے اور نظر نہ آئے لیکن تکلیف دیتا رہے۔ کسک ہوتی رہے۔

اس رات جب میں لیٹی تو بہت مطمئن اور پُرسکون تھی۔ وہ جو یہاں آنے سے پہلے دل میں ایک وہم سا تھا کہ پتہ نہیں وہاں فرح کے گھر والے کس طرح سلوک کریں، وہ وہم جاتا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ باقی کے دن بہت اچھے اور پُرسکون گزریں گے اور جب میں گھر واپس جاؤں گی تو میرے پاس بابا کو اور بے بے کو بتانے کے لئے بہت سی باتیں ہوں گی اور میرے دامن میں بہت سی محبتیں ہوں گی۔ میں جو محبتوں کے معاملے میں ہمیشہ غریب رہی ہوں۔ بس بابا، بے بے اور عبدالغفور چاچا کی محبت۔ اور

اب فرح کی محبت پا کر اتنی بہت سی اور محبتیں مل گئی ہیں۔ اگرچہ فرح کے علاوہ سب ہی بہت مصروف تھے لیکن وہ کتنی ہی دیر سے گھر آتے، کتنے ہی مصروف ہوتے، مجھے وقت ضرور دیتے۔ جبران سونے سے پہلے تھوڑی دیر ضرور گپ لگاتا۔ ڈیڈی بھی حال دریافت کرتے۔ ممی بھی دن میں کئی بار ہمارے پاس آ کر بیٹھتیں۔

اگلے تین چار دنوں میں یہ حقیقت بھی مجھے معلوم ہو گئی تھی کہ فرح کے خاندان والے میرے فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق بہت اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ ڈیڈی نے ایک دن خواہش ظاہر کی کہ میں انہیں بابا سے ملواؤں۔

''بھئی فرح سے تمہارے بابا کے متعلق سن سن کر ہمیں ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا ہے۔''

اور میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ جب بابا آئیں گے تو میں انہیں لے کر ضرور آؤں گی۔

چند دنوں میں ہی سب کے لئے میرے دل میں محبت پیدا ہو گئی تھی۔ ممی اگرچہ بظاہر مغرور نظر آتی تھیں لیکن میرے ساتھ ان کا رویہ پہلے دن سے ہی مشفقانہ تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ لوگوں میں گھرے رہنا پسند کرتی تھیں اور جیسا کہ فرح نے پہلی ملاقات میں بتایا تھا، انہیں لوگوں سے اپنی تعریفیں سننا بہت پسند تھا۔ سارا دن ان کا ڈرائنگ روم ایسے ہی خوشامدی لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ ادیب، شاعر، ایڈیٹر، صحافی قسم کے لوگوں کا جمگھٹا سا رہتا تھا جو ان کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کے حُسن کو بھی سراہتے تھے۔

''ممی کا دل ان بناوٹی اور مصنوعی باتوں سے گھبراتا نہیں فرح؟'' ایک دن میں نے فرح سے پوچھا۔ ''میں تو اپنے گرد ایک دن بھی ایسے لوگوں کا ہجوم برداشت نہ کر پاؤں۔ اُوب جاؤں۔''

''ہاں...... لیکن ممی کا حلقۂ احباب شروع سے ہی ایسا ہے۔ اور ممی عادی ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اگر چند دن یہ لوگ نہ آئیں تو ممی کا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے۔ ایک مرتبہ ہم گاؤں گئے تھے، دادی جان کی وفات پر تو ساتویں ہی دن ممی وہاں سے بھاگ آئیں۔ وہ کہتی تھیں کہ اب ایک گھنٹہ بھی مزید رہی تو میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔'' فرح کو سچ بولنے کی بیماری تھی اور وہ بے لاگ تبصرہ کرتی تھی۔ ''حقیقت میں مجھے بھی ممی کا حلقۂ احباب پسند نہیں ہے مگر ممی بے چاری کیا کریں؟ آخر انہیں جو

کچھ وہ لکھتی ہیں اس کے لئے تعریف کی تو ضرورت ہے نا۔ اور ڈیڈی کے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ انہیں ادب وغیرہ سے کوئی دلچسپی ہے۔ ہاں اظفر ادب کا رسیا تھا اور ممی کی اس سے بہت بنتی تھی، صرف اسی وجہ سے۔ اور تب ممی کو اتنا کریز بھی نہیں تھا لوگوں سے تعریفیں وصول کرنے کا۔" فرح نے بتایا۔

"اظفر...... اظفر کون؟" میں پوچھنا چاہتی تھی کہ اسی وقت مکہ سے بابا کا فون آ گیا اور میں فون سننے کے لئے باہر بھاگ گئی اور پھر میرے ذہن سے یہ نام نکل گیا۔ کیونکہ اس روز کچھ سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔

اس رات فرح کے کہنے پر جبران ہمیں کھانا کھلانے باہر لے گیا۔ میں، ممی، فرح اور جبران۔ ڈیڈی کو اس روز کسی ڈنر پر جانا تھا۔

"کہاں چلیں؟" جبران نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے ہی مجھ سے پوچھا۔ میں سوالیہ نظروں سے فرح کو دیکھنے لگی۔

"چائنیز پسند ہے تو......"

"دراصل ہما نے آج تک باہر کھانا نہیں کھایا۔ اسے کسی ہوٹل وغیرہ کا نہیں پتہ۔" فرح نے بتایا۔ "ظاہر ہے گھر میں صرف بابا ہی تو ہوتے ہیں اور......"

"ہاں، ٹھیک ہے۔" جبران نے بات کاٹ دی۔ "تو پھر تمہارے خیال میں کہاں چلیں؟"

"ایسا ہے بھائی کہ "Village" چلتے ہیں۔ چائنیز کھانے شاید ہما کو پسند نہ آئیں۔"

"جو حکم جی۔" جبران نے گاڑی "Village" ولیج جانے والی سڑک پر ڈال دی۔

یہ میری زندگی کا پہلا کھانا تھا جو میں گھر سے باہر کھا رہی تھی۔ مجھے "Village" کا ماحول بہت اچھا لگا۔ یہاں دیہاتی ماحول کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دروازے کے قریب موجود شخص نے "جی آیاں نوں" کہہ کر ہمارا استقبال کیا۔ اندر ایک شخص بانسری بجا رہا تھا۔ ڈیکوریشن بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ کچھ کچھ دیہاتی کلچر کی عکاسی ہو سکے۔ مجھے اس ماحول میں کھانا کھانا بہت اچھا اور خوش کن لگ رہا تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ لوگ کھا رہے تھے، ہنس رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔

"دنیا میں کتنی خوشی ہے۔" میں نے سوچا۔ "اور لوگ شاید اسی طرح خوشیاں حاصل کرتے ہیں اور کیا ان لوگوں کو کوئی دکھ نہیں ہو گا جو یہاں آئے ہوئے ہیں؟ لیکن نہیں شاید۔" میں نے فرح کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں کی تہہ میں ایک اُداسی سی رچ گئی

تھی۔ شاید فرح کی طرح سب کا کوئی نہ کوئی دکھ ہو اور بس وہ خوشیاں اکٹھی کرتے پھرتے ہوں۔

"کم آن ظلِ ہما! یہاں سیلف سروس ہے۔ جو کھانا چاہو، اپنی پلیٹ میں ڈال لاؤ۔"

وہاں سب کچھ تھا۔ ہر طرح کی سبزی، چکن قیمہ، روسٹ، پراٹھے، پوریاں، کئی طرح کے سلاد۔ میں نے تھوڑا سا چکن تکہ، ایک روسٹ بٹیر اور سلاد لیا۔ فرح نے بھی اپنی پسند کی چیزیں لیں اور ہم اپنی ٹیبل پر واپس آ گئے۔

بانسری بجانے والا ادھر سے اُدھر مختلف میزوں کے پاس چکراتا بانسری بجا رہا تھا۔

کھانے کے بعد پھل، آئس کریم کھا کر جب ہم اٹھے تو پیچھے سے کسی نے فرح کو آواز دی۔

"ہیلو فرح۔"

"ارے تم نازش!" فرح نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔

بہت گوری رنگت اور چاکلیٹی آنکھوں والی یہ لڑکی پتہ نہیں کون تھی۔ اس کے بال بہت خوبصورت اسٹائل میں کٹے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ کسی انجانی خوشی سے چمک رہا تھا۔

"کیسے ہو تم سب؟"

"فائن۔"

ممی نے اس کے رخساروں کو چھوا۔ "ہم آئیں گے کسی دن تمہارے گھر۔ ابھی کچھ مصروفیت ہے۔"

وہ ذرا سا شرمائی اور اس کی نگاہیں جبران کی طرف اٹھ گئیں جو یکایک بے حد سنجیدہ لگا تھا۔

"یہ جو نازش ہے نا......" فرح نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "اسے ہم جبران کے لئے پرپوز کرنا چاہتے ہیں۔"

"اور جبران؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی انٹرسٹڈ تھا نازش میں۔ لیکن پتہ نہیں، آج کل کچھ سنجیدہ سا ہو رہا ہے۔"

"ویسے نازش بہت پیاری ہے اور جبران کا اور اس کا جوڑ بہت اچھا لگے گا۔" میں نے رائے دی۔

"ہاں...... مجھے بھی بہت پیاری لگتی ہے۔"

جبران نے ایک نظر مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔

"تمہیں کیسا لگا ولیج آنا؟" ممی نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔" میں نے کہا۔

"اور ممی! آپ کو پتہ ہے......" فرح نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ "ظلِ ہما نے آج تک لاہور کے سوا کوئی دوسرا شہر، گاؤں یا قصبہ نہیں دیکھا۔"

"واقعی؟" ممی کو حیرت ہوئی۔

"تو ایسا کرتے ہیں، ڈیڈی سے کہہ کر اپنا اس طرح کا کوئی شیڈول بناتا ہوں کہ دو تین دن فراغت کے مل جائیں تو پھر مری چلتے ہیں۔" جبران نے کہا۔

"تم مری بھی کبھی نہیں گئیں؟" ممی نے پوچھا۔

"نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

جبران ہنس پڑا۔ "جب یہ خاتون لاہور سے باہر ہی نہیں نکلیں تو مری بھی تو......"

"اوہ ہاں......" ممی نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔ "مری میں پرسوں ایک "شام غزل" منائی جا رہی ہے۔ مجھے بھی انوی ٹیشن ملا تھا لیکن میرا جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ لیکن اگر تم اپنا شیڈول اس طرح بناؤ کہ میں اس شامِ غزل میں شریک ہو سکوں تو پھر میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

اور پھر جبران نے پروگرام سیٹ کر ہی لیا مری میں بہت اچھا وقت گزرا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ میں جو تنہائی سے انجوائے کرتی تھی اور مجھے ہجوم سے گھبراہٹ ہوتی تھی، اب تنہائی میں گھبرانے لگی تھی۔

ایک روز ممی اپنی ایک فرینڈ سے ملنے گئیں تو جبران کو ساتھ لے گئیں۔ فرح سو گئی تو میرا دل چاہنے لگا کہ اسے جگا دوں اور کہوں۔

"آؤ فرح، نیچے وادی کا ایک چکر لگا آئیں یا پھر باتیں کریں اور موسیقی سنیں۔"

اپنی اس تبدیلی پر میں خود حیران رہ گئی اور جب فرح جاگی تو اسے میں نے بتایا تو وہ ہنسی۔

"ہاں...... اب تم نارمل ہو گئی ہے۔"

"اچھا، تو کیا پہلے ابنارمل تھی؟"

"ہاں، کچھ کچھ۔" اس نے شرارت سے مجھے دیکھا۔

"اور سنو...... یہ جبران نے تم سے کچھ کہا؟"

"نہیں تو...... اسے کیا کہنا تھا مجھ سے؟"

"کچھ نہیں۔" فرح نے بات بدل دی۔ "میں نے یونہی پوچھ لیا تھا، اس کے غصے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا نا۔"

"ایویں ہی تم نے اس پر الزام لگا رکھا ہے۔ میں نے تو ایک دن بھی اسے غصے میں یا خراب موڈ میں نہیں دیکھا۔"

"تمہاری آمد کا اثر ہے۔" وہ ہنس دی۔ "ویسے بی بنو تمہیں آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ وہ تمہارا لحاظ کر رہا ہے۔"

تب ہی جبران اور ممی واپس آ گئے۔ جبران خاصا سنجیدہ اور خفا لگ رہا تھا۔ وہ ہم سے بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہوٹل میں دو کمرے لیے گئے تھے۔ ایک میں ممی، میں اور فرح تھیں۔ دوسرا جبران کے پاس تھا۔

"جبران کو کیا ہوا؟"

"پتہ نہیں کیوں، آج کل نازش کے ذکر سے چڑنے لگا ہے۔ فرح! تم اس سے ایک بار حتمی بات کر لو تو میں جا کر نازش کے والدین سے بات کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ صاحبزادے بعد میں اکڑ جائیں۔ ان لڑکوں کی پسند نا پسند بدلنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ کل تک تو نازش تھی اور آج......" ممی بڑبڑاتے ہوئے اپنی شاپنگ دکھانے لگیں۔

اگلی صبح ہمیں واپس جانا تھا۔ واپسی کا سفر بھی بہت خوشگوار تھا۔ جبران کا موڈ بالکل ٹھیک تھا۔ اور وہ حسب معمول لطیفے سنا رہا تھا۔ میں تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی۔ آتے ہی بستر پر گر گئی۔ مغرب کے بعد کہیں میری آنکھ کھلی، فرح کمرے میں نہیں تھی۔

"اوہ خدایا......" میں ایک دم اٹھ بیٹھی۔ "مغرب کی نماز کا وقت بھی نکل گیا اور فرح نے مجھے جگایا بھی نہیں۔" بالوں میں جلدی جلدی برش کر کے دوپٹا کندھوں پر ڈالتے ہوئے میں باہر نکلی تو ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ڈیڈی شاید آج جلدی آ گئے تھے۔ میں نے اندر جھانکا۔

"آؤ بیٹا! آ جاؤ" ڈیڈی نے مجھے دیکھ کر بلایا۔ "مری کا ٹور کیسا رہا؟"

"بہت اچھا...... ہم نے بہت انجوائے کیا۔" میں نے خوش دلی سے کہا اور فرح کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ سنجیدہ لگ رہی تھی۔

"تم جاگ گئیں؟"

"تم جگا دیتیں تو نماز قضا نہ ہوتی۔"

''سوری، مجھے خیال نہیں رہا۔ دراصل میں خود اتنی پابندی سے نماز نہیں پڑھتی نا اس لئے۔''

''ممی!'' کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا شخص جس پر میری پہلے نظر نہیں پڑی تھی، اچانک مڑا تو میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ڈبلا پتلا، لمبا سا، سانولے رنگ کا یہ لڑکا کون تھا۔

''ممی......'' اس نے پھر کہا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اب کے میں نے ذرا غور سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھوری تھیں لیکن ان میں عجیب سی چمک تھی۔ پلکیں بے حد لمبی تھیں جنہیں وہ بار بار جھپک رہا تھا۔ اس کا پورا وجود ایک اُداسی میں لپٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بے شمار شکنیں تھیں۔

ممی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں...... ضرور......'' ڈیڈی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ''چلو میں تمہیں تمہارے کمرے میں لے چلتا ہوں۔''

وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''کیوں ...... کیا میں خود نہیں جا سکتا؟''

''کیوں نہیں؟'' ڈیڈی کچھ گھبرا کر بیٹھ سے گئے۔

''یہ اظفر ہے۔'' ممی نے مجھے اس کی طرف دیکھتے پا کر کہا اور پھر اظفر سے بولیں۔ ''اور یہ ظلِ ہما ہے۔''

''ظلِ ہما۔'' اس نے میری طرف دیکھا اور پھر لمحہ بھر یونہی مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ سی گئی ہو۔ ''ہما تو ایک خالی پرندہ ہے ...... آپ کیا حقیقت ہیں یا خواب؟'' اس کے لہجے میں بھی ایک اداسی سی رچی تھی۔ ٹھہرا ٹھہرا، بھاری سا لہجہ۔ گمبھیر، پُرسوز سا۔

یک دم مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر کہیں گہرائی میں ہلچل سی مچی ہو۔ میں نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔

''مجھے کھانے کے لئے نہ جگایا جائے۔'' اس نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا اور تیز تیز چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

''یہ اظفر ہے، میرا بھائی۔'' فرح نے اس کے جانے کے بعد وضاحت کی۔

''مگر تم نے اس سے پہلے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ تمہارا ایک اور بھائی بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ...... وہ دراصل یہاں نہیں تھا نا۔ جب ہم مری گئے ہوئے تھے تو یہ اچانک آ گیا۔ بغیر اطلاع کے۔''

پتہ نہیں کیوں، مجھے حیرت ہوئی۔ فرح نے مجھے اپنے گھر کے افراد سے متعارف کرواتے ہوئے ایک بار بھی اظفر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ یہ تو بتا سکتی تھی کہ اس کے دو بھائی ہیں اور یہ کہ ایک بھائی باہر گیا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، شاید یہ اس کا سوتیلا بھائی ہو یا پھر شاید اس لئے کہ وہ جبران کی طرح نہیں تھا، خوبصورت اور وجیہہ۔ بس عام سا، سانولا سا، ڈبلا پتلا لڑکا تھا جس کے چہرے پر صرف دو آنکھیں تھیں جو اٹریکٹ کرتی تھیں۔ لانبی پلکوں والی بھوری آنکھیں جن میں عجیب سی چمک تھی۔ لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ رات کو جب میں بیڈ پر لیٹی تو یہ عام سی صورت والا عام سا لڑکا بار بار میرے تصور میں آ رہا تھا اور ہر بار جب بھی میں اس کے متعلق سوچتی دل میں ہلچل سی مچ جاتی۔ یہ ...... یہ کیا تھا، یہ میرے اندر کیسی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور کتنی ہی دیر تک یونہی بے چین اور مضطرب سی بیٹھی رہی۔

''آپ خواب ہیں یا حقیقت؟'' ایک بھاری، گمبھیر آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

فرح سو رہی تھی اور میرا دل گھبرا رہا تھا۔ مجھے اے سی میں بھی گرمی محسوس ہو رہی تھی بلکہ بے چینی تھی۔ میں نے ایک نظر فرح کو دیکھا اور باہر نکل آئی اور کھلی فضا میں دو تین گہرے گہرے سانس لئے پھر وہیں ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر بڑا سا گول چاند بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شاید چاند کی چودھویں تھی۔ میں ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے چاند کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک مجھے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے یک دم پلٹ کر دیکھا، وہ اظفر تھا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری پلکیں جھک گئیں اور دل یک دم اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی سینے سے باہر نکل آئے گا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ مسکرایا اور میری طرف بڑھا اس کے سپاٹ سے چہرے پر مسکراہٹ اچھی لگ رہی تھی۔ نرم نرم سی مسکراہٹ، آنکھوں میں بھی نرمی سی تھی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ آپ خواب ہیں یا حقیقت اور اب جبکہ آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں، تب بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ آپ خواب ہیں یا حقیقت۔ اگر آپ خواب ہیں تو بہت خوبصورت خواب ہیں اور اگر حقیقت ہیں تو یہ صحیح ہے کہ بعض

حقیقتیں خوابوں سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔"

"میں ...... میں ظلِ ہما ہوں۔" میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اب میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ "میں فرح کی دوست ہوں ...... میرے بابا حج کرنے گئے ہیں اور میں کچھ دن ادھر رہنے کے لئے آئی ہوں۔ فرح نے آپ سے میرا تعارف تو کروایا ہوگا۔"

"فرح نے......" وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا تو میں نے سوچا، ممکن ہے جس طرح اس نے اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا تھا، اس طرح اظفر سے بھی میرا ذکر نہ کیا ہو۔

"پتہ نہیں ...... مجھے یاد نہیں ہے۔ دراصل میں بہت جلد بھول جاتا ہوں اکثر باتیں۔ اور اکثر باتیں بھولتا ہی نہیں۔" وہ وہاں قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "آپ کیا کرتی ہیں؟"

"میں نے ابھی اپنا ایم ایس سی مکمل کیا ہے۔ ابھی رزلٹ نہیں آیا، فارغ ہوں۔ اور آپ؟" میں نے پوچھا۔ میری جھجک اب ختم ہوگئی تھی اور مجھے اچھا لگ رہا تھا اس سے باتیں کرنا۔

"میں......" وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ "میں سارا دن پڑھتا رہتا ہوں، لکھتا رہتا ہوں اور سوتا رہتا ہوں۔"

"آپ کیا پڑھتے ہیں...... اور کہاں؟"

"میں......" اس کی نگاہیں میرے چہرے سے ہوتی ہوئی میرے بالوں پر ٹھہر گئیں۔

"آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں۔ چمکیلے، گھنے اور لمبے۔" اس نے آہستگی سے میرے بالوں کو چھوا۔

"بے بے بھی کہتی ہیں کہ میرے بال بہت خوبصورت ہیں۔ وہ اکثر مجھے منع کرتی ہیں کہ میں انہیں کھولا نہ کروں۔"

"بے بے کون ہیں؟"

"بے بے بس بے بے ہیں۔" میں ہنس دی۔

"اور آپ کی ہنسی......" وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "کیا آپ کی بے بے نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کی ہنسی بھی بہت خوبصورت ہے؟"

"نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو میں بتاؤں ...... آپ کی ہنسی بھی بہت خوبصورت ہے۔ اتنی دلکش، اتنی مدھر کہ

دل چاہتا ہے، آپ ہنستی رہیں اور میں سنتا رہوں۔"

وہ باتیں کر رہا تھا اور میرے اندر ایک لطیف سی سنسنی پیدا ہو رہی تھی۔ اپنی تعریف اس کے لبوں سے سننا بہت اچھا اور دلکش لگ رہا تھا۔ ایک ہی دن میں بلکہ چند ہی گھنٹوں میں میرے اندر کیسی عجیب وغریب تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ میں جو سمجھتی تھی کہ میرے دل میں مرد کی رفاقت کی خواہش بھی پیدا نہیں ہو سکتی، شاید میرے اندر کہیں کوئی کمی ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بس وہ بولتا رہے، کچھ نہ کچھ کہتا رہے، میرے حوالے سے، میری ذات سے متعلق کوئی بات کرے، مجھ سے میرے متعلق پوچھے۔ اور میں اسے بتاؤں کہ یہ میں ہوں، ظلِ ہما۔ اپنے بابا کی اکلوتی بیٹی اور تم پہلے اجنبی مرد ہو جس کی قربت مجھے اچھی لگ رہی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ مگر پھر وہ یکایک باتیں کرتا ہوا خاموش ہو گیا۔

"سنو......" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ستاروں سے بھرے اس آسماں کی وسعتوں میں
مجھے اپنا ستارہ ڈھونڈنا ہے
فلک پر کہکشاں در کہکشاں اِک بیکرانی ہے
نہ اس کا نام ہے معلوم نہ کوئی نشانی ہے
مجھے اپنا ستارہ ڈھونڈنا ہے"

پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پوچھنے لگا۔ "کیسی لگی یہ نظم؟"

"اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو سنو ...... ایک اور نظم سناتا ہوں۔"

مجھے شعر و شاعری سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ سکول اور کالج میں نصاب کا ایک شعر بھی مجھے کبھی یاد نہ رہا، نہ اچھا لگا۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ لوگ شعر بھلا کیوں کہتے ہیں؟ خواہ مخواہ وقت کا زیاں۔ اس سے بھلا کیا ملتا ہے؟ کیا فائدہ ہوتا ہے؟ بیکار کا کام۔ مگر اس روز مجھے کتنا اچھا لگا اس سے شعر سننا۔ مدھم مدھم پُرسوز لہجے میں شعر سناتا ہوا وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس رات اس نے مجھے بہت سے شعر سنائے۔ پھر اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تھک گیا ہوں ...... اب آرام کروں گا۔"

"اچھا ......" میں بھی کھڑی ہو گئی اور سوچنے لگی۔ 'رات بھی تو بہت بیت گئی ہے

اور پتہ نہیں، یہ کتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ مجھے خود ہی خیال کرنا چاہئے تھا۔'

''شب بخیر۔''

فرح کے کمرے کے پاس رک کر وہ تھوڑا سا میری طرف جھکا۔ ''شب بخیر۔''

میں ایک دم پیچھے ہٹ گئی تو وہ ہنس پڑا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

فرح کے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ایک بار پھر مڑ کر اس نے ہاتھ ہلایا اور جواباً میں نے بھی ہاتھ ہلایا اور کمرے میں آ گئی۔ فرح گہری نیند سو رہی تھی۔ میں چپکے سے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی اور اس کے متعلق سوچنے لگی۔ یہ سب کچھ بہت انہونا، بہت خوش کن اور دلکش تھا۔

☆☆☆

اگلے چند دنوں میں ہم ایک دوسرے کے اور بھی زیادہ قریب آ گئے۔ اس نے مجھے ڈھیروں نظمیں اور بے شمار شعر سنائے۔ اپنی ممی کی اسٹڈی سے بہت اچھی اچھی کتابیں نکال کر دیں۔ اور میں جو اس سب کو خرافات کہتی تھی، جب وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہا ہوتا اور میں فارغ ہوتی تو ان کتابوں کو پڑھتی۔ ان چند دنوں میں، میں نے بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ کئی افسانوی مجموعے اور کئی شاعری کی کتابیں۔ اور کبھی کبھی اس کے شعروں کے جواب میں، میں اُسے شعر سناتی تو وہ بہت خوش ہوتا۔ فرح بور ہوتی۔

''یار، کیا مصیبت ہے...... یہ چسکا تمہیں کہاں سے پڑ گیا؟''

میں نے محسوس کیا تھا کہ فرح اور ممی کو میرا اظفر کے ساتھ زیادہ بات چیت کرنا پسند نہیں تھا اور انہیں ناگوار گزرتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ جبران سے وہ خود کہتی تھیں کہ بہنوں کو گھما لاؤ۔ جبران بھی کچھ سنجیدہ نظر آتا تھا بلکہ جب سے اظفر آیا تھا، اس کا موڈ خراب تھا۔ وہ گھر آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتا تھا۔

''فرح! جبران کو کیا ہوا ہے؟'' ایک روز میں نے پوچھا۔

''وہ دراصل اس پر آج کل کام کا بہت بوجھ ہے نا...... اس لئے۔''

''اور ممی...... ممی نے کیا نازش کے والدین سے بات کی؟''

''نہیں۔'' فرح نے کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''کیوں......؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''میں سوچ رہی تھی، میرے جانے سے پہلے اس کی منگنی کا فنکشن ہو جاتا تو مزہ آ جاتا۔''

میں اتنے دن سے یہاں رہ رہی تھی کہ میں خود کو اس گھر کا ہی ایک فرد سمجھنے لگی تھی۔ اب میں اتنی آدم بیزار بھی نہیں رہی تھی۔ اور شاید یہ اظفر کی محبت کا کمال تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بالکل بھی عجیب نہیں لگ رہا تھا کہ میں اظفر سے محبت کرنے لگی تھی اور وہ بھی میرے ساتھ محبت کرتا تھا۔ بارہا اُس نے اس کا اعتراف کیا تھا اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میری محبت کو پذیرائی مل گئی تھی۔

''ہاں...... مزہ تو آتا۔ لیکن جبران نے منع کر دیا ہے۔''

''کیوں...... کیا وہ نازش کو پسند نہیں کرتا؟''

''نازش ممی کی پسند تھی۔ جبران کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن اب......''

''اب کیا یار...... پہیلیاں تو نہ بجھواؤ۔''

''اب وہ کہتا ہے کہ اسے تم اچھی لگتی ہو اور یہ کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''میں...... مجھ سے......؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں۔'' وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

'اوہ، تب ہی ممی مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی ہیں اور میں سمجھ رہی تھی کہ اظفر کی وجہ سے۔ اظفر سے محبت کرنے کے باوجود میں نے ابھی تک اس سے شادی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ ظاہر ہے میرے اور فرح کے اسٹیٹس میں بہت فرق تھا۔

''اوہ...... تو تم نے اسے سمجھا دیا ہوتا میرے اور اپنے اسٹیٹس کا فرق۔ ممی کا موڈ تب ہی خراب ہے نا۔ مگر فرح! میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں ہے نا اگر جبران نے ایسا چاہا ہے تو۔''

''تو......'' فرح مسکرانے لگی۔ ''ہم نے کب کہا ہے کہ تمہارا قصور ہے۔ اور ممی کا موڈ اس وجہ سے خراب نہیں ہے۔ تمہیں نہیں پتہ، ممی بہت لبرل ہیں اور انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ انہوں نے جبران سے کہا ہے تمہارے بابا آ جائیں تو پھر وہ ان سے بات کریں گی۔''

''نہیں، پلیز فرح! نہیں۔'' میرا رنگ زرد پڑ گیا۔ ''تم ممی کو منع کر دو، جبران کو سمجھاؤ۔ اور جبران کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا نا، بس میں اسے اچھی لگی ہوں۔ البتہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''مگر تُو تو اس سے محبت نہیں کرتی نا۔'' فرح نے سمجھا، میں ناصر کی بات کر رہی ہوں۔

"میں بھی۔" میں نے پلکیں جھکا لیں۔

"بدتمیز!" اس نے میری پیٹھ پر مُکا مارا۔ "گھنی، چالاک! مجھے بتایا تک نہیں۔ اور وہ دیکھو ناصر مکار مجھ سے کہہ رہا تھا فنکشن میں نہیں آؤں گا۔"

اور پتہ نہیں کیوں، میں نے فرح کی تردید نہیں کی۔

"خیر تم فکر نہ کرو۔ میں جبران کو بتا دوں گی اور ممی کو بھی۔"

اور اس روز پہلی بار میں نے اظفر کی رفاقت کا خواب دیکھا۔

عمر بھر کی رفاقت کا خواب۔

اور یہ کوئی ناممکن بات ہرگز نہ تھی۔

ممی، ڈیڈی، فرح ...... کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ جبران ہو یا اظفر ایک ہی بات تھی۔

ساری رات میں خواب دیکھتی رہی کہ میں اور اظفر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خوبصورت مرغزاروں میں گھوم رہے ہیں اور اظفر اپنی دلکش آواز میں مجھے شعر سنا رہا ہے۔

ممی اور فرح نازش کے گھر گئی تھیں۔ میں گھر پر اکیلی تھی۔ اظفر اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"اظفر!" میں نے آہستگی سے اسے بلایا۔

"ہوں......" اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور میرے چہرے کو تکتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بڑے جذب سے بولا۔

"میں زندگی کے اُداس صحرا کی وسعتوں میں
اُلجھ گیا ہوں
میں لحہ لحہ بکھر رہا ہوں
مرے لہو میں سمیٹے جانے کی ایک خواہش سی
اُگ رہی ہے ہر اِک تمنا سُلگ رہی ہے
تمہیں شریکِ سفر بنا لوں
مگر! میں دنیا کو جانتا ہوں
کہ میری سوچیں حقیقتوں کے
لہو سمندر نہا چکی ہیں
میں سوچتا ہوں کہ تیرے سب خواب
ریشمی ہیں

تُو میری کھدر رفاقتوں کا
بھرم کہیں بھی نہ رکھ سکے گا"

"نہیں اظفر!" میں تڑپ کر آگے بڑھی۔ "میرا یقین کرو، میں زندگی کے ہر موڑ پر تمہاری شریکِ سفر رہنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا......" اُس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ "مگر مجھے لگتا ہے کہ......" وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"آندھیوں کے سفر میں شکستہ ہیں ہم
کون جوڑے ہمیں
کوئی اپنا مسیحا نہیں
جس کی زندہ صدا گرد آلود چہروں کو تازہ کرے
کوئی ایسا شناسا نہیں
جس کا ایک لمس ہی جسم و جاں کے اندھیرے میں
روشن ستارہ بنے
ایک مدت سے ہم
اپنے ہاتھوں پر حرفِ دعا لکھ کے پیاسے کھڑے ہیں
کہ بارش کے موسم
کہیں دور صحرا میں گم ہو گئے ہیں"

"اظفر...... اظفر......" میں بے چین سی ہو گئی۔ "مجھے بتاؤ، تمہیں کیا دکھ ہے؟ تم اتنے چپ چپ، اُداس اُداس کیوں رہتے ہو، سب سے الگ تھلگ؟"

"مجھے کیا دکھ ہے۔" اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی اُلجھن تھی۔

"ہاں پلیز......" میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "مجھے بتاؤ، ہم دوست نہیں ہیں کیا؟"

"پتہ نہیں......" وہ ابھی تک الجھا ہوا سا بیٹھا تھا۔ "تم تو لڑکی ہو نا...... اور لڑکیاں لڑکوں کی دوست نہیں ہوتیں۔"

"اچھا دوست نہ سہی، مگر میں...... میں...... کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی اظفر!"

"لگتی ہو۔"

''اور کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''
''ہاں۔''
''تو محبت کرنے والے بھی تو دوست ہوتے ہیں۔ پلیز، مجھ سے کہہ دو، جو کچھ تمہارے دل میں ہے۔ جو کچھ تم ہر وقت سوچتے رہتے ہو۔''
''میں تو کچھ بھی نہیں سوچتا۔'' اس نے اپنے ہاتھ اٹھا کر گود میں رکھ لئے۔
''سب لوگ ممی، ڈیڈی، جبران، فرح سب اتنے اچھے ہیں، اتنے محبت کرنے والے۔ مگر پتہ نہیں کیوں وہ تمہارے ساتھ ...... اظفر! کیا ممی تمہاری سگی ممی ہیں؟''
''ہما!'' ممی کھلے دروازے کے باہر کھڑی تھیں اور ان کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔
''اوہ ...... آپ لوگ آ گئے؟''
''تم ادھر ہو؟'' فرح نے پوچھا۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی۔
''میں اکیلی تھی تو ادھر اظفر کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔''
''ادھر آؤ ہما!''
''جی ......'' میں باہر چلی آئی۔
''اس طرح تمہارا اکیلے لڑکے کے پاس بیٹھنا ہرگز مناسب نہیں۔ ہم لوگ گھر پر نہیں تھے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو ہم بابا کو کیا جواب دیتے؟''
میرا سارا وجود تپ اٹھا اور چہرہ سرخ پڑ گیا۔ ''ممی آپ ...... آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟'' اس سے پہلے تو ممی نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی۔ نہ میں کوئی نادان لڑکی ہوں اور نہ اظفر ایسا ہے۔
ممی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ میں فرح کے ساتھ سر جھکائے اس کے کمرے میں آ گئی۔ میں فرح سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اب مجھے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ شاید مجھے کچھ زیادہ ہی دن ہو گئے ہیں۔ ممی کے رویے کی مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کتنی پذیرائی کی تھی سب نے۔ کتنی محبت اور عزت دی تھی مجھے۔ اور فرح نے مجھے بتایا تھا کہ ممی کو اس بات پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ جبران اور اظفر بھی تو ان کا ہی بیٹا ہے۔ پھر......
''فرح پلیز ...... آج تم مجھے گھر چھوڑ آؤ......'' بہت دیر بعد میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کل عید ہے ظلِ ہما! تم عید کے بعد چلی جانا۔''
''نہیں فرح، پلیز۔''
''مگر تم اکیلی رہو گی وہاں؟''
''نہیں تو ...... میں بے بے اور عبدالغفور کو بلا لیتی ہوں۔ اب تو ویسے بھی بابا آنے والے ہوں گے۔''
''تو پھر خط لکھ دو ...... اور جب وہ لوگ آ جائیں تو چلی جانا۔'' فرح نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ پہلے اس کی ضد تھی کہ بابا کے آنے سے صرف دو روز پہلے مجھے جانے دے گی۔
''نہیں، خط نہیں، فون کر دیتی ہوں۔ وہاں گاؤں کے ڈاک خانے میں فون ہے۔ پیغام مل جائے گا۔''
''اچھا فون کر دو ...... لیکن تم عید کے بعد جانا۔''
''نہیں، پلیز فرح! آج ہی۔'' مجھے اپنی توہین کا احساس بہت شدت سے ہو رہا تھا۔ اس وقت اظفر کا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔
''تمہیں شاید ممی کی بات اچھی نہیں لگی ظلِ ہما! لیکن تم کچھ خیال نہ کرو پلیز، آج وہ آج کل کچھ پریشان ہیں۔''
''کیا ہوا؟''
''یونہی ذاتی مسئلے ہیں۔'' فرح نے ٹال دیا اور میں نے بھی جاننے کی ضد نہ کی۔
فرح صحیح کہہ رہی تھی۔ ممی پریشان لگتی تھیں۔ جب سے ہم مری سے آئے تھے ان کے احباب بھی نہیں آ رہے تھے ادیب، شاعر اور مصور قسم کے لوگوں کا جو جمگھٹا لگا رہتا تھا، وہ اب نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا۔ مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ لیکن سب کا اصرار تھا کہ میں عید کے بعد جاؤں۔ میں نے گاؤں فون کر کے عبدالغفور چاچا کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ عید کے فوراً بعد آ جائیں۔ یوں بھی عید کے دس دن بعد بابا کی فلائٹ تھی اور انہیں آنا ہی تھا۔
عید والے دن میں کمرے سے باہر ہی نہ نکلی۔ فرح کے بے حد اصرار پر میں نے ممی کا لایا ہوا سوٹ پہنا اور فرح نے میری بے حد تعریف کی۔
شام کو عادل کے گھر سے فرح کی عیدی آئی۔ خوب رونق رہی۔ لیکن میرا باہر جانے کو جی ہی نہ چاہا۔ میں فرح کے بیڈ پر لیٹ کر ہاجرہ مسرور کے افسانے پڑھتی رہی اور

جب پڑھتے پڑھتے تھک گئی تو اظفر کے متعلق سوچنے لگی۔

آج سارا دن میں نے اظفر کو نہیں دیکھا تھا۔ ناشتے کی میز پر بھی وہ نہیں تھا۔ چونکہ وہ اکثر اپنے کمرے میں ہی ناشتہ کرتا تھا اس لئے کسی نے اس کے متعلق نہیں پوچھا اور جب جبران اور ڈیڈی عید کی نماز پڑھنے جا رہے تھے تو میں نے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا، وہ دونوں اکیلے جا رہے تھے۔ پتہ نہیں، اظفر کیوں نہیں گیا۔ میں نے سوچا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے ملوں، اس سے باتیں کروں۔ میں اسے بہت مس کر رہی تھی۔ اور جب میں چلی جاؤں گی تو ......

وہ کھانے پر بھی نہیں تھا۔ فرح نے بتایا کہ وہ سو رہا ہے۔ سب لوگ ڈرائنگ روم میں تھے۔ میرا دل چاہا، چپکے سے ایک نظر اسے دیکھ آؤں۔ کل وہ کچھ اَپ سیٹ لگ رہا تھا۔ اس نے بھی شاید ممی کی بات کو محسوس کیا ہے تب ہی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

'وہ خود بھی تو آ سکتا ہے نا ...... کیا اس کا دل نہیں چاہا ہو گا کہ......'

میرا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

"ظلِ ہما!" فرح نے زور سے دروازہ کھولتے ہوئے مجھے پکارا۔ "یار چلو، ادھر سب تمہیں مس کر رہے ہیں۔ عادل کتنی بار تمہارا پوچھ چکا ہے۔"

"عادل بھی ہے؟"

"ہاں ...... وہ ابھی آیا ہے۔ اور عادل نے تمہاری ذہانت اور لیاقت کی اتنی تعریف کی ہے کہ ان کی بہنیں تم سے ملنا چاہ رہی ہیں۔"

"اچھا" میں بے دلی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے ہما! بابا یاد آ رہے ہیں؟"

"نہیں تو ......بس ایسے ہی فرح! دل کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔"

"ناصر کی طرف چلیں؟" اس نے شوخی سے مجھے دیکھا۔ "آج تو یوں بھی قیامت بنی ہو۔"

زندگی میں پہلی بار میں اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ اس میں کچھ فرح کا دخل بھی تھا اور کچھ میرے اپنے اندر بھی شاید یہ خواہش موجود تھی کہ میں اچھی لگوں، بہت اچھی تاکہ جب اظفر مجھے دیکھے تو اس کے دل میں میری محبت مزید شدید اور گہری ہو جائے۔ مگر اظفر نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ صبح سے وہ اپنے کمرے میں تھا۔ شاید اب

وہ......

"تو پھر کیا خیال ہے، ناصر......"

"تم غلط سمجھ رہی ہو فرح! میں ...... میں ناصر سے محبت نہیں کرتی ہوں۔"

"تو پھر کس سے......؟" فرح کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"وہ......" میں نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا۔ 'کیا میں فرح کو بتا دوں؟ ...... اور بتانے میں حرج ہی کیا ہے۔ پھر فرح نے خود ہی مجھے بتایا ہے کہ اس کی ممی بڑی لبرل ہیں اور وہ طبقاتی تقسیم وغیرہ کی قائل نہیں ہیں۔'

"فرح میں......" میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ میں اظفر سے محبت کرتی ہوں کہ ڈرائنگ روم سے ڈیڈی باہر نکلے۔

"ڈیڈی! آپ کہیں جا رہے ہیں؟" فرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہاں ...... ذرا بیگ صاحب سے عید ملنے جا رہا ہوں۔"

"مگر ہمیں نازش کے گھر بھی جانا ہے۔ اور ممی کا خیال ہے کہ آج ہی منگنی کے لئے بھی تاریخ مقرر کر دیں گے۔"

"ہاں ہاں، میں آ جاؤں گا ایک دو گھنٹے تک۔ بلکہ میرا خیال ہے رات کو چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے ڈیڈی! مگر ہماری عیدی دینا تو آج آپ بھول ہی گئے۔"

"ارے ہاں۔" ڈیڈی نے مجھے اور فرح کو ایک ایک ہزار روپیہ دیا۔ میں نے اتنے زیادہ روپے لینے سے انکار کیا تو وہ خفا ہونے لگے۔

فرح نے کہا۔ "لے لو یار۔"

"ہاں بیٹا! جیسی فرح، ویسی ہی تم بھی ہماری بیٹی ہو۔"

"شکریہ......" میں نے روپے لے لئے۔

"ابھی جبران سے بھی عیدی لینی ہے۔ کنجوس جب تک مانگو نہیں تب تک پیسے نہیں نکالتا۔"

"اور اظفر سے بھی۔" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

"اوہ ہاں......" فرح نے چونک کر کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر آ گئی۔

عادل ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "اوہ، مس ہما! کیسی ہیں آپ؟"

"فائن۔" میں نے مسکراتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ جبران کونے والے

صوفے پر عادل کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ممی کے ساتھ عادل کی ممی تھیں اور اس کی دو بہنیں ایک طرف بیٹھی تھیں لیکن اظفر کہیں نہیں تھا۔ شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جب ہی تو فرح کے سسرال والوں کے آنے پر بھی نہیں آیا۔ میرا دل اندر سے اداس ہو گیا لیکن میں بظاہر عادل کی بہنوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی اور عادل بتاتا رہا کہ کس طرح سب لڑکے مجھ سے ڈرا کرتے تھے کہ کہیں......

"اتنی خوفناک تو نہیں ہیں۔" عادل کی ایک بہن ہنسی۔

"خوفناک تو نہیں لیکن بس رعب سا تھا اور آج تو بالکل ہی مختلف لگ رہی ہیں۔"

"لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اتنا ہی محتاط اور نڈر۔" جبران نے رائے دی۔

"اور جبران کی وہ ہونے والی کیسی ہیں؟" عادل اسے چھیڑنے لگا۔

"بہت پیاری...... بہت کیوٹ۔" میرے لبوں سے نکلا۔

جبران نے عجیب شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر عادل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کافی دیر بعد وہ لوگ رخصت ہوئے تو ممی جبران کی منگنی کا پروگرام بنانے لگیں۔ فرح بھی بہت جوش و خروش سے بول رہی تھی۔ جبران مجھے کچھ چپ چپ سا لگا یا مجھے محسوس ہوا۔

"تم میری منگنی کے فنکشن کی طرح یہ فنکشن بھی گول نہ کر دینا۔"

"نہیں...... میں ضرور آؤں گی۔ تب تک بابا بھی آ جائیں گے۔ اور بابا تو آنٹی کے اتنے زبردست فین ہیں کہ کیا بتاؤں۔"

"اچھا......" ممی کی آنکھوں میں روشنی سی اتر آئی۔ اتنی شہرت، اتنی عزت ملنے کے باوجود ممی اب بھی اپنی تعریف سن کر ننھے بچوں کی طرح خوش ہوتی تھیں۔

"ہاں، بابا کے پاس آپ کی ساری کتابیں ہیں۔ جتنی اب تک چھپی ہیں سب۔"

"ہاں...... تم اپنے بابا کو ضرور لانا جبران کی منگنی کے فنکشن میں۔"

"ممی! پہلے تو آپ کو جانا چاہئے وہ حج کر کے آئیں گے تو......" جبران نے انہیں یاد دلایا۔

"اوہ ہاں، ٹھیک ہے۔ ہم چلیں گے۔ تمہارے بابا کب آ رہے ہیں؟"

"دس تاریخ کو......" میں نے بتایا۔ "اور پتہ ہے آنٹی! بابا نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ پڑھتے تھے یونیورسٹی میں۔"

"کیا نام ہے ان کا؟"

"عمر حیات۔"

"عمر حیات......" ممی نے دہرایا۔ "تم عمر حیات کی بیٹی ہو؟" ان کی آنکھوں میں حیرت سی اتر آئی تھی۔

"آپ کو یاد ہے ممی؟" فرح نے پوچھا۔

"ہاں...... ایک لڑکا تھا تو اس نام کا۔" ممی کے انداز میں یکایک بے نیازی آ گئی تھی۔ "اب پتہ نہیں وہ ہما کے بابا ہیں یا کوئی اور تھا۔"

"اظفر!" جبران اچانک کھڑا ہو گیا۔ "وہاں کیوں کھڑے ہو؟ یہاں آ جاؤ۔"

میرا دل بے اختیار زور سے دھڑکا اور میں نے مڑ کر دیکھا، وہ دروازے میں کھڑا تھا۔ خاموش اور چپ چاپ سا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

"دراصل اظفر کی طبیعت خراب تھی آج۔" ممی نے وضاحت کی۔ "آؤ، ادھر آ جاؤ، میرے پاس۔"

مگر وہ سیدھا میری طرف آیا۔ میں گھبرا گئی۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔

"تم...... تم بہت اچھی لگ رہی ہو...... بہت پیاری۔"

میں کٹ کر رہ گئی۔ سب کیا سوچیں گے۔ ممی، جبران اور فرح۔ اور یہ اظفر کس قدر بے باک ہو گیا ہے۔

"اظفر! ادھر آؤ۔" ممی نے نرمی سے اسے بلایا۔ میری نگاہیں تو اوپر اٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے تم ایک خواب ہو اور کبھی لگتا ہے جیسے ایک حقیقت ہو۔ میں تمہیں چھو کر دیکھ لوں؟" اس نے میرے سامنے قالین پر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے آہستگی سے میرے ہاتھوں کو چھوا اور پھر ایک بہت گہری سانس لیتے ہوئے جذب سے بولا۔

"ہر اک تمنا لہو لہو ہے
مگر ہواؤں کے نرم لہجے
مجھ سے دھیرے سے پوچھتے ہیں
یہ کیسے جگنو چمک رہے ہیں

یہ کیسی رنگوں کی بارشیں ہیں
یہ میرے خوابوں کی کہکشاں ہے
وہ زندگی کے عذاب سارے
یہ میری آنکھوں کے خواب سارے
میں اپنی بے کیف زندگی کے عذاب لکھوں
کہ بند آنکھوں کے خواب لکھوں“

اس نے دُہرایا اور اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔

کاش، یہ سب یہاں نہ ہوتے ...... میرے اندر شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی اور میں اس سے کہتی۔

”اظفر! بند آنکھوں کے خواب لکھو۔ صرف خواب۔ اور جو عذاب گزر گئے انہیں بھول جاؤ۔“

اس کے ساتھ کچھ مسئلہ تھا ضرور۔ آج مجھے یقین ہو گیا تھا۔ کوئی حادثہ گزرا تھا اس کے ساتھ جس نے اسے ابھی تک ڈسٹرب کر رکھا تھا اور شاید یہ سب لوگ اس حادثے کے ذمے دار تھے۔ تب ہی تو اس سے گریزاں رہتے تھے۔ آخر جبران بھی تو ہے۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ آفس جاتا ہے، کام کرتا ہے اور ...... یہ اظفر جب سے آیا ہے، گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ڈیڈی کے ساتھ آفس نہیں جاتا۔ اکثر کھانا بھی کمرے میں کھا لیتا ہے۔

”اظفر!“ بڑی دیر بعد ممی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! ادھر آؤ ...... میرے پاس بیٹھو۔“

ممی کی آواز سے جیسے اس کی آواز کا سحر ٹوٹ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی تک کمرے میں اس کی آواز گونج رہی ہو۔ پُرسوز اور خوبصورت آواز۔

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور اٹھ کر ممی کے ساتھ چلتا ہوا ان کے پاس بیٹھ گیا۔

ممی نے معذرت طلب نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک بار پھر وضاحت کی۔

”اظفر کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر وہ ہنسیں، جیسے زبردستی ہنس رہی ہوں۔ ”اظفر کا ذوق بہت اچھا ہے اور ہزاروں اشعار اسے یاد ہیں۔ یہ بچپن سے ہی یونہی موقع بے موقع انہیں پڑھتا رہتا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا فرح؟“ وہ فرح کی طرف دیکھ کر پھر ہنسیں۔ ”کئی بار تو اشعار سنا سنا کر مجھے تھکا دیتا تھا۔ اُوب جاتی تھی میں۔ لیکن

یہ مجھے تنگ کرتا رہتا تھا اور ...... اور آج تم واقعی اچھی لگ رہی ہو نا اس لئے اس نے تعریف کر دی۔ تمہیں یاد ہے نا فرح! ایک بار اس نے مسز عبدالحق کی یونہی تعریف کر دی تھی۔ کہنے لگا۔ مسز حق! آج آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ اور مسز حق نے وہ طوفان اٹھایا کہ توبہ۔“

وہ پھر ہنسنے لگیں زور زور سے۔ جبران ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا اور میں ...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ہنسوں یا خاموش رہوں۔ پھر اظفر نے کچھ کہا، میں نے سنا نہیں مگر ممی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ وہ ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اس نے دو تین بار مجھے دیکھا اور مسکرایا۔ میرے رخسار تمتما اٹھے۔ یقیناً وہ میرے بارے میں ممی کو اپنی پسند سے آگاہ کر رہا ہے۔

”فرح! چلو کمرے میں......“ میں نے کہا۔

”ہاں......“ فرح ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ”چلو، رات کو نازش کے ہاں جانے کے لئے ڈریس نکال لوں۔ تم چلو گی نا؟“

”میں ...... ہاں ...... نہیں......“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”میں بھلا کیا کروں گی جا کر؟ یہ تو خالصتاً تمہارا اپنا فیملی وزٹ ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے ...... وہ جبران بھی تو ہو گا گھر پر۔ اگر اس کا کہیں اور جانے کا پروگرام نہیں ہے تو۔“

”جبران تمہارے ساتھ نہیں جا رہا؟“

”نہیں۔“

کمرے میں آ کر وہ بہت دیر تک مختلف ڈریس نکال نکال کر دیکھتی رہی اور میں نے اپنی کتاب اٹھا لی اور پھر افسانوں میں کھو گئی۔ بہت دیر بعد جب باہر ساری لائٹیں جل اٹھیں تو فرح نے تیار ہو کر مجھے آواز دی۔

”ظلِ ہما! ادھر دیکھو ......کیسی لگ رہی ہوں؟“

”بہت پیاری۔“ میں کتاب اوندھی کر کے اٹھ بیٹھی۔ پھر اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ ”کاش عادل بھی وہاں ہوتا ...... بہرحال کب جا رہی ہو؟“

”ڈیڈی آ گئے ہیں ......بس ہم نکلنے ہی لگے ہیں۔“

”چلو، میں تمہیں سی آف کر آؤں۔“ میں اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ کچھ دیر ہم ٹی وی لاؤنج میں کھڑے رہے۔ ٹی وی پر بچوں کا کوئی پروگرام آ رہا تھا۔ ممی اور ڈیڈی تیار ہو

کر آئے تو میں باہر پورچ تک انہیں چھوڑنے آئی۔

"میری دعا ہے کہ راستے میں کہیں تمہیں عادل مل جائے۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تمہیں بھی اب باتیں بنانا آ گئی ہیں۔" فرح نے مجھے گھورا۔ "خیر واپس آ کر میں تمہیں بتاؤں گی بلکہ اچھی طرح خبر لوں گی کہ تم نے اب تک مجھ سے کیا چھپا رکھا ہے؟ اُس وقت بات ادھوری رہ گئی تھی۔"

"چلو، وہ ادھوری بات آ کر مکمل کر لینا۔"

"پتہ نہیں کیوں ...... میں ایک دم شوخ ہونے لگی تھی۔ شاید میرے اندر سے کہیں کوئی خوشی کی رمق اٹھ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج اظفر نے ممی سے میرے بارے میں بات کی ہے۔

ممی نے جانے سے پہلے میرے رخساروں پر پیار کیا۔

"ہم جلدی آ جائیں گے۔ کھانا گھر پر ہی کھائیں گے۔ تم اپنا خیال رکھنا بیٹی! ویسے جبران دوستوں کی طرف گیا ہے۔ جلدی آ جائے گا۔"

ممی کا یہ التفات مجھے بہت اچھا لگا۔ پہلے بھی تو دو تین بار گھر میں اکیلی رہی تھی لیکن ممی نے مجھے اس طرح اپنا خیال رکھنے کو کبھی نہیں کہا تھا۔ یقیناً آج اظفر نے میرے متعلق ممی سے بات کی ہے۔ اور پھر اتنے بہت سارے نوکروں کی موجودگی میں مَیں اکیلی کب تھی۔ میں اندر جانے کی بجائے لان میں ہی ٹہلنے لگی۔ باہر کی فضا میں گھٹن نہ تھی ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

'میں اور اظفر ...... اکثر شام کو یہاں ٹہلا کریں گے۔ اندر کتنی گھٹن ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت۔ مگر کسی کو محسوس ہی نہیں ہوتا۔'

چلتے چلتے مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا، اظفر تھا۔

"اوہ، تم......"

"ہاں......" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں ایسے ہی چہل قدمی کر رہی تھی۔ تمہاری طبیعت اب ٹھیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

مگر اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بس مجھے گھورتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔

"کچھ نہیں......" وہ میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر گلاب کی کیاریوں کے قریب لگے سوکھے پتوں کے ڈھیر کو دیکھنے لگا جنہیں شاید مالی بابا نے آگ لگانے کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ میں دیکھتی تھی کہ وہ ہر روز ہی سارے پتے اکٹھے کرتا تھا اور پھر باہر لے جا کر آگ لگا دیتا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا پتوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا اور انہیں دونوں ہاتھوں میں دبا دبا کر مسلنے لگا۔

"اظفر! کیا کر رہے ہو؟" میں نے اس کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بہت ویران اور پیلا پیلا لگ رہا تھا۔

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر دیکھتا رہا۔

"ہماری چشم و لب تشنہ
دلوں میں دور تک پھیلی ہوئی بے نام ویرانی
یہ سارے خشک پتے راہ گزاروں پر
کہاں سے کون لایا ہے
ہمارے چشم و لب تشنہ
ہمارے چشم و لب تشنہ"

اس نے ایک دم آگے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لئے بلکہ اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لئے۔ مجھے اپنی انگلیاں ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔

"اظفر...... اظفر پلیز!"

تب ہی باہر گیٹ پر کسی گاڑی کی لائٹ پڑی اور پھر ہارن بجا۔ چوکیدار نے اپنے کوارٹر سے باہر نکل کر گیٹ کھولا۔ شاید جبران تھا۔ جبران نے شاید گاڑی میں سے ہی ہمیں دیکھ لیا تھا کہ گاڑی سے اترتے ہی وہ سیدھا لان میں آیا۔ اظفر کے ہاتھوں کی گرفت ہلکی ہو گئی تھی لیکن اس نے ابھی تک میرے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔

"اظفر پلیز! میرے ہاتھ چھوڑ دو۔ جبران آ رہا ہے۔"

میں نہیں چاہتی تھی کہ جبران اس طرح مجھے دیکھے۔ لیکن اظفر نے مجھے ہاتھ نہیں چھوڑے۔ جبران قریب آ گیا۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔

"اظفر!" جبران کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

''ہاں......'' اس نے یوں چونک کر میرے ہاتھ چھوڑ دیئے جیسے خواب کی سی کیفیت میں تھا۔

''تم باہر کیوں نکلے ہو؟ تمہاری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔''

اظفر نے کچھ نہیں کہا۔ جبران نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور جاتے جاتے مُڑ کر مجھے دیکھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''

''جی! اتنی سی دیر میں بھلا مجھے کیا ہونا تھا؟''

ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو جبران گھر سے گیا تھا۔

میں جبران کے پیچھے پیچھے ہی اندر آئی۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے۔

''بیٹھیں...... اچھے پروگرام آ رہے ہیں۔''

''نہیں، میں تو آرام کر رہی تھی۔ یوں ہی فرح کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔''

''کب گئے وہ لوگ؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے۔''

''موسیقی کا اچھا پروگرام ہے۔'' اس نے پھر کہا لیکن مجھے جبران سے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ کیا کہتا ہوگا وہ کہ میں ...... اُف میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو ابھی تک سرخ ہو رہے تھے۔ کتنی مضبوط گرفت تھی اظفر کی۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' جبران نے آہستگی سے کہا اور میں فرح کے کمرے میں واپس آ گئی اور پھر کھانے کے لئے بھی نہ گئی۔ حالانکہ فرح نے بہت منتیں کیں۔

''یار، آؤ نا ...... خانساماں نے کچے قیمے کے کباب اور گوشت کے پارچے بنائے ہیں۔''

''نہیں یار ...... میرا جی نہیں چاہ رہا۔'' میں نے انکار کر دیا تو وہ میرے لئے پلیٹ میں گرم گرم کباب لے آئی۔

''عید کا دن ہے، نمکین چیز ہے۔ ضرور کھانا چاہئے۔''

پلیٹ میرے ہاتھ میں دے کر وہ کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

''ہاں جناب! اب شروع ہو جائیں۔'' بیڈ پر آرام سے آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

''کیا......؟'' میں جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

''بنو نہیں، جلدی سے بتاؤ کون ہیں وہ ذات شریف، کیا ناصر سے بھی زیادہ اچھا کوئی لڑکا تھا ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں؟''

''فرح وہ ...... اظفر ہے۔''

''اوہ، اظفر ...... نہیں......'' اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ''اظفر، مگر ظلِ ہما ...... وہ ...... تم اس سے محبت کرنے لگی ہو؟''

''ہاں ...... میں نے اعتراف کیا۔'' اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''اس نے تم سے کیا کہا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے؟'' وہ از حد حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں......''

''ظلِ ہما ...... ظلِ ہما!'' وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ''یہ سب صحیح نہیں ہوا ...... ممی کو شک پڑا تھا لیکن میں نے تردید کر دی تھی کہ تم ...... ظلِ ہما تمہیں ...... تمہیں اظفر ہی کیوں اچھا لگا؟ جبران بھی تو تھا، وہ کیوں نہیں؟''

''تم نے خود نہیں کہا تھا ایک بار کہ محبت تو محبت ہوتی ہے اور وہ یونہی ہو جاتی ہے۔ خود بخود ...... سوچ سمجھ کر تو نہیں ہوتی۔''

''مگر ظلِ ہما......''

''کیا بات ہے فرح! تم اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو؟ کیا تمہیں برا لگا ہے؟ اگر میں جبران کو پسند کرتی تو تمہیں اچھا لگتا۔ آخر اظفر بھی تو تمہارا بھائی ہے۔ کیا وہ تمہارا سگا بھائی نہیں ہے؟''

''ہاں ...... یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ میرا سگا بھائی نہیں ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ہم سب کو اتنا ہی عزیز ہے جتنا کہ جبران۔ ممی کی جب شادی ہوئی تو وہ دو سال کا تھا۔ اس کی پیدائش کے آٹھ ماہ بعد اس کی ممی کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ ممی نے اسے بہت محبت سے پالا ...... بلکہ وہ سب سے زیادہ ممی کا لاڈلا تھا کیونکہ وہ ممی کا ہم ذوق تھا۔ جب وہ اور ممی ادب پر بحث کر رہے ہوتے تو ممی مجھے، جبران اور ڈیڈی کو بالکل بھلا دیتیں۔ بہت کم عمری میں ہی اظفر کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ ممی کی کہانیوں پر ایسی تنقید کرتا کہ ممی حیران رہ جاتی تھیں۔ ابھی وہ میٹرک میں ہی تھا کہ ممی ہر کہانی لکھ کر پہلے اسے پڑھنے کے لئے دیتی تھی۔ سو اس سے کیا کہ وہ سوتیلا ہے یا سگا۔ مگر ہما، یہ اچھا نہیں ہوا۔''

"تم تو کہتی تھیں کہ تم لوگ بہت لبرل ہو اور یہ کہ ممی ڈیڈی کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ جبران کسی بھی لڑکی کو پسند کر لے۔ پھر اظفر کے سلسلے میں ایسا کیوں؟"

"نہیں، اظفر کے سلسلے میں بھی ممی یا ڈیڈی نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ اس نے اپنی پسند سے متوسط طبقے کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔"

"نہیں......" میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ سا گیا۔

"ہاں، رفعت بھابھی ہم سب کو بہت پیاری تھیں۔"

"اب...... اب وہ کہاں ہیں؟" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

'یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا...... اظفر نے تو ایک بار بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ اس کی بیوی......'

"اب......" فرح بے دردی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ "ایک حادثے نے انہیں ہم سے چھین لیا ظلِ ہما! وہ بہت خوفناک حادثہ تھا۔ رفعت بھابھی، جبران اور اظفر تینوں تھے اس کار میں۔ اظفر ڈرائیو کر رہا تھا۔ بھابھی نے تو وہیں دم توڑ دیا۔ اظفر اور جبران بہت دنوں ہاسپٹل میں رہے۔ اور اظفر کے دماغ پر ایسی چوٹیں آئیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے دماغی توازن کھو بیٹھا۔"

"نہیں......" میری چیخ نکل گئی۔

"یہ سچ ہے ہما!" فرح نے ہولے سے میرا ہاتھ دبایا۔

میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ڈیڈی کہاں کہاں لے کر نہیں گئے اسے۔ یورپ کے کئی مشہور نیورو سرجنز کو دکھایا لیکن سب نے مایوسی کا اظہار کیا۔ کبھی کبھی اسے دورے پڑتے ہیں بہت شدید قسم کے...... تب یہ بہت توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ بہت اُدھم مچاتا ہے۔ بہت خطرناک ہو جاتا ہے تب۔ لیکن جب اسے یہ دورے نہیں پڑ رہے ہوتے تو بظاہر نارمل لگتا ہے۔ سب سے باتیں کرتا ہے۔ شعر سناتا ہے۔ لیکن وہ نارمل نہیں ہے ظلِ ہما! وہ نارمل نہیں ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

میں یونہی ساکت بیٹھی تھی۔

"سوری!" کچھ دیر بعد اس نے روتے روتے سر اٹھایا۔ "میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا اس کے متعلق۔ ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ ممی میں بھی ایک کمزوری

ہے وہ یہ کہ وہ چاہتی ہیں کہ لوگ انہیں مکمل سمجھیں۔ بھرپور خوش اور مطمئن۔ وہ خود پر ترس کھایا جانا پسند نہیں کرتیں کہ کوئی ان سے کہے کہ سوری مسز رضا، آپ کا بیٹا۔ وہ فاؤنٹین ہاؤس میں رہتا ہے لیکن کبھی کبھی ڈیڈی اس سے ملنے جاتے ہیں تو اسے ساتھ لے آتے ہیں اور اس کے ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ کچھ ماحول بدل جائے گا۔ لیکن دس بارہ دن، وہ واپس چلا جاتا ہے۔ رات بھی اسے دورہ پڑا تھا۔ تم تو سو رہی تھیں لیکن اس نے اپنے کمرے سے ٹی وی اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ گلاس، جگ سب توڑ دیئے۔ ڈیڈی چاہتے تھے کہ صبح اسے چھوڑ آئیں۔ لیکن عید تھی نا اور پھر ممی کا دل نہیں مانا۔"

"اور تم نے...... تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔ کیسی دوست ہو تم فرح؟"

"ممی نے منع کر دیا تھا...... ہم مری گئے تو ڈیڈی اسے دیکھنے کے لئے فاؤنٹین ہاؤس گئے۔ اسے بخار تھا۔ وہ اسے گھر لے آئے۔ بس باپ کا دل ہے نا...... حالانکہ انہیں پتہ تھا کہ تم آئی ہوئی ہو تو ممی کو یہ پسند نہیں آئے گا۔ پھر وہاں بھی تو ڈاکٹر ہیں جو ٹمپریچر کی دوا دے رہے ہوں گے لیکن۔"

اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اس روز فرح لیب میں کھڑی اپنی محبت کی ناقدری پر رو رہی تھی اور مجھے اس کا رونا عجیب لگا تھا۔ لیکن آج میں اس سے بھی زیادہ شدت سے رو رہی تھی۔ فرح نے مجھے رونے دیا۔ میں روتی رہی اور اظفر کی ایک ایک بات مجھے یاد آتی رہی۔ وہ اس کا محبت سے مجھے دیکھنا، شعر سنانا خوبصورت آواز میں۔ وہ لفظوں پر اس کی گرفت۔ کبھی کبھی محبت کا اظہار۔ بالوں کی، آنکھوں کی تعریف۔ وہ مجھے کبھی بھی تو ابنارمل نہیں لگا۔ شاید فرح جھوٹ بول رہی ہے۔

شاید وہ نہیں چاہتی کہ میں اور اظفر......

ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں آیا لیکن پھر جب میں نے سر اٹھا کر فرح کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ ترحم بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"فرح!"

"ریلیکس ہما!" اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

رات میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو سکی تھی۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ فرح نے مجھے ناشتے کے لئے مجبور نہیں کیا۔

"تم منہ ہاتھ دھولو، میں تمہاری چائے ادھر ہی بجھوائے دیتی ہوں۔ چائے پی کر سونے کی کوشش کرنا۔ ساتھ میں والیم فائیو بھیج دیتی ہوں۔ سونے سے طبیعت بہتر ہو گی۔"

مگر چائے بجھوانے کی بجائے وہ خود ہی آ گئی۔

"ظلِ ہما! سنو۔" وہ کچھ کہتے کہتے جھجکی۔ "وہ جا رہا ہے ڈیڈی کے ساتھ۔"

"وہ جا رہا ہے...... وہ جا رہا ہے۔"

میرے اندر کوئی سرگوشیاں کرنے لگا۔ پھر شاید میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں۔ وہ شخص جس نے میرے اندر کے پتھر کو پگھلایا، مجھے محبت کرنا سکھایا۔ میں بنا کچھ کہے دوپٹہ لے کر فرح کے ساتھ باہر آ گئی۔ ڈیڈی جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اظفر ان کے ساتھ تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، سلیقے سے کنگھی کئے، سر جھکائے وہ کہیں سے بھی ابنارمل نہیں لگ رہا تھا۔

"خدا حافظ اظفر!" میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر کہا۔

"خدا حافظ۔" اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر دیکھتا رہا۔ وہی محبت سے لبریز آنکھیں جن میں کچھ عجیب سی چمک تھی، میرے چہرے پر ٹھہری گئی تھیں۔ میری آنکھیں خود بخود گیلی ہو گئیں۔ میں نے بہت چاہا کہ میری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں لیکن آنسو نہ جانے کہاں سے آنکھوں میں چلے آ رہے تھے اور ایک تواتر سے رخساروں پر پھیلتے جا رہے تھے۔

"تم رو رہی ہو؟" اس کی آنکھوں میں حیرت سی تھی۔ پھر وہ ڈیڈی کا ہاتھ چھڑا کر بالکل میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"مری اُمنگوں کی ساری شمعیں
غمِ زمانہ کی آندھیوں نے نہ جانے کب کی
بجھا بھی دی ہیں
تم اپنی اُلفت کے سارے موتی سمیٹ رکھو
کہ غم شناسوں کی اس جہاں میں کمی نہیں ہے۔"

"ظلِ ہما!" فرح نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"ریلیکس یار۔"

مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے کہا تو مجھے اچانک خیال آیا کہ میں یہاں اکیلی

نہیں ہوں۔ جبران، ممی، فرح، ڈیڈی سب موجود ہیں۔ میں ایک دم تیزی سے مڑی اور تقریباً بھاگتی ہوئی فرح کے کمرے میں آ گئی۔

کئی دنیائیں ایسی ہیں
کہ جو آباد ہونے سے بہت پہلے
کہیں دم توڑ دیتی ہیں
کئی دنیائیں ایسی ہیں

اظفر کی آواز میں کانوں میں گونجنے لگی اور میں تکیے پر سر رکھ کر رونے لگی، ایک بار پھر زور زور سے اونچی آواز میں۔ اس روز مجھے کسی نے نہ چھیڑا۔ میں والیم کھا کے سوتی رہی۔

اگلے روز عبدالغفور چاچا اور بے بے گاؤں سے آ گئے تھے۔ چاچا عبدالغفور مجھے لینے آیا تھا۔ میں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

ممی نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا اور میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

"کاش، عمر حیات کی بیٹی میری بہو بن سکتی لیکن تم......" ان کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔

ڈیڈی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ جبران ایک طرف کھڑا ترس اور ہمدردی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں جب آئی تھی تو کتنی با اعتماد اور مطمئن تھی اور اب جاتے ہوئے کتنی بکھری ہوئی اور ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھی۔ شاید فرح نے سب کو بتا دیا تھا کہ میں ...... میں اور اظفر......

فرح نے مجھے گھر پر اتارتے ہوئے تسلی دی۔

"زیادہ سوچنا مت ہما! جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ کاش مجھے پہلے ہی پتہ چل جاتا کہ تم اظفر سے...... تو میں......" وہ رک کر مجھے دیکھنے لگی۔ "تو پھر شاید ہم نازش کے گھر نہ جاتے۔"

"نہیں، فرح! نہیں۔"

بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ میں فرح کی طرح نہیں ہوں۔ میں بہرحال اس سے مختلف ہوں۔ میں اظفر کی محبت دل میں بسا کر بھلا جبران کے ساتھ کیسے ...... ناممکن۔

اور اب کل بابا آنے والے ہیں ...... اور انہیں بھلا کیا پتہ چلے گا کہ میرے اندر اس ایک ماہ میں کتنی بڑی تبدیلی ہو گئی، کتنا بڑا انقلاب آ گیا۔ میں ظلِ ہما ...... جس کے

متعلق وہ کہتے تھے کہ میں کچھ مختلف ہوں اور یہ مختلف ہونا تکلیف دہ ہوتا ہے...... مجھ
تو میں نے عام لڑکیوں کی طرح ہی کی ہے لیکن پھر بھی میرے ساتھ کچھ مختلف ہوا۔

...... میں، نے اظفر سے محبت کی ہے۔

اظفر جو نارمل نہیں ہے۔

جس کو ایسی دماغی چوٹیں آئی ہیں کہ وہ کبھی نارمل نہیں ہو سکتا۔ اور میں فرح کے آ
سے آنے کے بعد ایک روز اسے دیکھنے فاؤنٹین ہاؤس بھی گئی تھی۔ وہ کسی کالج سے
آنے والی لڑکیوں کو شعر سنا رہا تھا۔

خوبصورت دل میں اتر جانے والے شعر۔

"میری یاد کو اپنے دل میں آباد رکھنا
یہ یاد رکھنا کہ اس دل کے سبھی خواب تیرے لئے ہیں"

وہ کہہ رہا تھا اور میں چپکے سے آنکھوں میں آنسو چھپائے واپس پلٹ آئی۔

اور اس کے باوجود میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

بھلا پتھروں سے یکدم پھوٹ جانے والے چشمے بھی کبھی خشک ہوئے ہیں جو اس ک
محبت میرے دل سے ختم ہو جائے۔ میرے دل میں اس کی محبت ہمیشہ رہے گی۔ اس
روبوٹ کی طرح جس کے دل میں اچانک اپنی مالکن کی بیٹی کے لئے لطیف احسا
جاگ اٹھے تھے اور جس کمپنی نے اسے بنایا تھا اس کا خیال تھا کہ اس میں کوئی تکنیکی
خرابی ہو گئی ہے کہ جو کچھ اس میں فیڈ نہیں کیا گیا یہ وہ بھی کہتا ہے۔ اسے دوبارہ جو
گیا۔ حتیٰ کہ اسے بھٹی میں ڈال دیا گیا پھر بھی اس کا دل محبت میں دھڑک رہا تھا۔

بالکل ایسا ہی تو میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ میرے اندر بھی کوئی تکنیکی خرابی ہو گئ
ہے۔ ان چند دنوں میں، میں نے کتنی ڈھیروں شاعری کی کتابیں خرید ڈالی ہیں۔

میں ظلم ہما...... جسے یہ شاعری فضول لگتی تھی۔

اب دن بھر انہیں پڑھتی رہتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں کہ کبھی کبھی یہ لکھنے والے بھ
کتنا سچ لکھتے ہیں۔ پھر میرے دل میں اظفر کی محبت اور گہری ہونے لگتی ہے۔ ایسی محبت
جس میں صرف اور صرف لا حاصلی کا دکھ ہے۔

نارسائی کا کرب ہے اور کچھ نہیں۔

(ختم شد)